کوریا کے افسانے

کانگ سوکا-کیونگ، کم چی-وون، او چونگ-ہوئی

جھلستے دنوں کے خواب

انگریزی ترجمہ: بروس اور جوچان فلٹن



اردو ترجمہ: تنویر اقبال

مشعل

جھلستے دنوں کے خواب

انگریزی ترجمہ: بروس اور جوچان فلٹن
اردو ترجمہ: تنویر اقبال

مشعل بکس

آر بی۔۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن

لاہور۔54600، پاکستان

جھلستے دنوں کے خواب

انگریزی ترجمہ: بروس اور جو چان فلٹن

اردو ترجمہ: تنویر اقبال

ناشر: مشعل بکس
آر بی 5' سیکنڈ فلور'
عوامی کمپلیکس' عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن'
لاہور۔ 54600' پاکستان
فون و فیکس: 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

مشعل بکس

آر بی۔۵' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس' عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن
لاہور۔ 54600' پاکستان

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
-1	ابتدائیہ	5
-2	جھلستے دنوں کے خواب	11
-3	جنگل میں جائے پناہ	41
-4	ایک یقینی ابتداء	166
-5	لوری	184
-6	ملگجے اندھیرے کا کھیل	198
-7	چائنا ٹاؤن	219
-8	الوداعی کلمات	249

ابتدائیہ

اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے کہ کوریا کی سحر انگیز معاشی ترقی رونما ہونے کے بعد، مغرب کو کوریائی تہذیب و ثقافت میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ روایتی کوریا میں کسی کی فنی اور ادبی حیثیت کا تعین اس کی کمرشل کامیابیوں کے حوالے سے ہوتا تھا۔ کسی بھی قوم کیلئے، اس کی ثقافت باعث افتخار ہوتی ہے مگر کوریا کو، اپنی تاریخ کے بیشتر اوقات میں اپنی سیاسی اور ثقافتی آزادیوں کیلئے اپنے طاقتور ہمسایوں سے نبرد آزما رہنا پڑا۔ 1980ء کے عشرے میں جب کوریا کے بیرونی دنیا سے براہ راست رابطے پیدا ہوئے تو بیسویں صدی کے مقامی ادب میں ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ ایک ایسی ادبی روایت نے جنم لیا جس میں مغربی دنیا کے لکھاریوں کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔

1910ء میں کوریا پہ جاپان کے قبضے کے بعد، نوجوان ادیبوں کو روسی، فرانسیسی اور دیگر مغربی ممالک کے مصنفوں تک۔ ان کے جاپانی تراجم کے ذریعے رسائی حاصل ہوئی۔ ان ملکوں کے ادبی فلسفے اور سوچ، خصوصاً حقیقت نگاری سے متاثر ہو کر 1920ء کے عشرے تک کوریائی ادیب ایسی کہانیاں تصنیف کرنے لگے تھے، جو ہیئتی اور تکنیکی اعتبار سے مغربی قارئین کیلئے اجنبی نہیں تھیں تاہم ان کا ماحول اور موضوع خالصتاً کوریائی ہوتا تھا۔

روایتی طور پر، کوریائی ادیب خواتین کو نسبتاً زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوانگ چن

ای جیسی عظیم شاعرہ (1506-1544ء) اور لیڈی ہانگ (1735-1815ء) کی معروف تصنیف ''دکھ بھرے دنوں کے قصے۔'' انتہائی تاریخی اہمیت کی حامل ہیں' تاہم عمومی طور پر ادب مردوں کی اجارہ داری ہی رہا۔ بیسویں صدی میں بھی' حالیہ سالوں میں ادیب خواتین کو کہیں جا کر ادبی تشخص حاصل ہوا ہے۔ اس کا ابتدائی کریڈٹ پاک کیونگ نی (1927ء) کو جاتا ہے جنہوں نے 1970ء میں اپنی ایک معرکتہ الآرا تصنیف ''زمین'' پیش کی جو جدید کوریائی ادب کو کامیابی کی نئی منزل کی طرف لے گئی۔ بعدازاں' 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں ادیب خواتین کا ایک نیا روپ منظرعام پر آیا۔ ان میں پاک وان سؤ سو ینگ ان' یون چنگ عؤ یا نگ کوئی جا اور اس کتاب میں شامل تینوں خواتین شامل تھیں۔

ادیب خواتین کے کوریائی ادبی افق پر دیر سے نمودار ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی اور سب سے اہم وجہ کوریائی معاشرے پر پدرسری فلسفے کا غلبہ ہے۔ کئی دوسری مشرقی ایشیائی تہذیبوں کی طرح' کوریا کی معاشرت پر بھی کنفیوشس کے تصورات کا گہرا اثر ہے۔ ان تصورات کے تحت پبلک اور گھریلو زندگی کو بالکل جدا رکھا گیا ہے۔ پبلک زندگی مردوں کا میدان ہے جبکہ گھریلو زندگی عورتوں کی سلطنت سمجھی جاتی ہے۔ اس تصور کو کوریائی زبان میں باقاعدہ متشکل کیا گیا ہے۔ عورت کو چپ سرم (گھریلو شخصیت) اور مرد کو بکت ینگ بان (خارجی شخصیت) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ادب کو چونکہ اب تک عوامی اور تفریحی سرگرمی سمجھا جاتا ہے' لوگ مل بیٹھتے ہیں' ایک دوسرے کے فن پارے سنتے ہیں اور ان پر تبادلہ خیال کرتے ہیں' سو ان سرگرمیوں کو بنیادی طور پر مردوں کا علاقہ سمجھا جاتا رہا۔

آج بھی کوریا میں عورت کو کسی کی بیٹی' بیوی اور ماں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ ایسے شدت پسند ماحول میں جبکہ نوآبادیاتی تسلط بھی موجود ہو' ادیب خواتین اپنا وجود منوانے کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ انہوں نے نہ صرف روایتی معاشرتی رکاوٹوں کو توڑنے کی کوشش کی بلکہ انتہائی چابک دستی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ ان کے حقیقی رنگ میں تصویر کشی بھی کی۔

زیرنظر کتاب میں تینوں منتخب لکھاری خواتین اسی جدید ادبی روایت کا تسلسل نظر آتی ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں جنم لینے والی ان خواتین کو آزاد کوریا کی پہلی ادیب نسل میں شمار کیا جانا چاہئے۔ کانگ سو کیا نگ کی طویل کہانی ''جنگل میں جائے پناہ'' نئے کوریا کی پرانی اور نئی نسل کی معاشرت' انداز فکر اور سیاسی رویوں میں عدم مطابقت کی کہانی ہے۔ اس کا مرکزی

کردار سویا نگ نامی نوجوان لڑکی گھر کے بڑوں کی متصادم سوچ سے پیدا شدہ تنہائی اور ذہنی اذیت سے بچنے کیلئے خود کو گھر سے باہر کی مصروفیات میں گم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ خارجی ماحول کی چکا چوند اس کے اندر موجود گھٹن اور اداسی دو ایسی متضاد کیفیات ہیں جو کسی طور بھی اسے پرسکون نہیں ہونے دیتیں۔ ماں باپ کے پاس اس کیلئے غم و غصے اور نصیحتوں کے اظہار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بڑی بہن اسے سمجھنے اور زندگی کی طرف لانے کی بھرپور کوشش کرتی ہے مگر وہ ناکام رہتی ہے۔ سوکیا نگ کے اندر چھپا ہوا شاعر کہیں کہیں سویا نگ کے کردار میں بھرپور طریقے سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر تخیلاتی جنت میں رہتی ہے۔ حقائق کا بغور جائزہ لیتی ہے مگر ان کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہیں کر پاتی۔ تاہم سوکیا نگ اپنی پہلی کہانی ''جھلستے دنوں کے خواب'' میں امریکی فوجوں کی کوریا میں موجودگی کے سماجی اثرات کا خوبصورت تجزیہ پیش کرتی ہے لیکن کہانی کا اختتام معاشی استہزاء کے گرد گھومتا نظر آتا ہے......

''اگر تم مجھے دس ڈالر دے سکو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ مجھے تمہارے خطوط کی کوئی ضرورت نہیں؟''

شاید سوکیا نگ کا یہ جملہ مادی ترقی کی معجز نما رفتار سے نفرت کا اظہار ہے جس کا محور و مرکز محض پیسے کمانا ہے' چاہے اس کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے۔

کم چی ون کی کہانی ''ایک یقینی ابتداء'' امریکی پس منظر میں لکھی گئی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ اس میں بیک وقت کئی موضوعات چھیڑے گئے ہیں۔ کوریا کی معاشرتی ناہمواریاں' امریکہ کی تصوراتی جنت' امریکہ میں غیر ملکی باشندوں کے مسائل اور مشکلات۔ یہ کہانی ایک طلاق یافتہ کوریائی عورت یون جا اور ایک نوجوان کوریائی چن ال کے گرد گھومتی ہے۔ چنگ امریکی شہریت کے حصول کیلئے یون جا سے کاغذی شادی کرتا ہے۔ قانونی مجبوریاں انہیں ساتھ رکھتی ہیں مگر ان میں کوئی ذہنی اور جسمانی تعلق نہیں ہوتا۔ اس ساری صورتحال کا انتہائی لمحہ بہ لمحہ تجزیہ کم کی فن کارانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اپنی اپنی انا کے خول میں بند دونوں کردار پوری کہانی میں اپنا روایتی مشرقی رویہ قائم رکھتے ہیں۔ یون جا پہلی شادی کی ناکامی' اپنی بڑھتی عمر اور روزمرہ کی پریشانیوں کے حصار میں پھنسی کسی نئی جہت کا سوچ ہی نہیں پاتی اور چنگ ال کے لئے امریکی شہریت کا حصول زندگی اور موت کا مسئلہ ہے' ایسے عالم میں کہانی کا اختتامی موڑ.......... چنگ ال کا یون جا کو حقیقی شادی کی پیشکش' مشرقی روایات کی فتح کا احساس دیتا دکھائی دیتا ہے۔

کم چی ون کی دوسری کہانی ''لوری'' سفید پوش گھرانوں کی قدامت پرستی' مردانہ بالادستی' چھوٹی چھوٹی قابل عمل خواہشات اور حقائق اور توہمات کے غیر مرئی توازن کی عکاسی کرتی ہے۔

اوچنگ ہوئی کی تین کہانیاں ملگجے اندھیرے کا کھیل' چائنا ٹاؤن اور الوداعی کلمات اس انتخاب میں شامل ہیں۔ ملگجے اندھیرے کا کھیل' بڑھتی ہوئی عمر کی لڑکی کی تنہائیوں' جنسی ناآسودگی اور روزمرہ کی سماجی الجھنوں سے عبارت ہے۔لڑکی گھر میں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ تنہا رہتی ہے۔ باپ ماضی میں زندہ ہے اور زندگی کی ہر خرابی اور مشکل کیلئے اپنی آنجہانی بیوی کو موردالزام ٹھہراتا ہے۔ کہانی کے بہت سے واقعاتی دھارے مبہم اور تشنہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ اب یہ قاری کے تخیل اور ذہانت پر منحصر ہے کہ وہ انہیں کس رنگ اور آہنگ میں جوڑتا ہے۔ بین السطور کہانی کا حقیقی اور بھرپور کردار اندھیرا محسوس ہوتا ہے۔

چائنا ٹاؤن کا پس منظر کوریا کی خانہ جنگی' اس کی تباہ کاریوں اور اس کے نتیجے میں معاشرتی اور معاشی بدحالی کا حقیق مظہر دکھائی دیتا ہے۔ امریکی فوجیوں کا مقامی عورتوں سے ارتباط اور جوان ہوتی ہوئی نسل کے ذہن میں اس کی عجیب وغریب مثبت توجیہہ کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ غیر ملکی افواج کی موجودگی کے خلاف احتجاج اور ہنگامے کی ہلکی سی گونج بھی سماعت سے ٹکراتی رہتی ہے۔

''الوداعی کلمات'' میں اوچنگ ہوئی عمومی بیانیہ انداز کے ساتھ شعور کی رو کا بھی بھرپور استعمال کرتی نظر آتی ہے۔ ابہام سے حقیقت تک کا سفر' چنگ آک کا ظاہری سفر ہی نہیں بلکہ ذہنی اور روحانی سفر بھی ہے۔ چنگ آک اپنے شوہر کے تصور کو قائم رکھنا چاہتی ہے' حالانکہ اس کا شوہر' پانچ سال تک اپنی موجودگی کے باوجود اس کے لیے غیر حاضر ہی رہتا ہے۔ اوچنگ ہوئی نے شہر سے دور قبرستان تک کا سفر اور اس قبرستان کے پس منظر میں چنگ آک کی ذہنی کیفیات اور اس کی والدہ کے غیر سنجیدہ مابعد الطبیعاتی تصورات کا بڑا گہرا تجزیہ کیا ہے۔ غیر ملکی فوجوں کی راستے میں موجودگی اور چنگ آک کی جنگ سے اور اس کی تباہیوں اور بربادیوں سے نفرت بظاہر ضمنی تذکرہ دکھائی دیتی ہے لیکن کہانی کے پس منظر میں فوج کے دستے کی مارچ پاسٹ کی مسلسل آہٹ اور گردوغبار سے آلودہ ماحول' ذہن پر مسلسل دستک دیتے رہتے ہیں۔

تینوں ادیب خواتین' اپنی کہانیوں میں زندگی کے معلوم اور موجودہ رخوں کو اس طرح پیش

کرتی ہیں جیسے کہ وہ ہیں۔ انہوں نے سماج کی عریانی کو کپڑے پہنانے کی کوشش نہیں کی۔ قدیم اور جدید نسلوں کے درمیان ذہنی' فکری اور روحانی تفاوت کے اظہار میں بھی وہ کسی جھجک کا شکار نہیں۔ غرض سماجی' سیاسی اور ثقافتی رویوں اور روایتوں کا قریبی مشاہدہ اور ان میں رونما ہوتی تبدیلیوں کا بلاتبصرہ اور بے جھجک اظہار ان ادیب خواتین کی قدر مشترک دکھائی دیتا ہے اور پدرسری معاشرے کے خلاف بغاوت کی لہر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ بہرحال ناراضگی' مایوسی اور دکھ کی پرچھائیوں کے جلو میں' آنے والے دنوں کی آس اور ان کے بطن سے جنم لینے والی خوشبو کا ہلکا سا احساس ان کی کہانیوں کا ماحصل ہے۔

تنویر اقبال' لاہور

جھلستے دنوں کے خواب

کانگ سوکیانگ

درختوں اور پودوں پر آتا ہریالی پن اور پھولوں کی نئی کونپلیں آتی بہار کا پتہ دے رہی تھیں۔ دھواں اگلتی چمنیوں والے پہاڑی بنگلے کی جگہ ایک وسیع وعریض اور قدیم حویلی نے لے لی تھی۔ دیوار پر آویزاں کیلنڈر سے موسم سرما غائب ہو چکا تھا۔ یہاں آنے کے ہفتہ بھر بعد' مجھے اپنا چیک اپ کرانا پڑ گیا۔شہر کے اس حصے میں یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی لیکن میں کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔

آدمی برسر روزگار ہو تو کوئی بھی چیز خرید سکتا ہے لیکن آپ نے یہ نہیں سنا ہوگا کہ ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے کوئی شخص اپنی ساتھی کا چیک اپ نہ کرا سکے۔ دو ماہ سے میں اوورٹن کے ساتھ رہ رہی تھی مگر میرے ساتھ کے باوجود اس کی رنگ رلیاں جاری تھیں۔ بعض اوقات تنہائی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اوورٹن یہ بیماری کہیں باہر سے لگا لایا تھا اور پھر کسی متعدی مرض کی طرح یہ مجھ تک آ گئی۔

یہ خوفناک بیماری اور اس کے ساتھ بندر گھر کے چکر اور وہ بھی بہار کے شروع میں' حد ہوگئی! ایسے آدمی سے وفاداری نبھانے چلی ہوں میں! ہیلتھ سنٹر سے نکلتے ہی میں نے فائر بریگیڈ میں اوورٹن کو ٹیلیفون کیا اور اسے جلے کٹے لفظوں میں اس کی رنگ رلیوں پر بری طرح

کوسا اور اسے اپنی طبیعت کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا' کہنے لگا:

''تھوڑا بہت تو ہر کوئی ادھر ادھر ہاتھ مار لیتا ہے' یہ تو تم بھی جانتی ہو۔''

''تمہارا خیال ہے کہ صرف مرد ہی رنگ رلیاں منا سکتے ہیں؟'' مجھے غصہ آ گیا ''عورتیں بھی جو چاہیں کر سکتی ہیں' تھوڑا انتظار کرو میں تمہارے ساتھ رہتے ہوئے کسی اور کے ساتھ آنکھ مچولی کر کے دکھاؤں گی۔'' پھر میں نے اسے چیک اپ کے بارے میں بتایا۔ بالآخر وہ مان گیا ممکن ہے اس نے بھی اپنا چیک اپ کرایا ہو۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس عورت سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا جس کی وجہ سے ہمیں یہ بیماری لگی تھی۔ وہ معذرت کرتا رہا' مجھے منانے کی کوشش کرتا رہا مگر میں ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ اس لیے میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹیلیفون بند کر دیا۔

میں اس بارے میں جتنا سوچتی' اتنا ہی میرا غصہ اور بڑھتا جاتا' مہینے بھر میں اوورٹن کی مقامی ڈیوٹی ختم ہو جائے گی اور وہ واپس امریکہ کا رخ کرے گا۔ وہ یہ سوچ کر ہی بے وفائی نہ کرتا کہ کوریا میں قیام کے دوران وہ آخری لڑکی کے ساتھ رہ رہا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ دل پشوری کیلئے لڑکیوں سے آنکھ مچولی کرتے رہنا چاہئے۔ یہ تھا اس کا فلسفہ' اگر اس کی حرکتیں ایسی نہ ہوتیں تو شاید ہم ایک مثالی جوڑا ہوتے۔ دو ماہ پہلے تک تو ایسا ہی لگتا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ جاتا۔ جوش اور جذبات اس کے پور پور سے ٹپکتے۔ ''قسمت نے ہمیں آخری لمحات میں ملا دیا ہے اور......'' اور ایسی ہی سینکڑوں اوٹ پٹانگ باتیں۔

واپس گھر جاتے ہوئے میں نے ایک میڈیکل سٹور سے نیند کی تیس گولیاں اور سوجو کی ایک بوتل خریدی۔ گھر آتے ہی بیس گولیاں منہ میں ڈالیں' اوپر سے شراب کا ایک گلاس لیا اور بستر میں جا لیٹی۔

آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ غالباً یہ اگلے دن دوپہر کا وقت تھا۔ شفاف آئی وی بوتل ہوا میں لٹک رہی تھی اور میرے بازو میں انجکشن کی سوئی پیوست تھی۔ اوورٹن کے سنہرے بال میری پلکوں کو چھو رہے تھے۔ میں نے سوئی کو مضبوط سے پکڑا اور باہر نکال پھینکا۔ اوورٹن نے میرا بازو سنبھال لیا اور انتہائی لجلجاتے لہجے میں معذرتیں کرنے لگا۔

''ہنی! میں غلطی پر تھا۔ میں اپنی سب خباثتیں چھوڑ دوں گا۔ یقین کرو ہنی' میں اب تمہیں کبھی دھوکہ نہیں دوں گا۔'' میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ جب سے ہم نے اکٹھے رہنا شروع

کیا تھا' آج پہلی بار میں اس کی زبان سے اپنے لئے' ممی'' کا لفظ سن رہی تھی۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا اور سراسیمہ لگ رہا تھا۔ بہر حال میں دل ہی دل میں تہیہ کر چکی تھی کہ موقع ملا تو اسے مزا ضرور چکھاؤں گی۔ میں نے آنکھیں موندلیں اورراس سے پانی کا گلاس مانگا۔ وہ پانی لے کر آیا تو میں نے بستر کے کونے کی دراز سے' تیزی سے باقی دس گولیاں نکالیں اور دیکھتے ہی دیکھتے نگل بھی لیں۔ اوورٹن ہکا بکا رہ گیا۔'' مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو''بندر گھر'' جانے سے پہلے' میں ذرا اونچا اڑنا چاہتی ہوں''۔

اس رات' دس بجے میں بندر گھر کیلئے روانہ ہوئی۔ عجیب سی محسوسات تھیں۔ دن کی روشنی میں تو میں شاید چل بھی نہ سکتی۔ گولیوں کے زیر اثر' میں خود کو ہوا میں چلتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ چھٹی لے کر گھر جانے والے کسی فوجی سپاہی کی طرح' زیر لب کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے نہ جانے میں کتنی طویل مگر تنگ گلیوں سے گزری اور بالآخر اس دومنزلہ عمارت تک پہنچ گئی۔ یہ عام سی سرکاری عمارتوں کی طرح ایک عمارت تھی۔ نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ اوپری منزل میں البتہ روشنی ہورہی تھی۔ چھوٹا سا آہنی گیٹ بند تھا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ میری گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔ سو میں نے اپنا بیگ دیوار کے اوپر سے گھما کر پھینک دیا۔ وہ کسی عجیب الخلقت پرندے کی طرح اڑا اور پھر غائب ہوگیا۔ گیٹ کے ہینڈل پر شیر کا سر بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنا ایک پاؤں اس کے اوپر رکھا اور اس طرح دیوار کے اوپر بنی ہوئی آہنی جالی کو بمشکل جا پکڑا۔ چونکہ میں خود کو اس وقت بھی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اس لئے دیوار کے اوپر چڑھنے اور دوسری جانب چھلانگ لگانے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔

مجھے نگران کو جگانا پڑا۔ دروازہ کھولتے ہوئے وہ خاصا سراسیمہ تھا مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مجھے کریسنتھی مم روم میں لے جایا گیا۔ وہاں خاصی لڑکیاں میرے ارد گرد جمع ہوگئیں اور ہنستے مسکراتے سرگوشیاں کرنے لگیں۔ انہی لمحوں میں ہمیں ہال سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ یونگ جانامی ایک لڑکی نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور کہا''اب کیا مصیبت آ گئی؟''ماؤ سی (نگران اعلیٰ) اور پولیس کے دو سپاہی آ ئرس روم سے نکل کر ہال کی طرف جارہے تھے۔ وہ تینوں اگلے دروازے سے روز روم میں چلے گئے اور سب لڑکیوں کی حاضری لگانے لگے۔ وہ تمام لڑکیوں کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتے تھے۔

دو آئرس لڑکیاں وہاں سے ہال میں آ ئیں۔ یونگ کے منہ سے پھر بے ساختہ نکلا'' آخر

اتنی رات گئے یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''کوئی بھاگ گیا ہے'' ایک لڑکی نے جواب دیا۔''چوکیداروں میں سے کسی ایک نے کسی کو دیوار پھاندتے اور بھاگتے دیکھا ہے''۔ پولیس والوں نے سارے کمروں میں جا جا کر دیکھا۔ بالآخر انہوں نے کرسنتھمی روم میں سب کو اکٹھا کر کے' دوبارہ شمار کیا۔ کوئی لڑکی رسی کی مدد سے' کسی ٹارزن کی طرح' کھڑکی کے راستے لمبی چھلانگ لگا کر فرار ہو گئی تھی۔ اپنے وقتوں میں وہ یقیناً کوئی افسانوی کردار رہی ہو گی! بہر حال بعد میں کھڑکیوں پر آہنی جالیاں لگا دی گئیں۔

لڑکیوں کی گنتی کبھی کی ہو چکی تھی مگر وہ سپاہی ابھی تک وہیں براجمان تھے۔ میرا خیال ہے وہ ابھی تک ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ماؤسی (نگران اعلیٰ) کا یہ نام اس لئے پڑ گیا تھا کہ ان کی شکل شاید چوہے جیسی تھی۔ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر میری طرف اشارہ کیا۔''وہ دیوار پھلانگ کر اندر آئی ہے' ممکن ہے چوکیدار نے اندھیرے میں اسے ہی دیکھا ہو اور یہ سمجھ بیٹھا ہو کہ وہ یہاں سے بھاگ ہی ہے۔''

''تم دیوار پھاند کر اندر آئی تھیں'' ایک سپاہی نے حیرت سے پوچھا۔

انہوں نے سپاہی کو کمرے سے جانے کیلئے کہا پھر میری طرف متوجہ ہوئیں''تم تو یہاں آنا ہی نہیں چاہتی تھیں' چنانچہ تم نے نیند کی گولیاں نگل لیں اور پھر یہ سب ڈرامہ کر ڈالا''۔ سارے جوابات تھے ان کے پاس' لڑکیاں دبی دبی ہنسنے لگیں۔ ایک لڑکی ٹوما نے ماؤسی کے پیچھے سے آواز لگائی۔'' لگتا ہے کچھ لوگ یہاں آنا پسند بھی کرتے ہیں' چلو کوئی تو ایسا ہے تو دیوار پھاند کر' اندر آیا''

جب بھی کوئی نئی لڑکی یہاں آتی ہے تو ہم اس قسم کا تماشا کرتے ہیں تاکہ اس کی ذہنی اذیت کو کم کر سکیں۔ لیکن ایک دفعہ یہاں آنے کے بعد وہ اپنی دلچسپی کا کام ڈھونڈ لیتی ہے۔ دن یہاں کچھ جلدی شروع ہو جاتا ہے اپنے گھروں میں تو لڑکیاں بستروں میں' جب تک چاہیں گھسی رہتی ہیں مگر یہاں سب کو سات بجے اٹھنا ہوتا ہے۔ اپنے کمرے کی ایک ایک چیز کو صاف ستھرا کرنا ہوتا ہے' بعض لڑکیوں کے ذمے ناشتہ بنانا ہوتا ہے سو وہ کچن کا رخ کرتی ہیں۔ صفائی کے کام سے فارغ ہوتے ہی ہم سب نچلی منزل میں آ جاتی ہیں۔ چاول اور سوپ کے ساتھ مٹر کی پھلیاں ہوتی ہیں۔ کوئی گوشت وشت نہیں' مگر بھوک صبح سے ہی ایسی ظالم لگتی ہے کہ لفظوں میں اس کا بیان ممکن نہیں۔

کھانے کے اوقات' کمروں کی صفائی یا پنسلین لگوانے کے علاوہ' باقی وقت ہم اپنی مرضی سے گزارتی ہیں۔ کبھی رسالے پڑھنے لگے' ٹی وی دیکھنا شروع کر دیا مگر زیادہ تر وقت تاش کھیلنے اور الٹی سیدھے ہانکنے میں ہی کٹتا ہے۔ فطری سی بات ہے ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش تو ہوتی ہے۔ کرسٹھی مم روم میں میرے ساتھ یونگ جاتھی جو بات بے بات قسم کھاتی رہتی تھی۔ ایک اور ساتھی ٹوماتھی جو ہر وقت اپنے مختلف النوع ''پہلی محبت'' کے تجربات سنانے پر تلی رہتی تھی۔ چاؤ چا نامی لڑکی کو مصنوعی پلکیں لگانے کا بہت شوق تھا۔ مگر کم بخت منہ کبھی نہیں دھوتی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی ٹیناتھی جو نچلی ہی نہیں بیٹھتی تھی اس لئے سب اسے چلبلی کہنے لگے۔ پھر سنی تھی جو اپنی شادی پہاڑوں میں کرانا چاہتی تھی حالانکہ اس کی بدقسمتی دیکھئے کو جو پہلا آدمی' حادثاتی طور پر اسے ملا' اس نے بھی اسے محض ایک بکاؤ چیز سمجھا۔ بے چاری تیس سالہ سنی! جانے کس طرح کا میک اپ کرتی تھی کہ اس کا چہرہ بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔ کمرے میں' ہماری سب سے عمر رسیدہ ساتھی سنجا تھی۔ عمر اس کی چونتیس سال تھی۔ اپنے لمبوترے چہرے اور جھکی جھکی آنکھوں کے ساتھ وہ خاصی شریف عورت لگتی تھی۔ شکل وصورت واجبی سی تھی اور بولتی بھی بہت کم تھی۔ چنانچہ اس پر لوگوں کی دوسری نگاہ ذرا کم ہی پڑتی تھی۔ سارا دن کروشیا اس کے ہاتھ میں ہوتا او وہ کچھ نہ کچھ بنتی رہتی۔ دوسری لڑکیاں اس کے اس انداز کی عادی ہوگئی تھیں۔ جب وہ کھیلنے یا گپ شپ لگانے بیٹھتیں تو اسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا۔ سوسارا دن سنجا کے پہلو میں ٹکتی بیل' کسی ننھی سے آبشار کی طرح' ادھر ادھر بکھرتی جاتی۔

پہلے دن تو میں نے اس کی کڑھائی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی دوسرے دن جب میں نے ناشتے کے فوراً بعد' اسے پھر اسی کام میں مشغول پایا تو میں اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی۔ تجسس کے عالم میں' میں نے ایک زور دار کش لے کر سگریٹ سلگائی اور اس کے اوپر اس کا دھواں پھینک دیا۔ سنجا مجھ سے بالکل بے خبر تھی۔ پتھریلا چہرہ اور جھکی ہوئی آنکھیں لئے' صرف اس کے ہاتھ' البتہ خود بخود حرکت میں تھے۔ گھنے بال چہرے کے دونوں طرف اس طرح پڑے تھے کہ اس کی صورت ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ کھردرے بال اس کے مسکین چہرے پر کچھ زیادہ بھلے بہر حال نہیں لگ رہے تھے۔ میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کر ڈالا۔

''کیا مزا آتا ہے تمہیں اس کام میں؟ جب دیکھو اس بنائی کڑھائی میں لگی رہتی ہو۔''

سنجا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کڑھائی کی مخصوص لائن ختم کر کے اپنی آنکھیں اوپر

اٹھا سکتی تھی۔ کام ختم کرتے ہی وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ سے مجھے لگا کہ میں اس کیلئے اجنبی نہیں۔

''مزا کیا خاک آئے گا اس کام میں' میں تو بس مصروف رہنا چاہتی ہوں''

''کسی نے تم سے کہا ہے یہ کام کرنے کے لئے؟''

''نہیں' شاید میں عادتاً اس میں لگی رہتی ہوں جیسے کچھ لوگ تسبیح کے دانوں پر کچھ نہ کچھ پڑھتے یا مناجات میں مصروف رہتے ہیں''۔

میں بغور اسے دیکھ رہی تھی کہ اس نے مجھ سے پوچھ لیا ''کیا عمر ہے تمہاری؟''

''چھبیس سال''

''یہ عمر تو ٹھیک ٹھاک ہے' اس عمر میں میرے ایک بچہ ہو گیا تھا۔ میں زیادہ سمجھدار ہوتی تو بچے ہونے ہی نہ دیتی۔ نہ جانے آج کل وہ بچے کہاں ہوں گے۔ کیسے پل بڑھ رہے ہوں گے؟'' لمحے بھر کو اس کے ہاتھ رکے اور پھر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ بیل کہاں استعمال کرے گی۔ بڑا مضحکہ خیز سا کام تھا جیسے کوئی چمچے کی مدد سے مٹی کھودنا چاہ رہا ہو۔

''یہ بستر کی چادر کی بیل بن رہی ہے۔ میں نے بہت سی چیزیں بنی ہیں۔ میز پوش' پردے' تکیہ غلاف' شادی کے بعد' یہ سب چیزیں میرے کام آئیں گی' سمجھیں کہ نہیں؟''

''تم......تم شادی کرنے جا رہی ہو؟''

''کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گی''

ایک احمقانہ سی ہنسی میرے ہونٹوں پر آ گئی۔ سنجانے کسی بن پانی مچھلی کی طرح اپنے سر کو جھٹکا ''تمہیں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں کسی حبشی سے شادی کروں گی......چاہے عمر میں وہ میرے دادا کے برابر ہی کیوں نہ ہو''۔

کتنے عجیب اور دلچسپ لوگ پائے جاتے ہیں اس دنیا میں' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ خیال اکثر میرے ذہن میں آتا ہے۔ ہر آدمی میں' جسے بھی آپ قریب سے دیکھیں۔ تھوڑا بہت الجھاؤ تو ہوتا ہی ہے۔ کچھ لوگوں میں یہ پیدائشی ہوتا ہے اور کچھ حالات کے ہاتھوں اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ الجھاؤ آدمی کو کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔

فوجی مرکز کے قریب رہتے ہوئے' ہر طرح کے لوگوں سے میرا پالا پڑا ہے۔ میں اسے

زندگی کی حقیقی تعلیم سمجھتی ہوں۔ شاید اسی وجہ سے میرے تجربات' دوسروں کی نسبت' خاصے انوکھے ہوتے ہیں۔ اسی تعلیم کی بدولت' میرے پاس گفتگو کرنے کیلئے بہت کچھ ہوتا ہے۔ ممکن ہے مجھے بولنے کا فن بھی آتا ہو۔ میں بولنے پر آتی ہوں تو آسانی سے نہیں رکتی۔ محفلوں میں لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ ''بندر گھر'' میں بھی یہی ہوا۔ ابھی مجھے یہاں آئے چار روز ہی ہوئے تھے کہ کرسینتھمی روم میں دلچسپ کہانیاں جنم لینے لگیں۔ گندی گندی کہانیاں سننے سنانے میں لڑکیوں کو بڑا مزا آتا ہے۔ ہم بیٹھے کارڈز کھیل رہے تھے کہ یونگ جا کو نہ جانے کیا سوجھی اپنی باری پر کارڈ پھینکا اور کہنے لگی۔

''لعنت ہے'' نہ جانے ان سوکھے سڑے ہاتھوں سے اس ملغوبے میں کیا کرتی ہو؟'' وہ چاؤ جا سے مخاطب تھی۔ اس وقت بھی چاؤ جا کے پاس دو ہزار وون کے نوٹ پڑے تھے۔ ''میں جانتی ہوں چھوٹی کالی مرچ زیادہ چٹپٹی ہوتی ہے لیکن جھٹکا بھی کچھ کم نہیں دیتی''

چاؤ جا نے اپنی ایڑی غصے میں زمین پر ماری پھر کھسیانی ہو کر بولی ''وہ خبیث امریکی بھی یہی کہہ رہا تھا کہ میں بالکل گڑیا ہوں' ننھی منی! قد میرا چھوٹا ہے' ہاتھ بھی چھوٹا ہے اور منہ' وہ بھی چھوٹا ہی ہے۔ میں نے پتہ ہے اسے کیا جواب دیا'' بالکل صحیح میں ہر طرح سے ننھی منی گڑیا ہی ہوں مگر میری ایک چیز بڑی ہے اور اس کا علم تمہیں میرے ساتھ ہم بستری کے بعد ہی ہوگا''

ٹوما نے سرخ رنگ کا ایک بے وقعت کارڈ پھینکا' پھر اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر بولی ''تمہاری' چھوٹے بڑے کے متعلق باتیں سن کر میرے اندرونی اعضاء تک میں دوبارہ درد ہونے لگا ہے۔ دستوں اور الٹیوں نے مجھے الٹا ہی دیا تھا۔ ہوا یوں' یہاں آنے سے پہلے میں بھی ایک فوجی سے ٹکرا گئی۔ وہ مجھ سے غیر فطری جنسی حظ اٹھانا چاہتا تھا۔ شومئی قسمت میں نے بھی فرض کر لیا کہ میں لڑکا ہوں۔ اب حیرت سے منہ نہ پھاڑو' پتہ نہیں میرے اندر کتنی دور تک چیر پھاڑ ہوئی ہو گی۔ میں چیختی رہی ارے بابا مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا۔ اس وقت تو اس نے سنی ان سنی کی مگر بعد میں میں نے اس سے دس ڈالر زیادہ اینٹھ ہی لئے''

''میرا خیال تھا کہ ہم جنس ہی اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں'' سنی نے ٹانگ اڑائی ''پتہ نہیں' انہیں بھی تکلیف ہوتی ہوگی یا نہیں۔ ان کا تصور ذہن میں آتے ہی میری ہنسی چھوٹنے لگتی ہے۔ میرے خیال میں ہم جنس پسند عورتیں زیادہ بہتر ہوتی ہیں' دیکھنے میں بھی وہ زیادہ اچھی لگتی ہیں''۔

''تو تمہارا یہ خیال ہے؟'' میں نے جواب دیا۔''میں بھی ایک ہم جنس پسند عورت کو جانتی ہوں' بے پناہ خوبصوت اور حسین۔ مجھے اندازہ ہے کہ کوئی بھی عورت اس کیلئے پاگل ہوسکتی ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس نے مجھے ہاتھ لگایا تو میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم اس کے ساتھ سوئی تھیں؟''ٹوما نے اپنے کارڈ نیچے پھینک دیئے اور تیوری چڑھا کر مجھ سے پوچھنے لگی۔

''مجھے تو شادی کی پیشکش بھی ہوئی تھی'' میں نے اپنا کارڈ کھیلتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

''کسی عورت کی جانب سے؟'' اب سبھی نے اپنے کارڈز نیچے پھینک دیئے۔ یونگ جا نے اپنے کارڈ نیچے ڈالتے ہی سگریٹ سلگا لی۔

بندرگھر آنے سے کوئی ہفتہ پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

میں نے اس طرح کہنا شروع کیا جیسے میں کوئی بہت ہی اہم کارڈ کھیلنے جارہی ہوں۔ اوورٹن قبرستان کی شفٹ میں کام کررہا تھا اور عرصہ دراز کے بعد' شام کے وقت مجھے فرصت اور تنہائی ملی۔ غالباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یہ آن کی بوڑھی بیوی تھی۔ آن اس کلب کا مالک ہے' جہاں میں کام کرتی ہوں۔ اس کے برابر میں ہی ایک انتہائی خوبصورت سیاہ فام عورت کھڑی تھی۔ موہنی سی بیضوی صورت اور نازک ہونٹ' حبشیوں کے ہونٹ تو ایسے ہوتے ہی نہیں۔ آن کی بیوی نے پہلے تو اوورٹن کی غیر موجودگی کا یقین کیا' بعد میں اس نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

وہ حبشی عورت فوجی سپاہی تھی اور کسی فوری تربیت کے سلسلے میں اسے جاپان سے کوریا آنا پڑا تھا۔ وہ کسی کورین عورت سے ملنا چاہتی تھی۔ آن کی بیوی نے بتایا کہ وہ غالباً کسی ایسی لڑکی سے دوستی کرنا چاہتی ہے جو اسے اردگرد کا علاقہ دکھا سکے' سیر تفریح کرا سکے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس عورت نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور بار برا کہہ کر اپنا تعارف کرایا۔ میری نظر اس کے موتیوں جیسے شفاف دانتوں پر پڑی اور چونکہ میں اس وقت بے یقینی کی سی کیفیت میں تھی'اس لئے صرف یہی کہہ سکی ''تم سے مل کر خوشی ہوئی''۔

شروع میں تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ باربرا حقیقت میں ہے کیا چیز۔ وہ اپنے ہمراہ کوگناک کی بوتل لائی تھی۔ ہم بیٹھے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھ سے ادھرادھر کی باتیں پوچھتی رہی۔ وہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

میں اپنے ماضی کی، سکول کے دنوں کی باتیں بتانے لگی۔ جب میں گھر سے بھاگ جایا کرتی تھی کیونکہ ہمارا گھرانا بہت غریب تھا۔ بمشکل گزارا ہوتا تھا۔ اس زمانے کی خود پر بیتی تکلیفیں اور پریشانیاں، خود بخود زبان پر آتی چلی گئیں۔

بار برا میری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ میری باتوں کا رنگ اور رخ بدلنے کے ساتھ ساتھ، اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدلتے جا رہے تھے۔ باتیں ختم ہوئیں تو اس نے پوچھا ''کیا تم اپنی اس زندگی سے مطمئن ہو؟'' میں نے فوراً ہی کہا ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور میں کیا کرتی ہوں۔''

''بار برا بائیس برس کی ہے'' میں بولتی رہی۔ ''مجھ سے کم عمر مگر عورت ہونے کے ناطے، ہم آپس میں بلاتکلف گفتگو کر رہے تھے۔ ذہنی طور پر ہم ایک دوسرے کے خاصا قریب آ گئے تھے۔ میں نے اس کا کوٹ لٹکانے کے لئے وارڈ روب کھولی تو اس وقت بھی ہم مردوں کی گندگی اور خباثت کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے۔ سامنے ہی اسے اوورٹن کی لیدر جیکٹ اور دو سوٹ لٹکے نظر آ گئے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں کسی مرد کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ بس یونہی بات بنا دی کہ میں نے کسی فوجی سے چھین لئے تھے۔ وہ ایک رات یہاں سویا تھا مگر اس نے مجھے صحیح معاوضہ نہیں دیا تو بدلے میں، میں نے یہ کپڑے رکھ لیے۔

ایسا اکثر ہوتا ہی رہتا ہے، ہے نا؟ اس نے جرمن شیپرڈ جیسے اپنے نازک ہونٹ سکوڑے اور کہا ''بخیل، حرامی کہیں کے!'' یوں لگا جیسے وہ نفرت سے تھوک رہی ہو۔ مرد ذات سے شاید اسے کوئی ہمدردی تھی ہی نہیں۔ میں نے بھی اظہار نفرت کے لئے ایک ہوائی ٹھوکر ماری جس سے غالباً میری وقعت اس کی نظروں میں کچھ اور بڑھ گئی۔

جہاں تک سونے کا معاملہ ہے، میرا اپنا طریقہ ہے، اسے عادت سمجھ لیں۔ میں فطرتاً بہت رکھ رکھاؤ کی قائل نہیں، بلا وجہ کے الجھاوے بھی نہیں رکھتی۔ کاروبار کی بات اور ہے، ورنہ میں انجان لوگوں کے ساتھ سو ہی نہیں سکتی۔ ویسے بھی میں سوتے ہوئے لباس کا تکلف نہیں کرتی۔ سو چند لمحے میں بیٹھی سوچتی رہی۔ بار برا نے اس دوران کپڑے اتار دیئے۔ برائے نام ایک زیر جامہ رہ گیا۔ جانے اس میں وہ کیا چھپا رہی تھی۔ اس کا ہموار اور پھسلوان بدن کسی جل پری سے مشابہ لگ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کپڑے کیوں نہیں اتار رہی۔ میرا اپنا سٹائل ہے سونے کا، میں نے اسے بتایا۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

لیٹنے کے شاید دس منٹ بعد مجھے شدید غنودگی کا احساس ہوا۔ میرا خیال ہے، ہم خاصی پی بیٹھے تھے۔ خوش قسمتی سے میرے ذہن میں یہ رہا ہی نہیں کہ اس وقت میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ نشہ حد سے زیادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اچانک مجھے لگا جیسے میری چادر اوپر کو اٹھ رہی ہے۔ میں اسے اپنے تصور کا کرشمہ سمجھی اور خود کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر مجھے اپنی کمر پر نرم سا لمس محسوس ہوا۔ غالباً وہ یہ جاننا چاہ رہی ہے کہ میں ابھی تک سوئی ہوں یا نہیں۔ میں نے سوچا مگر میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ رینگتا ہوا میری قمیض کے اندر آ گیا۔ بڑی عجیب سی کیفیت تھی میری۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ اس کا لمس کمر سے ہوتا ہوا' اب میرے سینے کے طرف آ گیا تھا۔ اس کے لمس میں حدت تھی مگر اس کے سانپ جیسے نرم و گداز تحرک کے ہاتھوں' میرے پورے بدن میں کپکپی سی طاری ہو گئی۔ میں تھوڑا سا پیچھے کھسک گئی۔

''بات یہیں ختم نہیں ہوئی' بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے' پھر مجھے اس کی انگلیوں کا لمس محسوس ہونے لگا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں غصے میں اٹھ کھڑی ہوتی اور کمرے کی لائٹ جلا دیتی لیکن نشے میں بری طرح دھت ہونے کی وجہ سے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں نیند میں بول رہی ہوں۔ میں بہت تھک گئی ہوں اور اب مجھے پرسکون نیند کی سخت ضرورت ہے۔''

میں سگریٹ نکالنے لگی تو چاؤ جا اورسنی اوپر تلے بول پڑیں ''تمہیں عجیب شاید اس لئے لگا کہ وہ ایک عورت کا ہاتھ تھا' ٹھیک ہے نا؟''

''حبشی عورتیں ہوتی زوردار ہیں' ہیں نا؟''

''شاید میں کچھ متعصب ہو رہی ہوں'' میں نے کہا ''وہ بلا کی خوبصورت ہے مگر مجھے بالکل پگھلا نہیں سکی''۔

ایک دبا دبا قہقہہ فضا میں گونجا۔ یونگ جا مجھ پر نظریں گاڑتے ہوئے بولی ''جہنم میں جائیں یہ مرد' میں تو ان کے درمیان روندے اور کچلے جانے کے بجائے' ہم جنسی ہی پسند کروں گی۔ اس نے کچھ بتایا تھا کہ تم دونوں شادی کیسے کر لو گی؟''

ہر نظر میں استعجاب تھا چنانچہ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ اگلی رات پھر آ ئی۔ میں پچھلی رات بالکل نہیں سو سکی تھی۔ صبح اس کے جاتے ہی اوورٹن آ دھمکا تھا۔ سو دن میں بھی مجھے کوئی آرام نہیں ملا۔ ڈنر کے فوراً بعد میں نے اوورٹن کو اس کی ڈیوٹی پر بھیج دیا مگر دوسرے لمحے

باربرا موجود تھی۔ اس نے اندر آنے کے بجائے کسی کلب جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بری طرح نڈھال تھی مگر قہر بر جان درویش' میں راضی ہوگئی۔ شاید اپنے اندرونی تجسس کی وجہ سے۔ کئی سال پہلے جب میرا کالوں کے ساتھ میل جول تھا' میں ان علاقوں میں خاصا گھوم پھر چکی تھی اس لیے اسے کالوں کے کلب میں لے جانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

اس رات بھی شراب تھی اور ہم تھے۔ باربرا نے خاصی پینے کے بعد ڈانس کی فرمائش کی۔ دو عورتیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ ڈانس کر رہی ہوں تو ارد گرد موجود لوگوں کی نظریں تو اٹھتی ہی ہیں۔ میں خاصی مضبوط ہوں اندر سے مگر اس وقت میں بھی گھبرا گئی لیکن باربرا' اپنے ارد گرد سے بے پروا' میری کمر میں ہاتھ ڈالے رقص میں مصروف تھی۔ کچھ دیر بعد ہم واپس میز پر آ بیٹھے۔ فوراً ہی ایک کالا منہ میں سگریٹ کا فلٹر چباتا ہوا' ہماری طرف بڑھا' اس کی چال ڈھال نے مجھے مزید سراسیمہ کر دیا۔ نزدیک آتے ہی وہ بول پڑا' اکیلی ہو سسٹر؟ میری ساتھی بننا چاہو گی؟ باربرا اس کی بات کاٹ کر بولی: معاف کرنا' میں کالوں کو پسند نہیں کرتی اور ہاں' کوریائی لوگوں کو بھی کبھی کبھار ہی چاہتی ہوں۔''

''غالباً اس کے ہم جنس ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔'' ٹوما نے بغیر سانس لیے لقمہ دیا۔ ''اس کے علاوہ سیاہ فام لڑکی کا کسی سفید فام سے شادی کرنا بھی کچھ کم مصیبت نہیں۔''

یونگ جا بھی بیچ میں کود پڑی۔ ''مردوں کے خلاف نفرت کی اس کے پاس کوئی خاص وجہ ہوگی۔ مردوں سے کیا کچھ نہیں ملتا ہمیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عورت کا تھوک زمین پر پڑے تو جون میں بھی سردی ہو جاتی ہے۔ ہم جنسی کے بجائے ہم مرد کا براحشر کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے میں اسے اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔''

''میں بھی اس کی کیفیات جان سکتی ہوں۔'' سنی نے کہا کہ مگر ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ کس طرح سو سکتی ہے' میں یہ جاننا چاہتی ہوں۔''

''وہ بھی جان لو گی بھئی۔'' میں نے سنی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں صبر کی تلقین کی۔ ''کلب سے باہر نکلے تو دو لمبے تڑنگے کالے ہمارے پیچھے تھے۔ لوفروں کی طرح سیٹیاں بجا رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے آوازہ کسا: اے لمبی لڑکی! دیکھیں تو تمہاری زبان کتنی لمبی ہے؟ مجھے اس وقت اس فقرے کی سمجھ نہیں آئی۔ گھر واپسی پر باربرا نے مجھے چالیس ڈالر دیئے اور کہا کہ یہ تمہارا معاوضہ ہے۔ تم نے مجھے اتنا وقت دیا۔ یہ کہہ کر وہ جانا چاہ رہی تھی' پھر نہ

جانے کیا سوچ کر مڑی اور کہنے لگی۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ کیوں نہ ہم شادی کرلیں؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں سمجھی وہ تھوڑی سی سنکی ہے۔ بھلا دوعورتیں آپس میں کیسے شادی کرسکتی ہیں؟ اس نے آنکھیں جھپکائے بغیر کہا: میں تمہیں کسی بھی مرد سے زیادہ مطمئن کر سکتی ہوں۔ میں اسی وقت اس کی وضاحت نہیں کرسکتی لیکن میں تمہیں دیوانہ بنادوں گی۔ تمہیں کبھی کسی مرد کی خواہش نہیں ہوگی۔ اب میرے ذہن میں اس کالے کا فقرہ دوبارہ گونجا اور ساتھ ہی اس کا مطلب بھی۔ پھراس نے اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات کہی۔ اگر میں اس سے شادی پر رضامند ہوجاؤں تو پہلے مجھے کوئی امریکی شہری ڈھونڈنا ہوگا تاکہ اس سے رسمی شادی کرسکوں۔ امریکہ پہنچنے کے بعد میں اس سے طلاق لے لوں گی۔ وہ اس دوران مجھ پر ایک ہزار ڈالر آرام سے خرچ کردے گی۔ اس نے مجھے کسی سفید فام کو پھانسنے کا مشورہ دیا کیونکہ ایسی صورتوں میں سفید فام باآسانی جال میں پھنس جاتے ہیں۔ پھر! اس نے مجھے کچھ اور رقم دی۔ بات یہیں بس نہیں ہوئی۔ جب تک میں ایسا کوئی مناسب آدمی نہیں ڈھونڈ لیتی' وہ مجھے ہر ماہ دوسو ڈالر بھیجتی رہے گی۔

''بھاڑ میں جاؤ'' یونگ جا پھٹ پڑی ''جھوٹی کہانیاں سنانا کوئی تم سے سیکھے۔''

''کون یقین کرے گا اس پر'' ٹینا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

میں قطعی نہیں سٹپٹائی' مسکراتے ہوئے میں نے کہا ''باربرا کو بھی ان شبہات کی توقع تھی۔ سو وہ پہلے ہی اس کے لیے تیار تھی۔ ڈبل کراس کا امکان تو ہمیشہ ہی رہتا ہے مگر ہم دونوں عورتیں ہیں اس لیے مجھ پر اعتماد کرو۔ یہ تھے اس کے الفاظ۔''

''سب کچھ اسی طرح ہو بھی جائے تو بھی میں اس کے ساتھ رہنا سوچ نہیں سکتی۔'' سنی نے کہا ''بعض اوقات ہم کہتے ہیں کہ مرد ہمیں پسند نہیں یا ہمیں ان سے نفرت ہے پھر بھی عورتوں کو رہنا تو مردوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن اگر دوعورتیں ہم خیال اور ہم مزاج ہوں تو دنیا کا کون سا قانون انہیں ساتھ رہنے سے روکتا ہے۔'' ٹوما نے کہا ''سوان کے ہم جنس ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لوگ جیسے چاہیں' زندگی گزارتے ہیں اگر ہم فاحشائیں بن کر رہتی ہیں تو کیا کسی کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے۔ ہاں روپے پیسے کی پریشانی تو ہوگی ورنہ کیا خوبصورت اور ٹھاٹھ دار زندگی ہے نہ کوئی حکم چلانے والا شوہر' نہ روتے چیختے بچے بلا روک ٹوک اور اپنی مرضی کی آرام دہ زندگی۔''

''یہ تو ہے۔'' سنی نے کہا۔

اس گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ ہم خود اپنی زندگیوں کی اہمیت سمجھیں اور الٹے سیدھے خیالات کے بغیر خود کو خوش اور پرسکون رکھیں۔ یہ سوچیں کہ زندگی کس طرح بہتر گزر سکتی ہے؟ ہم عورتوں کو زندگی کی تمام حقیقتوں کا سامنا کرنا ہے اور اس معرکے میں ہمارا جسم ہی ہمارا واحد اثاثہ ہے۔ ہم اپنی ساخت اور خوشبو میں بے شک گلاب کی طرح نہ ہوں پھر بھی ہمیں زندگی اور آزادی کو اپنے رخ سے دیکھنا آنا چاہئے۔ نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے ہم سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ پھیلتے ہوئے دھوئیں میں ہماری سوچیں مجتمع ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک سنجا کے سوال نے ہمیں چونکا دیا۔

''پھر اس کے بعد' تمہارے اور باربرا کے درمیان کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔ کروشیا اس کے ہاتھ میں تھا مگر اس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ لگتا ہے وہ ہماری گفتگو سنتی رہی تھی۔

''اسے کوئی اور عورت ڈھونڈنا ہوگی۔ میں تو کسی ہم جنس سے شادی کا سوچ ہی نہیں سکتی۔ ہاں' اگر تم میں سے کسی کو دلچسپی ہے تو بتاؤ۔ باربرا کا یہاں قیام چند دنوں سے زیادہ نہیں۔'' ہر طرح کے تجربات کی بھٹی میں سے گزر آنے والی ان عورتوں کیلئے بھی باربرا کے ساتھ میرا تجربہ عجیب و غریب نوعیت کا تھا۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا کیا جائے۔ بہرحال جہاں تک میرا تعلق ہے' میں اس واقعے پر باتیں ہی بنا سکتی تھی' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مستقبل کے بارے میں کوئی بھی پیش گوئی نہیں کر سکتا' تاہم میں ہم جنس بننا پسند نہیں کرتی تھی۔ میں ایسی بھرپور عورت بننا چاہتی تھی جو اپنے مرد کی ہوتی ہے۔ یہی فطری تقاضا ہے اور صحیح طریقہ بھی۔ میں نے باربرا کو صاف صاف بتایا تھا: میں تمہیں سمجھ سکتی ہوں مگر تمہاری پیشکش مجھے قبول نہیں۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سنجا باربرا میں دلچسپی لے گی۔ دن کا وقت تھا۔ میں بندرگھر سے اپنے گھر چلی گئی۔ شام ہونے سے ذرا پہلے ہی میں بن سنور کر کلب کے لیے روانہ ہوگئی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں اوورٹن میرے پیچھے گھر نہ آ پہنچے۔ میری پڑوسن ایجا کے مطابق اسے رات آٹھ بجے کے اردگرد گھر ہونا چاہئے تھا لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم تھی۔ مجھے گھر سے دور ہی رہنا چاہئے۔ کلب ویران پڑا تھا۔ میں کونے کی ایک میز پر بیٹھی مارٹینی کی چسکیاں لے رہی تھی کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرا نام لیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو چند فٹ دور دو عورتیں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک سوجین تھی' جو کلب میں ہی کام کرتی تھی: کسی کو

تمہاری تلاش ہے۔اس نے دوسری عورت کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا۔

ملگجی روشنی میں دوسری عورت کا سفید لباس ہوا میں تیرتا محسوس ہو رہا تھا۔ایک بے تاثر سا چہرہ جیسے کسی نے ماسک چڑھا رکھا ہو۔وہ میرے قریب آ کر رک گئی۔یہ سنجا تھی۔

''اوہ! میں تو تمہیں کوئی بھوت پریت سمجھی تھی۔'' میں نے کہا

''میں تمہارے گھر گئی تھی' وہاں سے پتہ چلا کہ تم کلب جا چکی ہو تو میں تمہارے پیچھے یہاں چلی آئی۔جلدی نہیں آ گئیں یہاں؟'' اس نے جواب دیا۔

میرا خیال ہے' پانچ دن لگاتار گھر میں قید رہنے سے میں تنگ آ گئی تھی' تم سے جدا ہو کر بھی کوئی بہتر صورتحال پیدا نہیں ہوئی۔بس مجھ سے انتظار نہیں ہو پا رہا تھا۔'' بڑے غیر محسوس انداز میں سنجا برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔''یہاں تمہیں کیا مجبوری لے آئی؟'' بالآخر میں اس سے پوچھ بیٹھی۔

''میں پوچھنا چاہتی تھی کہ باربرا سے کیسے مل سکتی ہوں؟''

میں اس کے عزائم کے بارے میں قطعی بے خبر تھی۔'' یہ تمہیں اچانک باربرا سے ملنے کی تمنا کیوں ہو گئی؟''

''مجھے اس سے ملوا دو۔ملوا دو گی نا؟ اسے کہنا کہ ایک عورت تمہاری واقف ہے جو اس کی دوست بن سکتی ہے؟''

''یہ چکر کیا ہے؟'' میں نے اسے مشتبہ نظر سے دیکھا۔

''میری مدد کرو' کرو گی نا میری مدد؟'' اس کی آواز گلوگیر ہو گئی' تاہم اس کے چہرے پر سرد مہری اور درشتی کے تاثرات اسی طرح موجود تھے۔''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے امریکہ جانا ہے۔تمہارا خیال ہے کہ میں یہاں چہل قدمی کیلئے آئی ہوں۔اس عمر میں' میں اب یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی۔بس میں یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔''

''تو تم باربرا سے شادی کر لو گی؟'' میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔''یہ سب اتنا آسان بھی نہیں۔''

''مجھے پتہ ہے کسی امریکی سے شادی کرنا ہی کارآمد ہو گا۔سینکڑوں خوبصورت لڑکیاں ماری ماری پھر رہی ہیں۔مجھ جیسی کو بھلا کون قبول کرے گا؟ سنا ہے کچھ امریکی کوریا سے واپس جا رہے ہیں اور اگر یہ سچ ہے تو ان کے گرد عورتوں کی بھیڑ اور بھی زیادہ ہو گی۔میں انہی کے

ساتھ نکل جانا چاہتی ہوں۔ بس مجھے باربرا سے ملوادو۔ آگے میں خود راستہ بنالوں گی۔'' اس نے میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ اس کے ہاتھ میں اچھی خاصی حرارت اور قوت تھی۔ میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے نرمی سے کہا ''تو تم لزبین بننے پر راضی ہو؟''

اس نے بھنائی ہوئی آواز میں کہا ''ضرورت پڑی تو میں بندریا بن کر ناچ بھی لوں گی۔ یہاں رہنے سے تو بہتر ہوگا۔ ہر روز میری بیزاری بڑھ رہی ہے۔ یہ جگہ کسی جہنم سے کم نہیں۔''

میں شاید اسے سمجھا ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی محرومیوں کے باعث پریشان اور دکھی تو تھی لیکن کچھ نہ کچھ کرنے کی خواہش بھی اس میں بہت تھی۔ میں اس کی کیفیت پر حیرت زدہ تھی۔ اتنی اندھی جذباتیت' خدا کی پناہ' بڑی مشکل سے میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''اگر میں باربرا سے تمہاری ملاقات کا انتظام کرا بھی دوں تو بھی میں اس ملاقات میں نہیں آؤں گی۔ میں کوئی کٹنی یا دلالہ تو ہوں نہیں اور ویسے بھی میری موجودگی سے تمہیں شاید ہی فائدہ ہو۔ اگر میں نے شادی کرانے والی مشاطہ کا کردار ادا کیا تو باربرا نہ جانے کیا سوچے؟''

''تم صرف اتنا کرو' مجھے وہ جگہ بتادو' جہاں اس سے ملا جا سکتا ہو۔ باقی سب میں خود دیکھ لوں گی۔ نتیجہ جو بھی نکلے۔'' سنجا نے اصرار کی حد کردی۔ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔ جی چاہا سر دیوار سے ٹکرا دوں مگر پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''جلد بازی نہ کرو' میرا خیال ہے آن کی بوڑھی بیوی تمہیں اس سے ملواسکتی ہے۔ میرے پاس بھی باربرا کو وہی لائی تھی۔ مجھے یقین ہے وہ تمہاری مدد ضرور کرے گی۔''

''چلو' پھر............ چلتے ہیں' یہاں تو کوئی امریکی نظر نہیں آ رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وقت میرے ہاتھ سے نکل ہی چکا ہو۔'' سنجا نے کہا۔

وہ کہاوت ہے نا: بروقت فیصلہ' کامیابی کا سلسلہ۔ سو میں نے یہ کام اسی وقت کر ڈالنے کی ٹھانی' سنجا کو آن کی بیوی سے ملوانا مجھے خاصا مضحکہ خیز لگا مگر میں وعدہ کرکے پھر بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر سنجا مناسب تعارف کے بغیر باربرا سے ملے اور اسے اپنے لیے قائل نہ کر سکے تو؟ آن کی بیوی تو شاید اسے رواروی میں ہی اس سے ملوا دے گی۔ ممکن ہے کوئی بہتر صورت پیدا ہو جائے۔ میں نے جب اسے باربرا کی ہم جنسی کے متعلق بتایا تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ شاید وہ پہلے سے جانتی تھی۔ پھر میں نے اسے سنجا کی خواہش کے بارے میں بتایا' تب بھی اسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا ''لگتا ہے اب اس کا دل مردوں سے بھر

گیا ہے!'' میری بات سننے اور سنجا کو دیکھنے کے بعد' آن کی بیوی بڑے غیر جذباتی اور کاروباری انداز میں بولی۔'' میں اسے بار برا سے ملوا دیتی ہوں۔ اگر ان کا معاملہ طے پا گیا تو؟'' اس نے بھرپور نظر ہم دونوں پر ڈالی۔'' تم مجھے کمیشن دو گی؟'' اس نے بات ختم کرتے ہی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وقت وقت کی بات ہے' ادھر کچھ سال پہلے تک وہ کسی گھسیارے کی بیوی تھی اور بڑی کسمپرسی کے حالات تھے اس کے لیکن اب وہ ایک ہنرمند مادام تھی۔ کاروباری سمجھ بوجھ والی' موقع سے فائدہ اٹھانے والی۔ کلب میں سنجا کی آمد نے مجھے بوکھلا دیا تھا لیکن اپنی واپسی تک' میرے ذہن سے سب کچھ محو ہو چکا تھا۔ دو ماہ کے وقفے کے بعد' ایک بار پھر میں اپنے کام پر آ گئی تھی۔ میں خواتین کے کمرے میں گئی اور تھوڑا بہت میک اپ کر کے اپنے چہرے پر تازگی لائی۔ کچھ عرصے سے میں نے میک اپ کرنا چھوڑ رکھا تھا۔ ذہنی پراگندگی کے اثرات چہرے پر نمایاں تھے۔ کافی خستگی چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ان دنوں میں جینز ہی پہنے پھرتی رہی تھی لیکن اس وقت میں روایتی مقامی لباس پہنے خاصی مختلف اور تر و تازہ عورت لگ رہی تھی۔

کلب کے عین درمیان' ایک میز پر میں ابھی بیٹھی ہی تھی کہ ایک سنہری بالوں والا امریکی' بھورے تلوں سے بھرا چہرہ لیے............ میرے پاس آ دھمکا۔ نہ جانے کیوں میرے رخسار حدت سے دہکنے لگے۔ ایک لمحے کو لگا جیسے اوورٹن میرے پاس آ گیا ہے مگر سنہرے بالوں کے علاوہ وہ اوورٹن سے قطعی غیر مشابہ تھا۔

بھورے تلوں سے بھرے چہرے والا آدمی خاموشی سے میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ بولا کچھ بھی نہیں۔ بس موسیقی کی لے پر لوگوں کو رقص کرتے دیکھتا رہا۔ اکتاہٹ کے مارے مجھے جمائیاں آنے لگیں۔ اس کا چہرہ بدصورت تھا مگر اس میں ایک جاذبیت بھی تھی۔ جب بھی میں سگریٹ نکالتی' وہ جھپٹ کر اسے سلگانے میں میری مدد کرتا اور پھر اسی طرح بے حس و حرکت ہو جاتا۔ شاید کوئی پرزہ ڈھیلا تھا اس کا۔

میں کیا کرتی' دھوئیں کے مرغولے بناتی' خلا میں' انجانی چیزوں کو تکتی رہی۔ اچانک مجھے ایک اور سنہری بالوں والا آدمی نظر آیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے اپنا گلاس فزیکل کے آگے کیا اور اسے بیئر ڈالنے کو کہا' اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے میرا گلاس بھرنا شروع کر دیا۔ بے خیالی میں وہ اتنا بھر گیا کہ ایک طرف سے میز پر گرنے لگا۔ اس نے ہاتھ روکا تو میں نے

میز پر گری ہوئی بیئر کو فوم کے ٹکڑے سے خشک کر دیا۔ اس نے اسی اثنا میں اپنا گلاس بھر لیا۔ ہم نے گلاس باہم ٹکرائے ''براوو'' پھر میں نے اپنا سر پیچھے کو کر لیا اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے بے پناہ نشے میں ہوں۔ اسی لمحے کسی توانا آدمی کے لمبے چوڑے ہاتھ نے میری کلائی پر اپنی زور دار گرفت کی۔ فزیکل کی آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے اوورٹن پر ایک شوخ مسکراہٹ پھینکی اور اپنا ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ مجھے نظر انداز کئے ہوئے فزیکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

''سنو دوست' میری طرح تمہارے بھی سنہرے بال ہیں۔ یہ خاتون سنہرے بالوں والے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ ان کا محبوب بھی سنہرے بالوں والا ہے' اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنی خاتون کو یہاں سے لے جاؤں''۔

''میری خاتون!'' میں غصے میں پھنکاری' اوورٹن میری کلائی پکڑے مجھے وہاں سے اٹھا کر لے گیا۔ اس طرح پھر میں اسی خبیث بلے بوائے کے ساتھ رہنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ساری برانگیختگی کے باوجود میں اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی' چاہے وہ مجھے گلے میں رسی ڈال کر ہی کیوں نہ لے جاتا۔ سچ کہوں تو میں اسے پسند کرتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ جو چاہتا کرتا پھرتا تھا' مگر اس کے باوجود وہ خوش مزاج آدمی تھا اور اس میں اتنی مردانگی بھی تھی کہ مجھے جب چاہتا میری کلائی پکڑ کر جہاں چاہتا لے جاتا' اس کی رنگ رلیوں پر میں چیختی چلاتی ضرور تھی مگر میں کہہ نہیں سکتی کہ اس کے کردار کا یہ رخ مجھے ناپسند تھا۔

پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ نینا نامی کسی لڑکی پر سر کھپا رہا تھا۔ وہ جس عجیب سے انداز میں فرش پر براجمان اس کا ڈانس دیکھنے میں محو تھا' مجھے وہ بری طرح بھا گیا۔ وہ کسی حواس باختہ معصوم سے لڑکے کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے کافی دیر تک اسے پریشان کئے رکھا اور بالآخر اپنے گھر لے آئی۔ یہ تھی میری کامیابی' نینا ہل ٹاپ کلب کی سب سے جاذب نظر لڑکی تھی۔ میں تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ اس کی عقبی سیٹ پر ہی براجمان ہو سکوں۔ اس کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا ''میں نینا کا منتظر ہوں''۔ میں اسے تنگ کرتی رہی اور کہتی رہی۔ اچھا تو وہ تمہاری بوڑھی بیوی' اس کا نام ہے نینا' غرض اس طرح کی چٹکیاں لےلیکر میں اس کے حواس پر چھا گئی۔ پھر ہوا یوں کہ ایک زوردار قہقہہ اس کے منہ سے نکلا اور ساتھ ہی یہ الفاظ بھی ''تو پھر کیا تم ہو میری بوڑھی بیوی؟''

ہم پھر سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ اوورٹن خاصا وفا شعار دکھائی دیتا تھا۔ وہ کام سے سیدھا گھر آتا تو روزمرہ کے استعمال کی اشیاء سے لدا پھندا ہوتا۔ کسی سے ملنے باہر جانے کیلئے بہانے بازی کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ میرا خیال ہے وقتی طور پر اس نے اپنی رنگ رلیاں چھوڑ دی تھیں۔

جن دنوں وہ قبرستان کی شفٹ میں کام کر رہا ہوتا تو مجھے اپنے کام کی جگہ پر فون کرنے کیلئے کہتا' اس کے لہجے میں بے پناہ بچپنا ہوتا۔ سو میں ہی ہار مان لیتی۔ وہ ہمیشہ خوش نظر آتا۔ میں فون پر بھی اس کے میز پر تھرکتی انگلیوں کو ڈرم کی طرح بجانے کی مشق اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔ اس کا سوال یہ ہوتا تھا: کسی نے گھر آتے ہوئے تمہارا پیچھا تو نہیں کیا؟ کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟

دوبارہ اکٹھے ہونے کے بعد یہ ساتویں دن کا واقعہ ہے۔ اوورٹن کو کام پر بھیج کر میں لیٹی ہی تھی کہ برابر والی پڑوسن ایچا نے مجھے آواز دی' ''سو تو نہیں رہیں؟'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئی۔ '' کچھ سنا میرا کے بارے میں؟ وہ مرگئی۔''

میں بری طرح پزل ہوگئی۔

''وہ کبھی کبھار چین ہوئی سے ملنے آیا کرتی تھی۔ کیا روشن اور متبسم چہرہ تھا اس کا! یاد ہے نا؟''

''وہی لمبی سی لڑکی؟ خانہ بدوشوں کی طرح کھلے ڈلے کپڑے پہنتی تھی۔ یہ لباس اسے اچھا لگتا تھا۔ خاصی دلکش اور جاذب نظر تھی۔ اچانک وہ موت کے منہ میں کیسے چلی گئی؟''

''کل صبح کسی کوریائی نے اسے مار ڈالا' کوئی دلال تھا شاید' اس نے اس کی ٹانگوں کے درمیان کوئلے کا چمٹا پھنسا دیا تھا۔ یہ کوریائی بھی بڑے خبیث ہوتے ہیں!'' ایچا نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ میں نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ خودکشیاں اور قتل ہمارے اردگرد ہوتے ہی رہتے ہیں' چنانچہ وہ ہمارے ذہنوں پر بری طرح اثر انداز نہیں ہوتے' لیکن یہ اتنا سفاکانہ واقعہ تھا کہ میرا دل رونے لگا۔ میرا میری واقف تھی۔ میں کچھ دیر خاموش رہی۔ ایچا نے پھر بات شروع کی لیکن مجھ سے بات ہو نہیں پائی۔

''وہ کتے کا بچہ پکڑا ہی جائے گا۔ آخر کہاں تک بھاگے گا؟ وہ تائی یونگ سینما سے ٹکٹیں لیتا رہتا ہے۔ منشیات اور لڑائی بھڑائی کے چکر میں دو دفعہ اسے سزا ہوچکی ہے۔ وہ پچھلے دو سالوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میرا خیال ہے سبھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر جب معاملہ عشق کا آجائے تو پھر آدمی کسی کی بھی سننا پسند نہیں کرتا۔ سبھی لڑکیوں کو پتہ ہے

ان دلالوں کی فطرت کا' لیکن وہ ان سے بھاگ بھی نہیں سکتیں۔''

''یقیناً وہ تنہائی کا شکار ہوگی' تم لوگ ان غیرملکیوں سے اچھی طرح بات چیت بھی تو نہیں کرسکتیں۔'' ایجا نے میری طرف یوں نظر اٹھائی جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

میری جوتی سے! میں نے دل ہی دل میں کہا' کیا میں تنہائی محسوس نہیں کرتی؟ یقیناً ایسا ہے مگر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتی نہیں پھرتی۔

ایجا دوبارہ' اپنی دکھ بھری کہانی سنانے کو تیار تھی۔ جتنی دفعہ وہ کھاتی' اتنے ہی نئے رنگ وہ اپنی کہانی کو دیتی جاتی' اب وہ کہانی کی ایک اور سچائی بتانے جا رہی تھی۔

''ہماری تنہائیوں کو کون سمجھ سکتا ہے؟ یہ حرامی تو صرف ہمیں استعمال کرنا جانتے ہیں۔ ہاستی کی ایک ہم جماعت ہے' لڑکیوں کے مڈل سکول میں پڑھاتی ہے' وہ اسے ملنے یہاں آتی رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ ہاستی سے امریکہ کی بنی ہوئی کسی نہ کسی شے کی فرمائش کرتی ہے۔ ہاستی کی جگہ میں ہوتی تو اس کتیا کے بال پکڑ کر' اس کی کمر پر زوردار کک مارتی اور وہ گھر سے باہر جا پڑتی۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ بعض لڑکیوں کو ان کے اپنے گھر والے صرف پیسے کے لالچ میں' بری طرح نچوڑ رہے ہیں۔ یہ لڑکیاں اپنے لباس پر بنی کروشیا کاری کو ادھیڑ کر دوسروں کو سکھانے کیلئے استعمال کرتی ہیں اور اس طرح جو کچھ کماتی ہیں وہ سیدھے ان کے گھر والوں کے پاس چلے جاتے ہیں' اگر وہ اپنی لڑکیوں پر ترس کھانا شروع کردیں تو کھانے کیلئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوگا سوائے ترس کے۔ گھر والے' دوست احباب یا کچھ بھی' یہ سب محض دردسری ہے اور کچھ بھی نہیں''۔

تین دن بعد پتہ چلا کہ قاتل پکڑ لیا گیا ہے۔ چن ہوئی نے جو میرا کے خاصی قریب تھی اور اس روز وہ اس کے گھر بھی گئی تھی' یہ ساری خبریں ہم تک پہنچائیں۔ قاتل نے فوراً ہی اعتراف جرم کرلیا' اس کا کہنا تھا کہ میرا نے اس سے بے وفائی کی تھی۔

''وہ زیادہ تر امریکیوں کے ساتھ رہتی تھی اور باسی تباسی محبت اس کا نصیب ہوتی تھی' پیسے اور غیرملکیوں کے کپڑے بھی وہ اسے دیتی رہتی تھی لیکن وہ بھی پھٹے پرانے ہوتے۔ غرض' اس کتیا نے جو کچھ بھی اس کے حوالے کیا وہ غیرملکیوں کا جھوٹا اور بچا کچا ہوتا تھا۔ یہ تھا اس کا پولیس کے سامنے بیان۔'' چن ہوئی نے کہا:

''خبیث' کتیا کا بچہ'' ایجا نے کہا'' وہ صرف ایک دلال ہے' جس نے ایک کمزور سی لڑکی

کے بارے میں اپنی بے ہودہ منہ ماری کی ہے۔ کیا وہ اکیلا ہی بچا کھچا اور جھوٹا کھاتا رہا ہے۔ یہ سارا ملک ہی دوسروں کے بچے کھچے اور جھوٹے مال پر پل رہا ہے''۔

''اس نے جو کچھ کیا وہ یقیناً قابل نفرت تھا' مگر اسے اپنی اس حرکت پر فخر تھا''۔ میں نے بلاوجہ ہی اپنی رائے دی۔ حقیقت میں قاتل کے ریمارکس نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایجا درست کہہ رہی تھی۔ میری ماں نے بھی کچھ ایسی ہی بات مجھ سے کہی تھی۔ امریکہ کے فوجی قبضے کے دور میں' میں بچی تھی۔ بدیسی امداد میں آنے والی ایک سخت کینڈی' میں بہت پسند کرتی تھی' سو اسے چوستے چوستے میری زبان لال گلال ہو جاتی۔ ماں میرے منہ سے وہ کینڈی نکال کر پھینک دیا کرتی تھیں۔ وہ غصے میں پاگل ہو جاتیں اور کہتیں: کیا یہ چھوٹی چھوٹی میٹھی چیزیں تمہارا پیٹ بھر سکتی ہیں؟ اب سمجھ آتا ہے دراصل ہماری غربت انہیں چراغ پا کرتی تھی۔

بچپن میں ہم پانچ بہن بھائیوں کو ایک ہی گدے پر سونا ہوتا تھا' سو تھوڑی سی جگہ لینے کیلئے رات بھر ہماری دھینگا مشتی جاری رہتی۔ امدادی سامان کے بچے کھچے پر گزارہ کرتے کرتے میں جوان ہو گئی۔ سکول میں ہمیں مکئی کی روٹی ملا کرتی تھی' مگر میں سکول جانے سے بہت پہلے سے مکئی کی روٹی کھا رہی تھی۔ گھر میں کھانے کو تو کچھ ہوتا نہیں تھا' سو میں لنچ کے وقت اپنی بہن کے سکول چلی جاتی۔ کسٹوڈین کے کمرے کے برابر میں کچن تھا' وہاں مکئی کی زرد روٹیاں پکائی جاتیں۔ اچھا خاصا انبار لگ جاتا تھا روٹیوں کا' کسٹوڈین کی بیوی بڑی فراخ دل عورت تھی۔ وہ نہ صرف مجھے اندر آنے دیتی بلکہ روٹیاں چکھتے دیکھ کر نظر بھی چرا لیا کرتی۔

انگریزی کے بارے میں مجھے قطعی کوئی احساس کمتری نہیں۔ کم از کم یہاں فوجی علاقے میں میری انگریزی کسی بھی آدمی سے بہتر ہے۔ مجھے مڈل سکول سے ہی یہ زبان سیکھنے کا شوق تھا۔ دوسرے مضمونوں میں مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی' مگر انگریزی میں اپنی صلاحیتوں پر مجھے فخر تھا۔ ممکن ہے۔ احساس غربت کو کچلنے کا اور خود کو نمایاں کرنے کا' یہی طریقہ آیا ہو میرے ذہن میں۔ گھر کے قریب موجود چرچ کے پاس سے گزرتے ہوئے بعض اوقات میں امریکی مشنریوں کو دیکھا کرتی۔ سفید فارم چہرے اپنے ہاتھوں میں بائبل تھامے دکھائی دیتے تو عجیب سے امن اور سکون کا احساس ہوتا۔ انگریزی میرے نزدیک امن اور دولت کی علامت تھی۔

میں مڈل سکول کے ایک ہم جماعت کے ساتھ بھاگ گئی' جو امریکی آرمی بیس میں کام کرتا تھا یہ دس سال پہلے کی بات ہے' جب میں نے گھر چھوڑا تھا۔ میں گیارہویں گریڈ میں تھی اس

وقت۔ کچھ مہینے بعد مجھے پہلی دفعہ ایک امریکی نے کچھ رقم دی' اس لمحے مجھے مکئی کی روٹی یاد آ گئی' جو میں بچپن میں بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ میرے ذہن میں ہلکا سا احساس ابھرا۔ یہ تو میں وہیں آ گئی جہاں سے چلی تھی اور ساتھ ہی عجیب سی شرمندگی بھی ہوئی' خود اپنے آپ سے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ جس دن چن ہوئی نے سنجا کا مسئلہ سنبھالا' اسی دن اس نے میرا کے قتل کے بارے میں مجھے بتایا۔ یہ کوئی بہت حیران کن بات بھی نہیں' کیونکہ فوجی علاقے کی محدود سی دنیا ہے۔ جب ہم میرا اور اس کے دہشت ناک قتل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے چن ہوئی نے میرا کے ساتھ رہنے والی لڑکیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔

''چار لڑکیاں تھیں وہ' ان میں سے سنجا نامی ایک لڑکی آج وہاں سے جا رہی ہے' سنا ہے وہ میرا کی موت پر بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مزید یہاں رہ نہیں سکتی' برابر کے کمرے سے میرا کے قہقہوں کی آواز اسے اب بھی سنائی دیتی ہے۔ خاصی عمر کی لگتی ہے۔ ارے ہاں'' اس نے مجھ سے پوچھا ''تم تو اسے جانتی ہو؟''

''کسے؟'' اردگرد کے ماحول میں نہ جانے کتنی عورتیں سنجا نامی پھر رہی ہوں گی۔ دراصل جس سنجا سے میری بندر گھر میں ملاقات ہوئی تھی وہ کہیں میری یادداشت کے دور دراز کونے میں محو ہو چکی تھی' لاتعلقی میری فطرت کا حصہ ہے' چنانچہ جب چن ہوئی نے ہم جنس عورتوں کا ذکر کرنا شروع کیا تو میں بھی اور عورتوں کی طرح حیران ہو رہی تھی۔

''سنجا ہم جنس پرست لگتی ہے۔ طبعاً خوش مزاج ہے لیکن ایک بات کھٹکتی ہے' چند روز پہلے تک ایک کالی عورت سنجا کے کمرے کے بہت چکر لگاتی تھی۔ وہ کسی ایمرجنسی ٹریننگ کیلئے کوریا آئی تھی لیکن اب وہ ایک دوسرے میں اتنی مگن ہیں کہ کچھ اور انہیں سوجھتا ہی نہیں۔ وہ کالی عورت بھی تمہیں یاد نہیں؟''

''میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں' وہ باربرا ہے''۔ میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ چن ہوئی اور ایجا میرے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہنے کی وجہ سے میرے اور باربرا کے تجربے سے اچھی طرح واقف تھیں۔

''شاید ہی سنجا نے اپنی ہم جولیوں کو باربرا کے بارے میں کچھ بتایا ہو''۔ چن ہوئی بولتی رہی۔ ''وہ صرف اتنا ظاہر کرتی ہے جتنا ظاہر کرنا وہ مناسب سمجھتی ہے۔ باربرا کے جاپان جانے سے پہلے وہ دونوں سیول کے ڈیپارٹمنٹل سٹور سے خاصی چیزیں خرید کر لائی تھیں۔ ایک ایک

چیز نسوانی نقطہ نگاہ سے خریدی گئی تھی۔ یوں سمجھ لو ہر شے سنجا کیلئے تھی۔ سنجا خود بھی حیرت زدہ تھی' ان کے علاوہ باربرا نے اسے دو سو ڈالر مہینے بھر کے خرچے کیلئے علیحدہ دیئے۔'' چن ہوئی نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر ہلایا۔''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ باربرا کی ان مہربانیوں کی اصل وجہ کیا ہے۔ افسوس! تم نے ایک شاندار موقع ضائع کر دیا''۔

وہ مذاقاً کہہ رہی تھی لیکن میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا ''وہ راستہ میرا تھا ہی نہیں۔ میں جب چاہوں کسی بھی سونے کی کان پر قبضہ کر سکتی ہوں''۔

میں اس کی وضاحت شاید نہ کر سکوں' مگر اس لمحے سے سنجا کے اس معاملے نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ آن کی بیوی سے بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں صرف یہ تھا کہ وہ سنجا کو باربرا سے ملا دے گی' کیونکہ یہ سنجا کی خواہش تھی۔ اب معلوم ہوا کہ سب کچھ سنجا کی خواہش کے مطابق ہوتا چلا گیا تھا۔ اس سے مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے ذرا بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے صورتحال کو اپنے حق میں کر لے گی۔

آن کی بیوی سنجا اور باربرا کے تعلقات کی نوعیت کافی پہلے سمجھ چکی تھی۔ میں نے سنجا کے بارے میں اس سے پوچھنا چاہا تو وہ فوراً بول پڑی ''تمہیں پتہ نہیں وہ ہمارے کلب میں اکثر آتی رہی ہے''۔

''ہل ٹاپ کلب میں'' اس کے بعد میں نے مزید استعجاب کا اظہار نہیں کیا۔ آن کی بیوی کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ یہ انگوٹھی پہلے میں نے کبھی اس کے ہاتھ میں نہیں دیکھی تھی۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ دونوں میرے پاس سے جا چکی تھیں۔

میں چھ بجے کے قریب گھر سے نکلی' میں نے ہیریسن کیلئے تحفہ خریدنا تھا' ظاہر ہے اس کیلئے بھی وقت درکار تھا۔ وہ فائر بریگیڈ کے کارکنوں میں سے تھا اور اس کی سالگرہ ہل ٹاپ کلب میں ہو رہی تھی' ہم سب لوگوں کی جانب سے۔ اتفاقاً میں راستے میں پڑنے والی ایک لوک موسیقی کی دکان میں گھس گئی۔ وہاں مجھے ایک روایتی کوریائی بانسری پسند آئی اور میں نے ہیریسن کے لیے فوراً ہی اسے پسند کر لیا اور خرید بھی لیا۔ کسی غیر ملکی کو دینے کیلئے یہ اچھا تحفہ تھا۔

اوورٹن سے سات بجے مجھے کلب میں ملنا تھا۔ گھر واپس جاتی تو ممکن ہے کوئی ان دیکھا مسئلہ سامنے آ جاتا' سو میں وہاں سے سیدھی کلب چل دی۔ وقت چھ سے کچھ زیادہ ہی رہا ہوگا لیکن اس وقت تک ان غیر ملکیوں میں سے کسی کی شکل نظر نہیں آئی تھی' البتہ اندرونی دروازے

کے قریب کچھ لڑکیاں براجمان تھیں۔ میں میز کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ایک بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''تم جو چاہو کہہ سکتی ہو' مگر میرا ہم سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ وہ اپنی پوری چاہت نہ کسی کوریائی کو دے سکی اور نہ ہی کسی امریکی فوجی کو' کوئی کوریائی اسے اٹھا کر لے گیا۔ شاید وہ اسی قابل تھی اور پھر وہ موت کا شکار ہوگئی اور مرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو انتہائی سفاکانہ تھا''۔

''مرنا ہی ٹھہرا تو آدمی جیسے بھی مر جائے' کیا فرق پڑتا ہے؟'' ایک اور لڑکی نے کہا۔

''لیکن یہ صرف میرا کی کہانی ہی نہیں۔ ہمیں کوریائی مرد قبول کرتے ہیں نہ امریکی' ہم ڈالروں کی خاطر اپنی قربانی دیتے ہیں اور پھر غیر ملکیوں ہی کیلئے رہ جاتے ہیں۔ تالاب سے باہر کسی مچھلی کی طرح اپنائیت اور اپنے ماحول کیلئے تڑپتے رہتے ہیں۔ زندگی واقعی بہت دشوار ہے مگر عین نوجوانی میں موت کو گلے لگانا بھی کوئی اچھی بات نہیں''۔ کسی اور نے اپنی رائے دی۔

میں جس طرف بھی گئی' میرا کا موضوع ہی زیر بحث تھا۔ اس کی ذات کے مختلف پہلو تھے اور عورتوں کی باتیں تھیں۔ اگلی میز پر سنجا بیٹھی سگریٹ پہ سگریٹ پیے جا رہی تھی۔ سیاہ لباس پہنے دونوں طرف کی چٹیا بنائے وہ مغموم نظر آ رہی تھی لیکن انتہائی عجیب بات یہ تھی کہ اس کے چہرے سے زندگی کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پھر وہی بھرائی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم بیدار ہوں۔ ہم اپنے دل' اپنی خواہشات اور اپنی رقم' ان خبیث کوریائی مردوں کیلئے کیوں قربان کریں؟ کیا اچھائی ہے ان میں؟ غیر ملکی تمہاری طرف پشت کرتے ہیں تو برف کی طرح سرد ہوتے ہیں لیکن اگر وہ تمہیں پسند کرلیں تو ازدواجی رشتہ بھی قائم کر لیتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ عورتوں کا خیال کرتے ہیں۔ کیا تم کسی کوریائی کے بارے میں بھی سوچ سکتی ہو جو ہم سے شادی کرنے پر تیار ہو؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ جذبات اور سوچ ہمیشہ اکٹھے چل نہیں پاتے۔ ایک اور لڑکی چونگ سن نے رائے دی۔

''میں دلالوں کے پنجوں میں پھڑ پھڑاتی لڑکیوں کو دیکھ کر بہت دکھی ہوتی ہوں لیکن میں ان کی مجبوری سمجھ سکتی ہوں۔ ذرا ایمانداری سے سوچو کیا ہم میں سے کوئی لڑکی ایسی بھی ہے جسے کسی کوریائی مرد کے ساتھ زندگی گزارنا ناپسند ہو؟ کم سے کم یہ اچھائی تو ہوگی کہ ہم کسی مرد سے' اسے اپنا دوست جان کر' اپنا سب کچھ کہہ سن سکیں۔ میری تو خواہش ہے کہ کوئی ایسا آدمی ہو جسے

میں مہینے میں ایک بار مل سکوں۔ اس کے ساتھ گھوموں' پھروں اور باتیں کروں۔ میری تو محسوسات کچھ ایسی ہی ہیں۔''

چونگ سن' جس وقت اپنے منفرد' کھردرے مگر نپے تلے انداز میں بات کر رہی تھی تو اردگرد مکمل خاموشی چھا گئی۔ سب اس بھرائی ہوئی آواز والی چونگ سن کی گفتگو سن رہے تھے۔ دونوں ہی اپنی جگہ صحیح تھیں۔ میں بیٹھنے ہی لگی تھی کہ میں نے دروازے سے ایک آدمی کو اندر آتے دیکھا۔ وہ چھوٹے قد اور معمولی خدوخال کا حامل کوئی کوریائی نوجوان تھا۔ وہ آگے بڑھتا چلا آیا اور پھر کلب کے عین درمیان ایک میز کی طرف بڑھا۔ ہم سب کی نگاہیں اس کی جانب متوجہ تھیں' ہماری طرف اس کی نظریں بھی اٹھیں مگر وہ گھبرایا نہیں۔

''یہ تو کوریائی ہے کوئی' ہے نا؟''

''کوئی خبطی لگتا ہے' اسے بھلا یہاں کیا کام آن پڑا؟''

فوجی علاقے کے کلبوں میں کوریائی شہریوں کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کلب کے معمولات چونکہ ابھی شروع نہیں ہوئے تھے اس لئے محافظ کہیں ادھر ادھر مصروف تھے' چنانچہ وہ بے روک ٹوک اندر چلا آیا۔ اس نے اشارے سے ویٹریس کو بلایا۔ وہ گھبرائی' چکرائی اس کے پاس گئی اور اس کا آرڈر لیا۔ لمحے بھر میں بیئر کی بوتل اس کی میز پر پہنچ چکی تھی۔ وہ ہماری چبھتی نظروں کو نظرانداز کر کے اپنا گلاس بھرنے لگا۔ کیل مہاسوں سے بھرے چہرے والی ایک لڑکی سب سے پہلے اس کے پاس پہنچی' یہ وہی لڑکی تھی جو بھرائی ہوئی آواز میں باتیں کر رہی تھی۔ پس منظر میں دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ لڑکی اپنے کولہے پر ہاتھ رکھے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''اے تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

اس آدمی نے بڑی بے اعتنائی سے نگاہ اوپر اٹھائی' پلکیں جھپکائیں اور بیئر کا بڑا سا گھونٹ لیکر گلاس نیچے رکھ دیا۔ وہ ذرا بھی بے سکون یا بے چین نہیں ہوا۔ چونگ سن اور ایک دوسری لڑکی بھی اس کے نزدیک آ گئیں۔ چونگ سن ذرا مصنوعی لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی ''ذرا دیکھو تو کتنے پرسکون اور خود اعتماد لگ رہے ہو' اکیلے بیٹھ کر پینے سے بہتر نہیں کہ ہم مل جل کر پئیں' کیوں مسٹر پتھر دل؟''

یہ کوریائی آدمی یہاں کیا کر رہا ہے؟'' دوسری لڑکی شروع ہو گئی'' کلب سے باہر جا کر تو تم ہمیں انسان سمجھنے سے ہی انکار کر دیتے ہو''۔

پھر مجھے ایک اونچی اور تلملاتی آواز سنائی دی۔ ''وہ رہا دروازہ دفع ہوجاؤ یہاں سے!'' میں نے نگاہ اوپر اٹھائی' کسی بھی دخل اندازی سے پہلے سنجا اس آدمی کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اپنے سیاہ بالوں اور سیاہ لباس کے ساتھ' وہ کوئی جادوگرنی لگ رہی تھی۔ ''دفع بھی ہوجاؤ'' وہ دوبارہ چیخی۔اس کی انگلی دروازے کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

باقی لڑکیاں بھی اس کے اردگرد اکٹھی ہوگئیں اور باری باری اس آدمی سے چھیڑخانی کرنے لگیں' مگر وہ مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح ساکن بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے بیئر کی بوتل ختم کرڈالی' ساتھ ہی وہ میز سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سنجا ابھی تک اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے لاتعلقی سے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے مڑتے ہی زبردست قہقہہ پڑا۔ آدمی میرے پاس سے گزر رہا تھا تو میرے کانوں میں اس کے صرف یہ الفاظ پڑے ''حرامی کتیائیں'' وہ اپنے انداز میں ہم طوائفوں کو اعزاز بخش رہا تھا' اگر دیکھا جائے تو امریکی فوجیوں کا یہ علاقہ امریکہ اور کوریا کے درمیان ایک جزیرہ سا لگتا ہے۔ جزیرہ تو جزیرہ ہی ہوتا ہے' نہ سمندر کا حصہ اور نہ ہی اصلی زمین کا اور ہم یعنی طوائفیں اس جزیرے کی باسی' صرف مغربی باشندوں کیلئے مخصوص ہیں۔ مادر وطن کے ہاتھوں نظرانداز ہم عورتیں ان غیرملکیوں کیلئے عارضی محبوبائیں اور بے نام 'مہنی'' ہوتی ہیں۔

کوریا میں متعین ہونے کے ناطے ان امریکیوں کا کہنا ہے کہ فرض کے بجائے یہ ان کا حق ہے کہ ان کے فوجی بیس کے اردگرد موجود جزیرہ قطعی کوریائی شکل کا نظر نہ آئے اور جب سیاسی گرداب کی خوفناک لہر' ان کے فوجی دستوں کی واپسی' ہمارے سروں پر سے گزرتی ہے تو یہ پورا جزیرہ لمحوں میں اجاڑ اور ویران ہوجاتا ہے۔ انچان میں' جہاں میں سب سے پہلے وارد ہوئی تھی' یہی کچھ تو ہوا تھا۔ کیمپ قیصر نمبرون سے امریکی فوجیوں کا انخلا ہوا اور راتھوں رات انچان کھنڈر بن گیا۔ ''علاقہ ممنوعہ'' کے نشانات جزیرے کے اردگرد جابجا لگے ہوتے تھے۔ کلب کے دروازوں پر بھی ایکس (X) کی علامت بڑی واضح نظر آتی تھی اور سینکڑوں لڑکیاں کھلے ادھ کھلے زرد پھولوں کی طرح ادھر ادھر بکھری دکھائی دیتی تھیں۔

ان جزیروں کی کوئی بنیاد تو ہوتی نہیں' چنانچہ ان میں رہائش پذیر لڑکیوں کی بھی کوئی بنیاد یا جڑ نہیں ہوتی۔ انہیں اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ ان جزیروں میں صرف بے اعتباری کی فصل ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے وہ کسی نہ کسی دلال کی خواہش مند ہوتی ہیں یا امریکہ کا یک طرفہ ٹکٹ

ان کا خواب ہوتا ہے۔ میرا اور سنجا اس معاملے میں ذرا زیادہ انتہا پسند ہو گئی تھیں۔

سنجا کا ایک ماضی تھا' وہ اپنی جوانی کے دنوں میں ہی دوسرے گھرانوں میں محنت مزدوری کرتی تھی۔ وہ ایک اچھی گھریلو عورت بننا چاہتی تھی مگر اس کے آجر نے اسے زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیا۔ یہ ایک عمومی کہانی لگتی ہے' مگر اس گھر کے لوگ اس سے جانوروں کا سا سلوک کرتے تھے۔ گھر کا مالک جب چاہتا اس کے کمرے میں گھس آتا اور اپنی ہوس کی آگ بجھاتا۔ اس گھر میں رہتے ہوئے وہ اسی شخص کے دو بچوں کی ماں بن گئی۔ اس آدمی کی بیوی نے سنجا کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے میں اپنے شوہر کی ہر ممکن مدد کی' کیونکہ اس طرح اسے مفت میں ایک کل وقتی کنیز مل گئی تھی۔ سنجا اس کے بچوں کے کپڑے دھوتی' گھر کی صفائی کرتی اور اسی پر بس نہیں بلکہ ان کی رائس مل بھی خود ہی چلاتی۔ دکھ' درد اور تکلیف سے بھرپور زندگی کے ہاتھوں تنگ آ کر ہی اس نے امریکہ فرار ہونے کا وحشیانہ خواب دیکھا تھا۔ مادر وطن سے محبت کا کوئی تصور اس کے پاس بچا ہی نہیں۔ بس یہاں سے نکل جانے کا خواب اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ بالآخر یہی پاگل پن اس کی موت کا باعث بن گیا۔

اس رات' ہل ٹاپ کلب میں میں نے اسے آخری دفعہ دیکھا۔ ایک ڈیڑھ ہفتے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ کلب کی سیڑھیوں سے پھسل کر نیچے گری اور دماغ پر شدید چوٹ آنے کے باعث مر گئی۔ اس کے غریب اور جاہل ماں باپ کو بلا کر سنجا کی فوری سرجری کے بارے میں اجازت لینے کی کوشش کی گئی' مگر وہ بے چارے کسی فیصلے تک پہنچنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ کلب کے مالک آن نے اس کے علاج کیلئے کچھ رقم دی اور پھر لاتعلق ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر وہ بچ بھی جاتی تو اس کی حالت سبزی کے ڈھیر کی سی ہوتی۔ اس لایعنی انداز میں وہ زندہ لوگوں کی یہ دنیا چھوڑ کر اپنے خوابوں میں بسے لازوال امریکہ کے سفر پر روانہ ہو گئی۔

سنجا کی زندگی کے حالات صحیح معنوں میں اس دن پتہ چلے جس دن اس کی موت واقع ہوئی' اس کے ساتھ قیام پذیر لڑکیاں اسے بھی ایک عام سی مطلقہ عورت سمجھتی تھیں' جن غیر انسانی حالات و واقعات سے اس کا سابقہ پڑا وہ سب اس سے قطعی لاعلم تھیں۔ انہیں اس پر گزرے سفاکانہ مظالم کا پتہ چلا تو وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ اس کی ہم جولیوں کو اس کے صرف دو رخ معلوم تھے۔ ایک یہ کہ وہ کس طرح خاموشی سے دیوار کے سہارے بیٹھے ہوئے کروشیا کی مدد سے کشیدہ کاری کرتی تھی اور دوسرے شراب کے نشے میں وہ کیسے دکھائی دیتی تھی۔ کلب کی

ایک لڑکی نے بتایا کہ جب وہ پینا شروع کرتی تو اتنی بری طرح پیتی کہ شراب اس کے کانوں میں سے بہہ نکلتی۔ پھر وہ غیر ملکی فوجیوں کے پاس جا جا کر ان سے درخواست کرتی کہ وہ اسے کچھ اور شراب خرید دیں۔ وہ ان فوجیوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ اسی لڑکی نے بتایا بلکہ شاید وہ ان سے نفرت کرتی تھی۔ ممکن ہے اس رات بھی وہ اتنی ہی مدہوش رہی ہو' جب موت نے اسے آن دبوچا۔ سنجا کی موت کی خبر علاقے میں پھیلی تو غیر ملکی فوجیوں نے کلب آنا چھوڑ دیا۔ اس کی موت کا یہ وہ اثر تھا جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں اس کی آخری رسوم میں شریک ہوئی اور خود اپنے ہاتھوں اس کی راکھ بہتے دریا کی نذر کی۔ اس سے پہلے کہ لوگ اس کے چہرے کا تصور اپنے ذہن میں لاتے' اس کی راکھ میری انگلیوں میں سے پھسلتی دریا کے پانیوں میں غائب ہو چکی تھی اور اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں تھا۔ اسی روز سنجا کو جاپان سے ایک خط موصول ہوا ''میں تمہیں بے پناہ چاہتی ہوں' مجھے تمہارے دکھوں کا بھرپور احساس ہے۔ میں یقیناً تمہیں اس شیطانی چکر سے باہر نکال لوں گی۔ ہمارے ملنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھو اور ہاں اپنے مستقبل کیلئے کام کرنا شروع کر دو''۔

خط کے ساتھ باربرا کا ایک فوٹو بھی تھا۔ مسکراتا ہوا چہرہ' سفید موتیوں جیسے شفاف اور ہموار دانت' کسی گہری جھیل جیسی سیاہ آنکھیں' غرض وہ حسن و رعنائی کا ایک مرقع نظر آ رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دیوتاؤں کی اس تراشیدہ مورتی پر سنجا اتنی تیزی سے کس طرح حاوی ہو گئی تھی۔ بہرحال اسے اپنے خوابوں کی سچائی پر پورا یقین تھا اور باربرا کے ساتھ گزارے ہوئے مختصر سے وقت میں وہ یقیناً بہت خوش رہی تھی۔

ہر چیز معمول پر آ گئی' آن کی بوڑھی بیوی البتہ اس کی بدقسمتی کا ذکر گاہے بگاہے کیا کرتی۔ سونے کی انگوٹھی بدستور اس کی انگلی میں موجود تھی۔ کلب کی رونقیں بحال ہو گئیں۔ وقت بڑے بڑے زخموں کے نشان مٹا دیتا ہے۔ سنجا کے مکان کا مالک بھی پرسکون ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سنجا کی موت سے ایک بڑی تباہی ٹل گئی' کیونکہ میرا کی روح سنجا کے ساتھ ہی اس کے گھر سے چلی گئی' اگر وہ دونوں اس کے گھر میں موت کا شکار ہوتیں تو شاید وہ گھر کبھی آباد نہ ہوتا۔

گھر کے بیرونی دروازے پر ''کرائے کیلئے خالی'' کا نوٹس لگا دیا گیا۔ بہار آتے ہی گھر کے در و دیوار گہرے گلابی پھولوں کی بیلوں سے پوری طرح ڈھک گئے۔

اوورٹن کی اپنے وطن واپسی کا وقت بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ اپنی روانگی سے چار دن پہلے

جمعے کے دن وہ اپنے دفتر سے لوٹا تو اس نے مجھ سے اپنا کیمرہ مانگا' اس کا کہنا تھا کہ اسے کسی کی تصویریں اتارنا ہیں۔ میں نے چبھتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور کہا کہ کیمرہ میری کسی دوست کے پاس ہے۔ یہ صاف جھوٹ تھا۔ میرا جھوٹ بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں لڑے جھگڑے بغیر اسے کیمرہ دینا نہیں چاہتی تھی۔

اوورٹن نے اپنا سر ہلایا۔ ''چھوڑو بھی' ایسی باتیں نہ کرو' میں نے کسی سے وعدہ کیا ہے''۔

''رات کو کیمرہ لیکر گھر سے باہر جانے والے صرف ننگی تصویریں لیا کرتے ہیں۔ تمہارے بھی یہی ارادے ہیں؟''

''کیا ہو جاتا ہے تمہیں؟'' اوورٹن نے کہا

''پہلے سے بتا دیا ہوتا مجھے' آج جمعے کی رات ہے اور میری دوست کہیں گئی ہوئی ہے''۔

''لعنت ہے!'' اچانک اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ میں بیڈ کے کونے پر بیٹھی اپنے لئے شیمپین کا ایک اور گلاس نکالنا چاہ رہی تھی' وہ تیزی سے میری جانب بڑھا۔ اس کا منہ سختی سے بند تھا اور آنکھیں غصے سے ابل رہی تھیں۔ میں اسے قریب آتے دیکھ کر سرہانے کی طرف کھسک گئی' اس کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ ''میں پھر کہتا ہوں کیمرہ دے دو مجھے''۔

''بتایا تو ہے کہ کیمرہ میرے پاس نہیں۔ وہ پان شاپ میں ہے۔ مجھے کچھ رقم دو' اگر تم اسے واپس منگوانا چاہتے ہو''۔

وہ مجھے پکڑنے کو آگے بڑھا تو میں نے غیر ارادی طور پر ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل اس پر دے ماری' وہ جھک کر بچا تو بوتل سیدھی ڈریسنگ کے شیشے سے جا ٹکرائی اور شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے پیچھے فرش پر پھیل گیا۔ میرے ادھر ادھر ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر سوار ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے میرے بال بری طرح جکڑ لئے اور دوسرے ہاتھ سے میری گردن دبانے لگا۔ میں نے پاؤں چلانے چاہے تو اس نے اپنے گھٹنوں سے انہیں بھی دبا لیا۔ میں بالکل بے بس ہو چکی تھی۔

''کتیا کا بچہ!'' میرے منہ سے گالی نکلی تو اس نے بری طرح مجھے مارنا شروع کر دیا۔ ستارے میری آنکھوں میں ناچنے لگے۔ مجھے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ میرے جسم کے اندر نہ جانے کہاں کہاں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ میرا جسم لرزتے دیکھ کر اس کے ہاتھ ذرا ڈھیلے پڑے۔ میں نے فوراً ہی اس کے ہاتھ پر اپنے دانت گاڑ دیئے' وہ چیخا اور مجھ سے علیحدہ ہو گیا۔

میں اچھلی اور اس کے اوپر سے چھلانگ لگاتی بستر کے نیچے چلی گئی۔ شیشے کی کرچیاں میرے گرد بکھری ہوئی تھیں' میں نے دروازے کو ٹھوکر مار کر کھولنا چاہا تو بوتل کا ایک ٹکڑا میری ٹانگ سے ٹکرایا اور دور جا گرا۔ بڑی مشکل سے میں نے دروازہ کھولا اور گھر سے باہر نکل آئی۔

قریبی تھانے کی طرف جاتے ہوئے مجھے اپنے گھٹنے کے پاس کوئی چیز غائب محسوس ہوئی' میں نے لمحے بھر کو رک کر دیکھا۔ میری جینز کا دایاں گھٹنا پھٹا ہوا تھا اور وہاں اچھا خاص گھاؤ آ گیا تھا۔ تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلے آئینہ دیکھا' میری گردن پہلے ہی بدرنگ ہو چکی تھی۔ چوٹ کے سینکڑوں نشان وہاں موجود تھے' میں نے ایک ایم پی کو یہ سارے نشانات دکھائے۔

''ذرا دیکھو تو' یہ سارے نشان تمہارے ایک خبیث سپاہی نے مجھے مار مار کر لگائے ہیں' میں اس کے خلاف پرچہ درج کرانا چاہتی ہوں''۔

ایم پی نے میرا اچھی طرح معائنہ کیا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کہنے لگا ''اگر اس نے کوئی خطرناک ہتھیار تم پر اٹھایا ہے تو تم ہرجانے کا دعویٰ کر سکتی ہو لیکن یہ نشانات تو جلد ہی مندمل ہو جائیں گے۔ تم کچھ بھی ثابت نہیں کر پاؤ گی''۔

''تم اسے جیل میں نہیں ڈال سکتے؟''

''اگر تم اس کے خلاف پرچہ کٹواؤ گی تو اسے ملک سے نکال دیا جائے گا اور بس۔

ایم پی کے چہرے پر بدستور ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ سو میں نے ہر چیز پر لعنت بھیجی اور واپس چل دی۔ وہاں سے میں سیدھی چونگ سن کے پاس پہنچ گئی' اس کے گھر کے باہر ہی اوورٹن کھڑا تھا۔ میں جب بھی جھگڑتی تو چونگ سن کے گھر جا کر چھپ جاتی۔ اوورٹن کو اس حقیقت کا علم تھا' اسی لئے وہ وہاں میرا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے چیخنا' چلانا شروع کر دیا۔ میں نے پرچہ درج کرا دیا ہے۔ تمہیں جیل جانا پڑے گا۔ دیکھنا جیل میں تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے' طبیعت صاف ہو جائے گی۔

''تمہیں علم ہے' میں واقعی تمہیں پسند کرتا ہوں' میں نے تمہیں کبھی بھی طوائف نہیں سمجھا لیکن تم بالکل کاروباری ہو گئی تھیں' کیمرے کے متعلق مجھ سے جھوٹ بولے جا رہی تھیں۔ مجھے شدید بے وفائی کا احساس ہوا لیکن ٹھیک ہے اب تمہیں کیمرہ واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یوں لگا جیسے وہ کسی بھی لمحے رو پڑے گا' اس کے چہرے سے تھکاوٹ اور کسل مندی جھلک رہی تھی۔ میں ہنس پڑی' میں پچھلے کچھ دنوں سے بلاوجہ ہی اس سے لڑ جھگڑ رہی تھی۔ آج

کی لڑائی بھی اسی نوعیت کی تھی۔ ممکن ہے میں یہ سب اس لئے کر رہی ہوں کہ ہماری جدائی کا وقت بہت قریب آ گیا تھا۔ شاید میری محبت کے اظہار کا یہی طریقہ تھا۔

روانگی سے ایک روز پہلے اس نے مجھ سے میرا پتہ مانگا تا کہ وہ مجھ سے رابطہ کر سکے۔ اس نے مجھے بتایا کہ شادی کے صرف دو ماہ بعد ہی اسے کوریا آنا پڑ گیا تھا اور بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے کا تجربہ ابھی اسے ہوا ہی نہیں تھا۔ اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی بیوی سے جدا ہو رہا ہے۔ اس نے امریکہ سے خط لکھنے کا وعدہ بھی کیا۔

دبی دبی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس کے خطوط کی قطعی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر وہ مجھے صرف دس ڈالر دے سکے تو میں اپنے خوابوں میں بھی اسے یاد رکھوں گی۔ یہ کہنے کی تو کوئی ضرورت نہیں کہ میں نے اسے اپنا پتہ نہیں دیا۔

اگلے دن جہاز پر سوار ہونے سے ذرا پہلے اوورٹن نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا تا کہ مجھے رقم دے سکے۔ میں کسی آندھی طوفان کی طرح اس کے پاس جا پہنچی۔ اس نے دو سو ڈالر میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا ''اپنی مادام کا سارا قرضہ چکا دینا'' میں نے وحشیانہ انداز میں اسے الوداعی بوسہ دیا۔ مادام کا قرضہ تو میں عرصہ پہلے ادا کر چکی تھی لیکن یہ پیسے خرچ کرنے کیلئے میرے پاس جگہ کی کمی بہرحال نہیں تھی۔

جنگل میں جائے پناہ

کانگ سوکیانگ

ایک بار پھر میری چھوٹی بہن سویانگ گھر سے غائب تھی۔ پچھلی دوراتوں سے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے تک' وہ عموماً اپنے کسی بھی دوست کو گھر پر ہی مدعو کرلیا کرتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ ماں کو گھر سے باہر بھیج دیا کرتی تھی۔ ماں دوست کا ٹیلی فون نمبر ضرور پوچھا کرتی لیکن پھر سویانگ نے سکول چھوڑنے کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد' اس کی پے در پے حرکتوں نے ہمیں ششدر کر کے رکھ دیا۔ جب تک چاہتی' باہر رہتی۔ والد کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود بھی باہر دیر تک رہنے کا کوئی جواز دینے سے صاف انکار کر دیتی۔

سویانگ کے غائب ہو جانے کی خبر نے ہمیں بری طرح لرزا دیا۔ سب سے پہلے' مجھے ہی پتہ چلا اور ایک مہینے پہلے کی رات کے واقعات میرے ذہن میں پھر سے تازہ ہونے لگے۔ سویانگ اس دن اپنے دوسرے سمسٹر کی فیس ادا کرنے گھر سے نکلی تھی۔ ہوا صبح سے ہی بند تھی اور گرمی بدن کو کاٹ کھائے جا رہی تھی۔ گھر والے دن بھر اس کی راہ تکتے رہے اور وہ کوئی گیارہ بجے رات کو واپس لوٹی۔

نچلی منزل میں' سبھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ تیسری بار بیل بجنے کے باوجود کہیں کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔ ہمارا چھوٹا بھائی چنگ اُو' اپنی پڑھائی کی وجہ سے' رات گئے

تک جاگتا رہتا تھا' سو وہی ایسے وقت دروازے کھولنے جایا کرتا تھا لیکن شاید وہ بھی سو گیا۔ میں بڑبڑاتی ہوئی نیچے گئی اور دروازہ کھولنے سے پہلے' سویانگ کو دو چار سنا دیں۔ ظاہر ہے میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ اس دن کام کے دوران میری اپنے دوست سے ہلکی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ گھر آئی تو ماں اور دادی آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔

''کیا کالے لوبیے کے پیچھے پڑی ہو۔ کوئی نہ کوئی میٹھا تو ہوتا ہی ہے کھانے پر۔''

''تمھیں میری صحت کی ذرا پروا نہیں۔'' دادی شکایتاً بولیں۔

''بوڑھے لوگ اگر زیادہ میٹھا کھانا شروع کر دیں تو انہیں شوگر ہو جاتی ہے۔''

ماں نے فوراً جوابی حملہ کیا کہ دادی اپنی صحت کے بارے میں بلاوجہ پریشان ہوتی رہتی ہیں۔ ''اگر آپ الٹی سیدھی سوچوں سے جان چھڑا لیں تو آسانی سے سنچری کر ڈالیں گی۔''

اس بات کا جواب دینے کے بجائے' دادی سویانگ کے بارے میں شروع ہو گئیں۔ ''کم بخت نہ جانے کہاں پھرتی رہتی ہے۔ بلا اجازت' رات گئے تک گھر سے باہر رہتی ہے۔ اچھے گھرانوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔'' ماں پر' دادی کا یہ بالواسطہ حملہ خاصا غیر معقول تھا چنانچہ دونوں خواتین کے درمیان گرما گرمی چلتی رہی۔ طفلانہ چشمک' ان کے درمیان' روزانہ کا معمول تھا۔ لیکن اس رات کھانا گویا میرے سینے پر دھرا ہوا تھا' سو میں کسی بھی طرح سو نہیں پا رہی تھی۔ بہرحال دروازہ کھولتے ہوئے' میں سویانگ پر اپنا غصہ اتار رہی تھی۔ باہر سے کوئی جواب نہ پا کر' میں نے اونچی آواز میں پوچھا کہ کون ہے۔

''یہ میں ہوں۔'' سویانگ کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ میں نے اس کے دھیمے لہجے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور گیٹ کھول دیا۔ سویانگ کی ناک پر پٹی بندھی دیکھ کر' میں سراسیمہ ہو گئی۔ وہ میرے پاس سے تیزی سے گزر کر اندرونی دروازے میں گئی اور وہاں سے اپنے کمرے میں۔ میں نے کھڑکی سے امی ابا کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ میں دھیمی چاپ کے ساتھ اندر آ گئی اور اوپری منزل کا رخ کیا۔

سویانگ کپڑے بدل رہی تھی۔ اس کے کپڑوں کا ملگجا پن اور بے ترتیبی کسی ہنگامے کی چغلی کھا رہے تھے۔ وہ لمبی تو نہیں ہے مگر' بچپن ہی سے' اس نے رقص کر کے اپنے بدن کو خاصا متناسب کر رکھا ہے۔ اس کی ٹانگیں خاصی لمبی اور کسی پرندے کی ٹانگوں کی طرح مضبوط ہیں۔

''تمہاری ناک کو کیا ہوا؟'' میں نے بغیر کسی تمہید کے' اس سے سوال کر ڈالا۔ سویانگ

نے پرسکون انداز میں میری طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں خاصا اضطراب تھا۔ ''چوٹ لگ گئی تھی۔'' اس نے رواروی کا انداز اپنانے کی کوشش کی' جیسے کوئی خاص بات نہ ہوئی ہو۔

مجھے بڑا دکھ ہوا۔ نہ جانے آج کل بچے کس لہجے میں بات کرنے لگے ہیں؟ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ لڑکی کسی جھگڑے میں پھنس گئی تھی۔ میں نے اسے اور زیادہ قریب سے دیکھا۔ اس کی ناک کے ایک نتھنے میں روئی بھی گھسی ہوئی تھی۔

''تم جنگلی بلی ہو کیا' کہیں ٹکر مار کے' ناک ہی زخمی کر لی۔ ذرا دیکھو تو خود کو!''

''یہ ساری کارستانی ایک جیب کترے کی ہے۔ وہ میری فیس اڑانا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ یہ ساری چوٹیں اسی کمینے کے ہاتھوں لگی ہیں۔ ساری گلی میں گرتا آیا ہے میرا خون۔'' سویا نگ نے اپنی ٹی شرٹ اتار کر میرے ایک جانب پھینک دی' کھٹی میٹھی سی بو فضا میں پھیل گئی۔ صرف زیر جامہ پہنے' ناک پر پٹی لگائے' سویا نگ کسی باکسر کی ایسی بیوی لگ رہی تھی جس نے تازہ تازہ مار کھائی ہو۔

''کیا واقعی'' میں نے اس پر مشتبہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں نظر نہیں آرہا کیا؟'' اس نے کاٹن کی نائٹی میں اپنا سر گھساتے ہوئے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''خدا کی پناہ! کب ہوا تھا یہ واقعہ؟ رقم تمہیں واپس ملی کہ نہیں؟ آدھی رات تک تم کہاں ماری ماری پھر رہی تھیں' تمہیں تو سیدھے گھر آجانا چاہئے تھا۔''

سویا نگ تیزی سے گھومی اور مجھ پر برس پڑی۔ ''باجی' میرے کتنی چوٹیں لگی ہیں' کہاں کہاں لگی ہیں؟ یہ بھی تو پوچھو نا؟ میری تکلیف محسوس نہیں کر رہیں آپ؟'' اس کے لہجے میں زہریلی تلخی تھی' اس کے دانت' کسی خوفناک کتے کے دانتوں کی طرح کچکچا رہے تھے۔

میں نے اپنے تلخ انداز پر قابو پا کر دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''سکول کا کیا رہا؟

''میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ صبح' میں ماں کو بھی بتا دوں گی۔'' اس نے اپنے چھوٹے مگر گھنے بالوں میں کنگھی اٹکائی' دھلے ہوئے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم کی جانب چل دی۔ میں اسے تکتی رہ گئی۔ اس کے گستاخ لہجے نے مجھے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے مزید بات کرنا ہی نہیں چاہتی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عرصے سے میں نے سویا نگ کو' اچھی طرح' دیکھا بھی نہیں تھا۔

اگلی صبح، سویا نگ ناشتے کیلئے نیچے نہیں آئی۔ میں نے چاہا کہ کل کے واقعے کے بارے میں اشارتاً بتا دوں۔ پھر میں نے اپنا ارادہ شام تک کیلئے ملتوی کر دیا۔ مجھے سویا نگ کے کہنے پر پورا یقین نہیں تھا۔ خدا جانے وہ سچ کہہ رہی تھی یا یونہی ہانک رہی تھی۔ سویا نگ کی باتوں نے سارا دن میرے دماغ میں کھلبلی مچائے رکھی۔ تین بجے کے قریب ماں کا فون آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا میں شام کو چاؤ کے ساتھ مصروف رہوں گی اور کیا گھر واپسی دیر سے ہو گی۔ چاؤ میرا منگیتر تھا۔ ہماری شادی سر پر کھڑی تھی۔ ہم بینک میں اکٹھے کام کرتے تھے، چند روز بعد، میں بینک چھوڑنے والی تھی اس لئے ہر شام ہی ہم دونوں ادھر ادھر گھومنے نکل جاتے تھے۔

''بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ! میری،'' ماں کے منہ سے نکلنے والی آواز کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ آہ سے خاصی مختلف۔ مجھے شبہ ہوا کہ سویا نگ کا ہی چکر ہو گا۔

''میں آفس سے سیدھی گھر آؤں گی ماں۔'' عام حالات میں، میں ماں سے اتنے آزادانہ اور دوستانہ انداز میں نہیں بول پاتی تھی۔ اہم معاملات میں، ماں ہمیشہ مجھ سے مشورہ کرتی تھیں، والد کے ہوتے ہوئے بھی، میری رائے کو وزن دیتی تھیں۔ یہ سوچتے ہوئے، مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ پھر میں جذباتی ہو گئی۔ کچھ دن بعد، میں اس گھر سے رخصت ہونے والی تھی۔

حسب توقع، میرے گھر لوٹتے ہی، ماں نے سویا نگ کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ ''میں ہمیشہ خود کو بتاتی آئی ہوں کہ تین بیٹیاں بس مناسب ہوتی ہیں۔ ایک لڑکی کی بھی شادی ہو جائے تو گھر خالی خالی اور کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ آج کل بھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کچھ کم ہے۔ سویا نگ یہ بات کیوں نہیں سمجھتی۔ کاش وہ مجھے پریشان کرنا چھوڑ دے۔''

''اس نے بتایا ہے کہ اس نے سکول جانا چھوڑ دیا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھ لیا۔

''اس نے تمہیں بتا دیا؟'' ماں خاصی حیران نظر آ رہی تھیں۔

میں نے ماں کو سویا نگ کی زخمی ناک اور رات کی گفتگو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

''کیا اس نے اپنی فیس کھو دینے کا ذکر کیا؟'' میں نے پوچھا۔ میرے ذہن میں، سب سے اہم سوال یہی تھا، جو چبھ رہا تھا۔

''میں نے پوچھا کہ کہیں فیس نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو وہ سکول نہیں چھوڑ رہی۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ فیس کی رقم گم کر بیٹھی تھی۔ ''پھر کیا وجہ تھی؟''

''مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔'' ماں نے سر ہلا کر کہا۔ ''وہ کہہ رہی تھی کہ یہ سب سرخ خوشبودار پھولوں کا کیا دھرا ہے۔''

''سرخ خوشبودار پھول؟'' میں نے ماں سے اس کی توضیح چاہی۔

''اچھا! بتائے دیتی ہوں جو کچھ اس نے مجھے بتایا تھا۔''

سویا نگ پر سکول چھوڑنے کا بھوت اچانک ہی سوار ہوا تھا۔ گزشتہ روز وہ گھر سے' سکول کی فیس جمع کرانے ہی نکلی تھی۔ وہ ایک سمیسٹر پہلے ہی ضائع کر چکی تھی۔ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ اگلا سمیسٹر اور بھی زیادہ پریشان کن ثابت ہوگا لیکن اس طرح کی سوچیں' اتنی غیر معمولی خواہش کو جنم نہیں دے سکتی تھیں۔ اچھے خاصے طلبہ فیس جمع کرانے' سکول کے دفتر کی طرف جا رہے تھے' سویا نگ بھی ان کی بھیڑ میں شامل ہوگئی۔ اس بھیڑ میں اسے لگا جیسے وہ ان میں بری طرح پھنس کر رہ گئی ہے۔ سکول کے احاطے میں داخل ہوتے ہی' سرخ خوشبودار پھولوں کی ایک کیاری پر اس کی نظر پڑی تو وہ اس کی دلکشی میں مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اس کی خوشبو اور رنگ میں موجود کشش اس کے رگ و پے میں اترتی محسوس ہوئی۔ موسم گرما کے آخری دنوں کے سورج تلے ان پھولوں کی پتیوں میں تازہ خون جھلکتا نظر آیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ارغوانی پھولوں کی لہروں کے گرداب میں پھنس گئی ہے۔

''اور یوں وہ سکول سے غائب ہوگئی۔'' ماں نے بات ختم کی۔ ''یہ تھی ساری وجہ۔''

میں نے حیرت سے ماں کی جانب دیکھا۔ کیا سویا نگ اتنی ہی عجیب و غریب تھی؟ میں نے اس واقعے کو اپنے تصور میں لانے کی کوشش کی' جو سرخ خوشبودار گلابوں کی جھاڑی میں کہیں اٹکا ہوا تھا۔ گرما کے آخری دنوں کا سورج' ہزارہا گلابوں کا بکھرا جھنڈ' کیا بس یہی کچھ تھا یا؟ اور یہ تازہ خون کا اس طرح بہنا؟ عجیب صورتحال تھی' میری سمجھ سے بالکل باہر——!

غصے کے عالم میں' میرا ذہن الٹی سیدھی سوچے جا رہا تھا۔ ''آج کل کے یہ بچے واقعی!'' بڑبڑاہٹ میں' کچھ لفظ زبان پر بھی آ گئے۔ ''اسے کچھ ہوا تو نہیں؟'' میں نے ماں سے پوچھا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ فیس کی رقم غالباً سویا نگ خرچ کر بیٹھی ہے۔ بینک میں کام کرنے کی وجہ سے مجھے لوگوں کی نفسیات کا پتہ چل گیا تھا۔ ہاتھ میں پیسے ہونا اور انہیں اپنی مرضی سے خرچ کرنا' اس کا اپنا مزا ہے۔ مجھے ایک کیشیئر لڑکی یاد آئی جو رقم کے بنڈل میں سے' ایک وقت میں'

ایک نوٹ اڑا لیا کرتی تھی ـــــ شروع میں یہ ہزار کا نوٹ ہوتا تھا' بعد میں پانچ ہزار کا ہو گیا' اگر وقت کی میکانکی رفتار کی طرح بینک کیشیئر یہ دھندا کر کے گاہکوں کے ڈیپازٹ اڑا سکتے ہیں تو اپنی جیب میں موجود فیس کی رقم خرچ کر دینا' سویا نگ کیلئے کونسا مشکل کام تھا۔ پھر میں نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ وہ رقم اس نے کہاں خرچ کی ہو گی۔ سویا نگ کو اپنے بناؤ سنگھار کیلئے پیسے خرچ کرنا اچھا لگتا تھا مگر وہ اس قسم کی لڑکی نہیں تھی کہ سکول فیس ہی فضولیات یا عیاشی میں اڑا دے۔ شاید اس نے یہ رقم کسی اور پر خرچ کر دی تھی؟

اسے میرے تخیل کی کم مائگی سمجھیں یا کچھ اور ـــــ میرے ذہن میں ایک ایسے کالج سٹوڈنٹ کی تصویر ابھری' جس کا حکومت مخالف طلبہ کے ایک گروہ سے تعلق تھا اور آج کل حکومت ان کی پکڑ دھکڑ میں لگی ہوئی تھی۔ اخبارات میں ان کا ذکر آتا رہتا تھا۔ ضرور سویا نگ نے رقم اسی پر خرچ کی ہو گی۔

ماں' اپنے طور پر' صورتحال کا تجزیہ کر رہی تھیں۔ ان کی اپروچ میرے تخیل کی نسبت بہر حال زیادہ بہتر تھی۔ انہوں نے سویا نگ سے پوچھا تھا کہ کہیں اسے سکول سے نکال تو نہیں دیا گیا۔ ممکن ہے وہ طلبہ کی ہڑتال میں اتنی ہی فعال رہی ہو!

''اس نے جواب دیا کہ اگر سکول چھوڑنے کا اتنا شاندار سبب ہوتا تو وہ خوشی کے مارے پاگل ہو جاتی۔'' ماں بولتی رہیں۔ ''میں نہیں سمجھ پا رہی۔ مگر ہم دونوں اسے سمجھنے کی اتنی بری طرح کوشش کر رہے ہیں اور ناکام ہو رہے ہیں اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے جاننا اور سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ہے نا یہی بات؟''

مجھے ماں کی بات سمجھنے میں کچھ دشواری ہوئی' پھر میں نے ان پر نظر ڈالی۔ وہ کھلے ذہن سے سوچنے کی عادی تھیں۔ ان کی باتیں بھی سیدھی اور عام فہم ہوتی تھیں۔ میں نے ان کے سرد اور بے رحم تجزیئے پر دل ہی دل میں اختلاف کیا۔ ماں کا یہ رویہ' ان کی ممتا کے برعکس تھا۔

سویا نگ ہماری دنیا سے باہر کیوں نکلنا چاہ رہی تھی؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ کوئی خاص وجہ تو تھی نہیں۔ وہ کوئی کام کرنا چاہتی ہو یا شادی ـــــ پہلے اسے سکول کی پڑھائی ختم کرنی چاہئے۔

میں مصر تھی کہ سکول چھوڑنے کے بارے میں سویا نگ کے خیالات بدلنے کی کوشش کی جائے۔ سرخ گلاب اور ان کی خوشبو اس پر اس بری طرح اثر انداز کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ کوئی

ہسپانوی ساؤنڈ تو ہے نہیں! میں اس احمقانہ سوچ کو کوئی اہمیت دیئے بغیر فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''اسے سکول نہیں چھوڑنا ہے۔''

''لیکن ایک بار' سکول چھوڑنے کی درخواست جمع ہو جائے تو اسے واپس لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔'' ماں نے جواب دیا۔ ''یہ بڑی مشکل ہو گئی۔ اگر کوئی بچہ سکول چھوڑنا چاہ رہا ہے تو سکول والے اس کے ماں باپ سے کوئی رابطہ نہیں کرتے؟'' ماں نے تھکے تھکے لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا کالج اسی لئے ہیں کہ طلبہ' جب اور جہاں ان کا جی چاہے' اٹھ کر چلتے بنیں؟'' اب وہ معصوم سکولوں کو الزام دے رہی تھیں۔

اس وقت تک میں نے ماں سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ انہوں نے سکول والوں سے رابطہ بھی کیا ہے یا نہیں۔

''تمہارا خیال ہے' اس نے جھوٹ موٹ ہی سکول چھوڑنے کی اڑائی ہو گی؟ معاملہ کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے۔'' ان کے لہجے میں ہلکی سی درشتی تھی' پھر جیسے انہیں صحیح بات سمجھ آ گئی۔ ''میں اگر ان سے مل کر بات کرتی تو تمہارے خیال میں ان کا کیا جواب ہوتا؟ تم اس کی ماں ہو کر بھی' اس بارے میں لاعلم ہو؟''

میں اچھی خاصی اکتا گئی تھی۔ آپ صرف اپنی حد تک سوچتی ہیں۔ میں نے چاہا کہ میں ماں سے کہہ دوں مگر پھر نرم انداز میں کہنے لگی۔ ''ہمیں اپنے معاملات اپنے ہاتھوں میں رکھنے چاہئیں۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم اس کی سوچ کس حد تک بدل سکتے ہیں۔ ماں' باپ' بھائی اور بہنوں کی ہمیں ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ یہ خاندان کس لئے ہوتے ہیں؟ اگر کوئی بچہ آوارہ ہوتا ہے یا بگڑنے لگتا ہے تو ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔''

میں نے سویا نگ کے سکول جانے کا فیصلہ کیا۔ ماں غیروں سے بات کرتے ہوئے جھجکتی تھیں چنانچہ یہ بوجھ بھی مجھ پر آن پڑا۔ میں سویا نگ کے فرانسیسی پروفیسر سے مل کر' اس کی سکول واپسی کا کوئی راستہ نکالنا چاہتی تھی۔ سویا نگ کو منانے کا مرحلہ اس کے بعد آتا۔

اگلے دن لنچ کے وقت' میں نے سکول فون کیا' فرنچ ڈیپارٹمنٹ میں ایک آفس اسسٹنٹ سے چیئرمین کے بارے میں پوچھا۔ مجھے مجبوراً اسی طرح سوال کرنا پڑا کیونکہ مجھے پروفیسر کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ وہ موجود نہیں تھا۔ عورت نے میرا نام پوچھا تو مجبوراً مجھے یہ بتانا پڑا کہ میں پی سویا نگ کی بڑی بہن ہوں۔

''پی سویا نگ' پی سویا نگ ــــ اوہ اچھا' وہ لڑکی' جس نے سکول چھوڑ دیا ہے۔''

سویا نگ کے سکول چھوڑ دینے کا تصور میرے لئے خاصا تکلیف دہ تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''سویا نگ نے کہا ہے کہ اس نے خارج فارم کل ہی جمع کرایا ہے ــــ '' پھر میں نے اسے اپنی کال کا سبب بتایا۔ دوسرے کم عمر لوگوں کی طرح' سویا نگ بھی اپنی مرضی سے فیصلے کرتی پھر رہی ہے۔ بس اچانک اس نے ہمیں بتایا کہ اس نے سکول چھوڑ دیا ہے۔ اس نے والدین کی رضامندی حاصل نہیں کی۔ اسی لئے ہم چاہ رہے تھے کہ ممکن ہو تو سکول میں اس کا داخلہ برقرار رکھا جائے۔

دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی' میں نے ہیلو ہیلو کیا۔ بالآخر اس کی آواز آنے لگی۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ تم پی سویا نگ کی بڑی بہن ہو۔'' وہ کچھ متحیر سی تھی۔ اس کا لہجہ بدل گیا' اس نے پوچھا ''تم کہہ رہی ہو کہ اس نے سکول چھوڑنے کا فارم کل ہی جمع کرایا ہے؟ جبکہ یہ کام تو وہ بہار کے سمیسٹر ہی میں کر چکی تھی۔'' میں حیرت سے گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ کس کے بارے میں بات کر رہی تھی؟ وہ سویا نگ کے مغالطے میں کسی اور لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہی تھی؟

''سویا نگ ہی تھی نا جس نے بہار کے سمیسٹر میں سکول چھوڑ دیا تھا؟'' میں نے یقین کرنا چاہا۔

''ڈیپارٹمنٹ میں اس نام کی کوئی اور لڑکی ہے ہی نہیں' اس کے چھوٹے چھوٹے بال تھے؟'' آفس اسسٹنٹ نے اپنی طرف سے بات واضح کر دی۔

میں نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ یوں لگا جیسے چھت ٹوٹ کر مجھ پر آن پڑی ہو۔ میں جو کچھ کہنا چاہتی تھی' بیکار ہو گیا تھا' لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہے۔ خود پر بمشکل قابو پا کر' میں نے اس سے پوچھا کہ سویا نگ کے سکول چھوڑنے کی تصدیق کہاں سے ہو سکتی ہے۔

''سٹوڈنٹ افیرز آفس میں کوشش کر لیں۔''

''اچھا اتنا تو بتا دیں' وہ کسی ہڑتال کے سلسلے میں' کسی مشکل کا شکار تو نہیں ہوئی؟''

''اگر وہ کسی مشکل میں پھنستی تو مجھے یقین ہے کہ اس کے گھر والوں کو اس کا علم ہو جاتا۔''

اگر آفس اسسٹنٹ ذرا بھی خوش مزاج اور معاون ہوتی تو میں اس سے مزید بات چلاتی اور پھر سویا نگ کے اساتذہ سے بھی ملنے چلی جاتی۔ لیکن بات کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہی

تھی۔ سو میں نے فون بند کر دیا۔ لڑکی مہینوں سے سکول جانا چھوڑ چکی تھی اور ہم لاعلم تھے ـــــ اگر ماں نے فون کیا ہوتا تو وہ مجھ سے کہیں زیادہ سراسیمہ ہوتیں' آفس اسسٹنٹ کے سامنے۔ خدا کی پناہ! وہ پچھلے سمیسٹر سے ہی سکول سے غائب تھی۔

اتنا کچھ کر چکنے کے بعد' میں نے سوچا کہ سٹوڈنٹ افیرز آفس بھی فون ملا لیا جائے لیکن وہاں بھی یہی پتہ چلا کہ فرنچ ڈیپارٹمنٹ میں سویا نگ نامی ایک ہی لڑکی تھی اور اس نے بہار کے سمیسٹر سے ہی سکول چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اس کے سکول چھوڑنے کی تاریخ جاننا چاہی مگر یوں لگا جیسے سکول والوں کے پاس میرے لئے کوئی وقت نہیں۔ مجھے کہا گیا کہ میں سکول آ کر' خود ہی یہ معلومات ڈھونڈنے کی زحمت کروں اور ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

باقی دن میرا اپنے کام میں جی نہیں لگا کیونکہ میرے ذہن میں مسلسل' سویا نگ کے متعلق' کھچڑی سی پک رہی تھی' دوپہر کو تو حد ہو گئی۔ میں نے ایک رقم دوبار گنی۔ پھر بھی مجھے اس کی صحت پر شبہ تھا۔ پیسے نکلوانے کی ایک سلپ پر تین لاکھ کی رقم درج تھی اور میں اسے تیس لاکھ سمجھ رہی تھی۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ وہ چھوٹی سی لڑکی کتنی آفت کی پرکالا بن چکی تھی۔ سرخ گلاب کی معطر کیاریاں اور جیب کترے کی کہانی' سب محض جھوٹ تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو مسلسل دھوکہ دیئے جا رہی تھی۔ میرا خیال ہے' میرے پاس تو معقول بہانہ تھا کیونکہ میں روزانہ اپنی ڈیوٹی پر جاتی تھی مگر ماں تو ہر وقت گھر پر ہوتی تھیں' انہیں تو حقیقت سے لاعلم نہیں ہونا چاہیئے۔ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سویا نگ کی کارکردگی کتنی اعلیٰ معیار کی تھی۔

میں نے سویا نگ کو کئی بار گھر دیر سے آتے دیکھا تھا۔ اس کی کتابوں کا بیگ اس کے کندھوں پر ہوتا تھا۔ گزشتہ مئی میں' جب میں نے اسے کئی بار' رات کو دیر سے گھر آتے پایا تو ایک رات میں نے اسے برآمدے ہی میں روک لیا اور ذرا سرد لہجے میں دیر سے آنے پر سرزنش کی۔ ''میں لائبریری میں بیٹھی امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔'' اس نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے مجھے جواب دیا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے' ایک کتاب اس کے ہاتھوں سے گر گئی تھی۔ فرانسیسی زبان میں لکھی ہوئی' یہ کتاب کامیو کی تھی۔ مجھے اپنی بہن پر فخر محسوس ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگلی تنخواہ پر میں اسے کچھ جیب خرچ دینے کی کوشش کروں گی۔ سویا نگ اور اپنی دوسری بہن ہائی یانگ ـــــ جو پرائمری سکول تک بڑی اچھی طالبعلم رہی تھی اور اب میڈیکل سکول میں تھی ـــــ کے برعکس' مجھے پڑھائی سے زیادہ

رغبت نہیں تھی۔ ماں جلد ہی اس حقیقت سے واقف ہو گئی تھیں اور ان کی وجہ سے ہی' میں نے پیانو کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن پھر بھی میں' دل ہی دل میں' تعلیم کو نہایت وقعت دیتی تھی۔

اب میری پریشانی یہ تھی کہ سویا نگ کے متعلق ماں کو کس طرح آگاہ کیا جائے۔ ماں اس پر بے پناہ فخر کرتی تھیں اور اس حقیقت کا اظہار انہیں کتنی ذہنی اذیت سے دوچار کرتا۔ وہ اسے کتنا زبردست فریب سمجھتیں۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں ماں کا ردعمل سویا نگ کو مزید غلط سمت میں نہ دھکیل دے۔ ضرورت اسے اچھی طرح سمجھنے اور پیار سے سمجھانے کی تھی۔

میں نے اپنی ماں کو بتائے بغیر' مڈل سکول میں پیانو سیکھنا چھوڑ دی تھی تو یہی ماں تھیں جنہوں نے دو ہفتے تک مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ میں ان کا یہ سلوک برداشت نہیں کر سکی تھی اور بری طرح رو رو کر' ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگتی رہی تھی۔ اگر میں بھی ان کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی اور اپنی ضد پر قائم رہتی تو خدا جانے یہ سرد جنگ کتنے عرصے تک یونہی جاری رہتی۔ وہ واقعہ ذہن میں آتے ہی اس کے متعلق ایک تلخ تاثر ابھر آیا۔ میں نے سوچا کہ ماں کو حقیقت بتانے کے بجائے' کوشش کی جائے کہ سویا نگ دوبارہ داخلے کیلئے تیار ہو جائے۔ خیال برا نہیں تھا میں سویا نگ کو کہہ سکتی تھی۔ ''میں ماں سے بات کر کے' تمہاری فیس کے پیسے لے لوں گی۔'' اور اگر یہ مناسب نہ لگا (ہمارے خاندان کی عورتیں کسی سے مدد مانگنا کسر شان سمجھتی ہیں) میں اسے پیسے بطور قرض دے دوں گی۔ میں اسے یہاں تک بتا دوں گی۔ ''اگر تم سکول واپس جانے پر راضی ہو جاؤ تو میں یہ رقم بینک سے بھی چرا سکتی ہوں۔''

انہی خیالات کی رو میں مجھے احساس ہوا کہ میں سویا نگ کو بے انتہا نظرانداز کرتی رہی ہوں۔ شاید میں اس کا وجود تک بھولے بیٹھی تھی۔ ہماری اپنی بے توجہی کے نتیجے میں' ہمیں سویا نگ کے دھوکے کا شکار ہونا پڑا۔ یہ بات نہیں کہ ہم اس سے پیار نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی' میں اس کیلئے نادم تھی۔

میں نے چائے پیتے ہوئے چاؤ کو بتا دیا تھا کہ مجھے گھر پر ضروری کام ہے۔ سو میں دفتر سے ذرا جلدی گھر واپس آ گئی۔ ابو بھی گھر آ چکے تھے اور وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں سیدھی اوپری منزل پر چلی گئی مگر اپنے کمرے میں جانے سے پہلے' میں نے چوری چوری سویا نگ کے کمرے میں جھانکنے اور کچھ سننے کی کوشش کی۔ دروازے کے نیچے سے روشنی نکل کر' سیڑھیوں کے عین اوپر واقع دادی ماں کے کمرے پر پڑ رہی تھی لیکن دونوں کمروں میں سے ذرا

بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ دوسری منزل بالکل پرسکوت تھی۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ شاید وہ سو رہی ہے' میں نے سوچا' پھر میں نے دستک دی' تب بھی زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ لگ رہا تھا کہ وہ جا چکی ہے۔ میں کچھ سٹپٹا سی گئی۔ ہم چاروں بچوں میں سے کوئی بھی دروازہ بند کر کے سونے کا عادی نہیں تھا۔ پتہ نہیں سویا نگ میں کب سے تبدیلی آئی تھی لیکن پچھلے سال' مختلف دنوں میں' اس کی غیر حاضری میں بھی' میں اس کا کمرہ استعمال کرتی رہی تھی۔ شمالی جانب یہ کمرہ' سورج سے اوٹ میں ہونے کی وجہ سے' دن میں تھوڑے بہت آرام کیلئے بہترین جگہ تھا۔

اس شام' میں نے کھانا اکیلے کھانے کے بارے میں سوچا' چنانچہ مجھے ڈنر کیلئے نیچے بلایا گیا تو میں نے کہلا بھیجا کہ میں نہانے کے بعد نیچے آؤں گی۔ بات یہ نہیں تھی کہ میں سویا نگ کے بارے میں گفتگو کا آغاز کس طرح کروں گی بلکہ مشکل یہ تھی کہ چنگ اوا اور دادی ماں کے سامنے بات کرتے ہوئے لفظ میرے حلق میں ہی پھنسے رہ جائیں گے۔ ابو گرم مزاج تو ہیں ہی۔ وہ غصے میں چمچے ادھر ادھر پھینک کر' اپنا ردعمل ظاہر کرنے لگیں گے۔

میں نیچے آئی تو میرے بال خاصے گیلے تھے۔ ابو اور چنگ اولونگ روم میں ٹی وی دیکھ رہے تھے اور ماں کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔ میں نے کچن میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ ماں میز پر موجود مولیوں کا ڈھیر دھونے جا رہی تھیں۔ انہوں نے بند دروازے پر نظر ڈالی اور کہا ''یہ کیا کر رہی ہو؟ اندر پہلے ہی خاصی گرمی ہے۔''

میں ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ پھر ماں سے سویا نگ کی واپسی کے بارے میں استفسار کیا۔

''دن میں تو وہ یہیں تھی مگر جب میں مارکیٹ سے واپس آئی تو وہ جا چکی تھی۔ گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے جاتے ہوئے گھر کا بیرونی گیٹ تک کھلا چھوڑ دیا۔'' میں نے اپنے سامنے موجود سوپ کے دو چار گھونٹ لیے اور پھر فوراً ہی یہ جملہ گویا گلے سے نکال پھینکا۔ ''سویا نگ کافی پہلے ہی سکول چھوڑ چکی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ماں کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ظاہر ہے وہ بات سمجھ ہی نہیں پائی تھیں۔ میں نے اطمینان سے کھانا کھاتے ہوئے ماں کو' سکول سے حاصل کردہ معلومات کے بارے میں آگاہ کیا' ماں نے مولیاں میز پر ایک جانب رکھ دیں اور تعجب سے منہ کھولے میری باتیں سنتی رہیں۔ ان کی نظروں میں ایک عجیب سی چبھن تھی جیسے وہ میرا جھوٹ پکڑنے کی

کوشش میں ہوں۔ میں نے ماں کو سب کچھ بتا دیا۔ اپنے ہی گھر کے فرد کے بارے میں معلومات لیتے ہوئے' میں جس گھبراہٹ کا شکار ہوئی تھی' میں نے ماں سے وہ بھی نہیں چھپائی۔ میرا تجزیہ یہ تھا کہ سویا نگ کے متعلق حقائق کی اصلیت معلوم کرنا ہی باقی رہ گیا تھا۔ ماں نے چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ لیا اور پھر بے دھیانی میں کپ کو گلاس سے ٹکرا دیا۔ چائے میز پر گر گئی۔ ''تم سب بچوں کو میں نے ہی پالا پوسا ہے' اب ایک بچے کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہو رہے ہیں۔'' وہ میکانکی انداز میں میز پر سے چائے صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ظاہر ہے اس خبر سے وہ ہل کر رہ گئی تھیں۔

ماں کو سکون دینے کیلئے' میں نے پوچھا: ابو کو اس کا علم ہے۔ انہوں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

''تم سے تفصیل سننے کے بعد' میرا ارادہ تھا ان سے بات کرنے کا لیکن تمہارے ابو سرخ گلابوں کی کیاری جیسی باتوں کو بالکل بھی سمجھ نہیں پائیں گے——''

''ماں! آپ سویا نگ کے ساتھ مل بیٹھ کر' بات کیوں نہیں کرتیں؟ آپ کو پتہ ہے کہ جب خوشبودار قرمزی گلابوں کیلئے' وہ سکول چھوڑنے کی بات کرتی ہے تو وہ کیا کہہ رہی ہوتی ہے؟ اس کا کوئی مفہوم سمجھ آتا ہے؟ اس کا کوئی مطلب ہو یا نہ ہو' بہرحال یہ سچ ہرگز نہیں۔''

''میں اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' انہوں نے مولیوں کی جڑیں کاٹتے ہوئے' دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ لیکن میں بہت خوفزدہ تھی۔

''خوفزدہ مگر کس سے؟'' میری چبھتی ہوئی نگاہیں ان سے جواب کی طالب تھیں۔

ماں بظاہر مولیاں صاف کرنے میں لگی ہوئی تھیں مگر دراصل وہ خود کو مجتمع کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے منہ در منہ بات کرنے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں' کیا بتاؤں۔ وہ اپنی زخمی ناک کے ساتھ مجھے کیا لگ رہی تھی اور وہ مجھے سرخ خوشبودار گلابوں کی کیاری کے بارے میں بتا رہی تھی—— پھر اس نے اپنی نظریں مجھ پر جما کر کہا: میں ہزار دفعہ بھی آپ کو بتاؤں تو آپ سمجھ نہیں پائیں گی—— میں تو بس اسے تکتی رہی۔ میں حیران ہو رہی تھی اسے دیکھ کر' کیا یہ میرا اپنا خون ہے' میرے ہی جسم کا حصہ؟''

اتنی سرد مہری کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اس کا مقابلہ اپنے دوسرے بھائی سے کرنا شروع کر دیا (میں اپنے اس ماموں سے کبھی نہیں مل پائی۔) وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ 1945ء کی تحریک آزادی سے پہلے دائیں اور بائیں بازو کی خوفناک اور خون

ریز تقسیم کے دوران ــــــ اپنے گھر والوں تک کو وہ ''کامریڈ'' کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ان دونوں کے موازنے میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ کر رہی تھیں لیکن سویا نگ نے ماں کو شاک بھی تو زبردست پہنچایا تھا۔

''تو پھر ماں جی! آپ اس معاملے کا جائزہ لینے جا رہی ہیں نا؟''

جواب دینے کے بجائے ماں نے کہا۔''سویا نگ نے سکول پچھلی بہار میں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔''انہوں نے اپنے ہاتھ سے سینے کو دبانا شروع کر دیا۔ ماں کی طبیعت بگڑتے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ معاملہ میری سوچ سے بھی کہیں زیادہ اہم اور نازک تھا۔ ہمارے گھرانے پر دکھ کے سیاہ بادل اچانک ہی امڈ آئے تھے۔ دو ماہ بعد میری شادی ہونے والی تھی۔ یہ سوچ کر' میں اور فکرمند ہو گئی۔

''ماں جی! یہ کیسے ہو گیا؟''ان پر نظر جمائے مگر بے ربط الفاظ میں' میں نے پوچھا۔

''میری اپنی تو کوئی غلطی نظر نہیں آتی ــــ'' ماں نے اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے' دوبارہ مولیوں کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیں۔ زندگی میں پہلی بار وہ مجھے انتہائی کمزور نظر آئیں۔ ان کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے دکھائی دے رہے تھے۔ کافی عرصے سے ہم ایک دوسرے سے لاتعلق سے تھے مگر اس وقت ان کیلئے مجھے اپنے دل میں شدید محبت محسوس ہوئی۔ کم سے کم' اپنی شادی سے پہلے' گھر کی بڑی بیٹی کی طرح' میں اپنی ماں کیلئے ہر ممکن تقویت کا باعث بننا چاہتی تھی۔ سویا نگ کے موجودہ مسئلے کو حل کرنے کی خواہش کو' گویا میں نے اپنی آخری ذمہ داری کے طور پر لیا۔

سویا نگ اس رات گھر نہیں آئی۔ میں نے اس کے انتظار میں اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے دو بجا دیئے۔ سب سے پہلے' میں نے یہ جاننے کی کوشش کی وہ ہم سے کٹ کیوں گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی وجہ ہمارے گھرانے کا انفرادی لائف سٹائل تھا۔ عاقل و بالغ ہوتے کے ناطے' ہم اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے' یہ اکیلا پن اس لئے حقیقت بن گیا کہ ہم میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا علیحدہ کمرہ تھا۔ بچپن ہی سے میرے پاس الگ کمرہ تھا۔ ہائی یا نگ اور سویا نگ' مڈل سکول تک' ایک کمرے میں اکٹھے رہتے تھے لیکن جب ہم اس دومنزلہ گھر میں آئے' کوئی پانچ سال پہلے' تو ان دونوں کو بھی اپنا اپنا کمرہ مل گیا تھا۔

مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ سویا نگ اپنا الگ کمرہ ملنے پر کتنی خوش ہوئی تھی۔ ہائی یا نگ بھی کچھ کم خوش نہیں تھی۔ سویا نگ نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ اپنے کمرے میں بیٹلز کا پوسٹر آویزاں کرڈالا۔ پھر ماں پر زور ڈال کر ٹی وی لاؤنج میں رکھا ہوا پرانا ریکارڈ پلییرٗ اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس کے بعد سے بلاناغہ اس کے کمرے سے پاپ میوزک کی آوازیں سنائی دیتیں۔ اب وہ گھر آتی تو اس کے ہاتھوں میں شمع دان اور پھولوں کے گل دستے ہوا کرتے۔ لگتا ہے اس کا جیب خرچ زیادہ تر اسی طرح کی چیزوں پر خرچ ہونے لگا تھا۔ چھ مہینے میں اس کا کمرہ پھولوں کی خشک پتیوں اور رنگا رنگ شمعوں سے بھر گیا تھا۔ پھر وہ ہائی سکول میں آ گئی۔ اس عمر میں لڑکیاں ایسی حرکتیں کرتی رہتی ہیں لیکن وہ تو اپنی جمالیاتی حس کے ہاتھوں پاگل ہی ہوگئی تھی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے۔

ایک شام مجھے لیونارڈ کوہن ــــ میرا ایک پسندیدہ لوک گلوکار ــــ کے گانے کی آواز سویا نگ کے کمرے سے سنائی دی۔ میں اس کے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں درجنوں موم بتیاں روشن تھیں، ننھی ننھی نورانی روحوں کی طرح ــــ اور چھت کے چاروں طرف پھولوں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ میں دبے پاؤں، غار نما اس کمرے میں داخل ہوئی۔

سویا نگ دیوار کے قریب ــــ موم بتیوں کی روشنی کی جانب اپنی پشت کیے ــــ لیٹی تھی۔ اس کے سر پر چمگادڑ سے ملتی جلتی کوئی چیز چڑھی ہوئی تھی۔ یہ سیاہ رنگ کی چھتری تھی لیکن شاید موم بتیوں کی مدہم روشنی میں، وہ بھی پراسرار لگ رہی تھی۔ ہلکے شعلوں سے پھیلتی روشنی سیاہ چھتری کے کپڑے سے ٹکراتی، ادھر ادھر پھیل جاتی۔ سویا نگ اپنی آنکھیں موندے، بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ اپنی ہی دنیا میں اس قدر مگن تھی کہ میرے کمرے میں آنے کا، اسے ابھی تک علم ہی نہیں ہوا تھا۔ بہرحال یہ چھوٹی سی دنیا، اس کی اپنی تھی۔ اس کا حقیقی مفہوم مگر اب ذہن میں آتا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں جلائی ہوئی موم بتیوں کی روشنی کو نا قابل برداشت سمجھ کر، اس نے سیاہ چھتری کے ذریعے انہیں ادھر ادھر بکھیرنے کی کوشش کی تھی۔

اس رات، میرے ذہن میں ترتیب پانے والا تاثر، مجھے اب بھی دہلا دیتا ہے۔ سویا نگ کی بے خبری ہی میں، میں اس کے کمرے سے نکل بھی آئی تھی۔ سویا نگ ایک بالکل ہی مختلف دنیا کی باسی محسوس ہو رہی تھی لیکن ہم دونوں کے مابین عمر کے واضح فرق کی بدولت، میں اس کے پھیلاؤ کی خواہش اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

اس دن کے بعد' مجھے سویا نگ کا' قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔فکر کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ہمیشہ سے ایک ہونہار طالبہ تھی۔اس کا کمرے میں شمعیں روشن کرنے اور سیاہ چھتری کے ذریعے روشنی کو بکھیر کر' مزید دھیما کرنے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔مختصر یہ کہ مجھے سویا نگ پر اندھا اعتماد تھا اور میری اس سے توقعات بھی' ماں کی نسبت کہیں زیادہ تھیں۔

مجھے اس کی بے پناہ ذہانت کی وجہ سے' شروع سے ہی اس سے بے پناہ لگاؤ تھا۔اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اس نے' میرے پیچھے بیٹھ کر' مجھے پیانو بجانے کی مشق کرتے دیکھا اور ـــــ بس' اسے پیانو بجانا آ گیا۔رقص میں بھی' وہ بچپن سے بہت تیز تھی۔اس کے انسٹرکٹر' دوسرے بچوں کی جلن کی پرواہ کئے بغیر' اکثر اسے کلاس کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کیلئے کہا کرتے تھے۔اس کے جسم کا لوچ اور اس کی نرم روی بھی' اس کے رقص کی طرح خاصے متاثر کن تھے۔اس کی حرکت میں ـــــ عام بچوں کی فطرت کے برعکس ـــــ ایک جذبہ محسوس ہوتا تھا جب کبھی مجھے وقت ملتا تو میں اس کی بیلے کلاس میں شریک ہوا کرتی اور اس کی مدد کیا کرتی۔

مڈل سکول میں' سویا نگ اپنے فزیکل ایجوکیشن کے انسٹرکٹر کی نظر میں آ گئی۔اس نے سویا نگ کو سکیٹنگ کرانا شروع کر دی۔کالج میں' میرا پہلا سال بے پناہ مصروفیتوں کا تھا مگر پھر بھی میں کبھی کبھار رنگ کے مشرقی گیٹ جا کر سویا نگ کے ساتھ سکیٹنگ میں شامل ہو جایا کرتی۔عموماً وہ رنگ گیٹ میں ہی مشق کیا کرتی تھی۔کسی پرندے کی مانند' ہوا میں اڑتی ہوئی' وہ برف میں گول دائرے بنایا کرتی۔گو اپنی بہنوں کی شباہت' اس میں ذرا بھی نہیں تھی مگر برف کی سطح پر رقصاں' وہ اتنی خوبصورت نظر آتی کہ میں اپنی آنکھیں جھپکانا بھول جاتی۔

اس دو منزلہ گھر میں آنے کے بعد' دراصل' ہم میں بیگانگی اور دوریاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔سویا نگ کو اپنا علیحدہ کمرہ مل گیا اور انہی دنوں میں اپنی زندگی کے انتہائی کربناک الجھاؤ میں پھنس کر رہ گئی تھی۔مجھے شدید ڈپریشن ہو گیا تھا اور کوئی ایک سال تک میں' اپنے ہی گھر میں' اجنبیوں کی طرح رہتی رہی۔کالج سے گریجویشن کے فوراً بعد بینک کی نوکری کا بوجھ میرے سر پر آن پڑا اور مجھے عملی زندگی میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی فکر پڑ گئی۔

ہائی سکول کے دوران' سویا نگ گاہے بگاہے میرے کمرے میں جھانک لیا کرتی تھی اور براہام اور بیچ کے ریکارڈ مجھ سے مانگتے ہوئے قطعی جھجکتی نہیں تھی لیکن اپنی پسند کے کالج میں'

داخلے کے ٹیسٹ میں ناکامی کے بعد' اس کا میرے کمرے میں آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ میرے ڈپریشن کے دنوں کی طرح' شاید وہ بھی گھر والوں سے زیادہ ملنے جلنے میں اور بات کرنے میں الجھن محسوس کرتی ہو گی۔ چنانچہ' اتوار کے روز بھی' وہ عموماً اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔ بعض اوقات' وہ نشے کی حالت میں گھر لوٹتی۔ ہم اس لئے روک ٹوک نہیں کرتے تھے کیونکہ ہمارے خیال میں' کالج میں داخلے کیلئے' مزید ایک سال کے انتظار نے' اسے خاصا ذہنی صدمہ پہنچایا تھا۔ خوش قسمتی سے' سویا نگ کو اگلے سال اپنی مرضی کے سکول میں داخلہ مل گیا' اسے ایک نئی اور بھرپور زندگی کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ خوش رنگ کپڑے پہننے لگی تھی اور اپنے سکول کے معاملات میں بھرپور دلچسپی بھی لینے لگی تھی۔

ہائی یانگ تو بالکل کتابوں کا کیڑا تھی۔ ہمارے تعلقات میں لاتعلقی کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ تو اس قسم کی لڑکی تھی کہ اپنے کھانے سے پہلے تک' سامنے موجود چاولوں کی ڈش میں بھی' اپنی انگلی کی مدد سے' انگریزی لفظ لکھنے کی مشق کرتی رہتی تھی۔ ہائی سکول میں جا کر بھی' وہ کسی بھی جگہ پر انگریزی الفاظ لکھنا شروع کر دیتی۔ اس کی بلا سے' چاہے وہ جگہ' پانی سے گیلی میز ہو یا کسی بس کی گرد آلود کھڑکی۔ کھانے سے پہلے' جب دادی اسے دعا مانگنے کو کہتیں تو ہائی یانگ انگریزی میں جواب دیتی کہ ''میں لامذہب ہوں ـــــ لا ـــــ مذ ـــــ ہب!'' دادی اور ہم سب انگریزی نہیں جانتے تھے' اس لئے اس کے جواب سے خاصے جز بز ہوتے اور خاموشی اختیار کر لیتے۔

انگریزی کے ہاتھوں' اسے خود اپنے ہی ہائی سکول میں' اچھی خاصی مشقت اور خفت' دونوں کا ہی' سامنا کرنا پڑا۔ دن نکلتے ہی' وہ ایک مشنری ٹیچر کے گھر کے باہر جا کھڑی ہوتی تا کہ سکول جاتے ہوئے' راستے میں وہ ٹیچر سے انگریزی بولنا سیکھ سکے۔ بارش ہو یا سخت جھلستی دھوپ' وہ ناغہ نہیں کرتی تھی۔ یہ افواہ تک اڑ گئی کہ ہائی یانگ کسی کے عشق میں گرفتار ہو گئی ہے۔ سکول کے ذمہ داروں تک بھی یہ افواہ پہنچی تو انہوں نے ماں جی کو سکول بلا بھیجا۔ کچھ دنوں بعد ہائی یانگ کے ایک ٹیچر نے اس کی ہم جماعتوں کو بتایا: ہائی یانگ مشنری کے عشق میں نہیں بلکہ انگریزی زبان کے عشق میں مبتلا تھی۔

محنتی وہ اتنی تھی کہ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے' اپنی ہی میز پر سو جاتی۔ کئی بار میں نے اسے اپنا باتھ روم استعمال کرنے کی پیشکش کی مگر وہ اپنے ٹوائلٹ میں بیٹھ کر' نظام انہضام کے

متعلق—— غذا کی نالی سے لے کر بڑی آنت تک —— مناسب کیمیائی علامات سمیت، ہر شے تفصیلاً پڑھنے کا مزا لیتی تھی۔ میں اس پر بری طرح تلملا اٹھتی۔

ہائی یانگ کے اثر سے آزادی پا کر، سویانگ نے خود کو موسیقی، شمعوں اور پھولوں کے رنگوں اور روشنی میں غرق کر لیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ مجھے علم تھا کہ سویانگ بھی کبھی ماہر حیاتیات بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ مینڈل کے تخلیقی نظریات سے خاصی متاثر تھی اور کہا کرتی تھی کہ میں حیاتیاتی انجینئر بن کر، اچھے حیاتیاتی جرثوموں کی نشوونما کروں گی۔

فنکارانہ صلاحیتوں کی مالک، سویانگ، تعلیم کے معاملے میں یقیناً ہائی یانگ سے متاثر رہی ہو گی۔ دونوں میں بنتی خوب تھی مگر علیحدہ علیحدہ کمرے ملنے اور ہائی یانگ کے کالج چلے جانے کے بعد، یہ جوڑی قائم نہ رہ سکی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انفرادیت پسندی کی ابتداء، ایک طرح سے، ہماری ماں نے کی تھی۔ وہ انتہائی خود دار قسم کی عورت تھیں۔ اعلیٰ پائے کے سکول میں زیرِ تعلیم رہنے پر بھی انہیں فخر تھا۔ وہ ایک اچھی طالبہ تھیں۔ انہوں نے موسم گرما کے نسوانی ملبوسات اور ان پر کڑھائی، نقاشی اور اس سے متعلق امور پر خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ شادی سے پہلے، ماں کپڑے پہننے کی شوقین خواتین میں بے پناہ مقبول تھیں۔ ہمارے ابو کے خاندان میں، انہی دنوں، معدنی کاروبار کی بدولت، دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ ماں جی، اپنی غربت کے باوجود، اپنی ذہانت، خوبصورتی اور فنی مہارت کے بل بوتے پر ہی انہیں پسند آئی ہوں۔

والد کو پڑھنے لکھنے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، اسی لئے وہ جاپانیوں کے قائم کردہ سکول میں پانچ سال بھی پورے نہیں کر سکے تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے کاروبار میں دادا کا ہاتھ بٹانا پسند کیا۔ وہ ہمیشہ ماں کی ذہانت کی تعریف کیا کرتے اور بے پناہ محبت کا اظہار بھی۔ میری بہنوں کو اور مجھے یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ ہمارے نام کے ساتھ مشترکہ عنصر ''یانگ'' —— اس کے معنی بھیڑ کے ہیں —— ماں کی پیدائش کے سال، یانگ کی جانب اشارہ کرتا تھا۔

اب بھی کبھی کبھی ماں کو سلائی مشین چلانے کا دورہ سا پڑتا ہے۔ انہوں نے ابو کے پہننے کے کئی گاؤن اور کسی فیشن شو کیلئے نسوانی گاؤن بھی ڈیزائن کئے ہیں۔ اپنے بچپن میں، میں اور میری بہنیں، ماں جی کے ہاتھوں سلے کپڑے ہی پہنا کرتی تھیں۔ ماں ان کپڑوں میں اپنے وقت کی ہر جدت، خوبصورتی اور فیشن اس طرح سمو دیتیں کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے۔ مجھے اچھی طرح

یاد ہے کہ ہمارے وہ غیر روایتی ملبوسات دیکھ کر دوسرے بچوں کی نگاہیں ہم پر جمی رہ جاتیں۔

ماں کی یہ صلاحیت صرف مجھ میں آئی تھی' اگرچہ میں بھی صرف پیٹرن دیکھ کر سویٹر اور دوسرے سیدھے سادھے لباس آسانی سے تیار کر ڈالتی تھی مگر ماں جی کی دستی مہارت اور کڑھائی کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ ان کے کام میں نقص ہوتا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ مثالی معیار کی قائل تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کے کام کی تعریف کبھی کبھار ہی کرتی تھیں۔ ان میں اور دوسری ماؤں میں یہ ایک بہت بڑا فرق تھا اور ہمیں ان کے اس رویے پر دکھ بھی ہوتا تھا۔ اس رویے کی بدولت' ہم کسی سے بھی اپنی تعریف کی توقع نہیں کرتے تھے' شاید اسی لئے ہمیں اترانا بھی نہیں آیا لیکن دوسری جانب ہمیں بری طرح یہ احساس تھا کہ دوسرے بچوں کے برعکس' ہم اپنی ماں کی معمولی شفقت سے بھی محروم رہتے ہیں۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ' ماں جی کے کچھ اور رویے بھی میرے علم میں آئے جن کی وجہ سے میرا دکھ کچھ اور بڑھ گیا۔ وہ مجھے ہمیشہ خود سے ایک فاصلے پر رکھتیں جیسے میں ان کی بیٹی نہیں' کوئی دوسری عورت ہوں۔ بعض اوقات مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا۔ مثلاً ایک دن میں ان کے کمرے میں فرش پر بیٹھی' ان سے باتیں کر رہی تھی۔ میں ملحقہ باتھ روم جانے کے خیال سے اٹھی لیکن ماں جی نے کہا۔ ''یہاں کچھ کپڑے پھیلے ہوئے ہیں—— '' پھر انہوں نے سرد مہری سے کہا ''تم دوسرا کوئی باتھ روم استعمال کیوں نہیں کر لیتیں؟ مجھے پتہ تھا کہ یہ باتھ روم ماں جی اور ابو کے استعمال میں تھا لیکن مجھے یہ بات جتاتے ہوئے' ماں جی کی نگاہیں کچھ اس طرح مجھ میں چبھ رہی تھیں جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔

اس کے بعد' میں نے ان کے کمرے میں جانا چھوڑ دیا اور اگر کبھی مجھے وہاں جانا بھی پڑا تو میں نے ایک نظر ان کے باتھ روم پر ڈال کر' تصور کی آنکھ سے' ان دونوں کو عریاں دیکھا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ تم بہت بلند اور طاقتور ہو' لیکن دراصل تم دونوں جانور ہو۔'' میں غصے میں بڑبڑاتی' شاید اس طرح میری انتقامی حس کو سکون ملتا ہو۔

کبھی کبھار' اس واقعے کے ذہن میں تازہ ہونے سے' میں بری طرح ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی' ماں کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو بھی تھا جس پر بے تحاشا ہنسا جا سکتا تھا۔ وہ انتہائی شرمیلی تھیں۔ گریجوایشن کی تقاریب کے دوران' مثال کے طور پر' میوزک کے طلبہ نے ایک آرٹ شو منعقد کیا۔ میں نے بھی اس شو میں خطاطی کے نمونے رکھے۔ ظاہر ہے'

میں نے ماں جی کو بھی مدعو کیا' تقریب کے روز' وہ کسی بچے کی طرح' ہر شے کے بارے میں' یہاں تک کہ اپنے لباس کیلئے بھی' خاصی گھبرائی' چکرائی پھر رہی تھیں لیکن یہ سن کر کہ والدین کو ـــــ برش کے روایتی قلم کے ذریعے ـــــ مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات لکھنا ہوں گے' وہ اس آرٹ شو میں گئیں ہی نہیں۔

اس معاملے میں سویا نگ سے فوری رابطے کے بجائے ماں کے تساہل پسند رویے نے مجھے خاصا اپ سیٹ کیا۔ اگلی صبح' جب میں نے دفتر سے انہیں فون کیا تو انہوں نے انتہائی درد بھری آواز میں بتایا۔

''سویا نگ کی کسی سہیلی نے آج صبح' اس کے متعلق فون پر وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نے رات سویا نگ کے بارے میں تمہارے ابو کو بتا دیا تھا اور آج شام کو گھر میں خیرت نہیں ہوگی۔''

''آپ نے انہیں اس کے سکول چھوڑنے کا بتا دیا؟ میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''ہاں' بتا دیا۔'' ماں لاتعلقی کے سے انداز میں بولیں۔

خدا کرے' ابو سے بات کرنے سے پہلے' ماں نے سویا نگ سے سنجیدگی سے گفتگو کی ہو' میں نے خودکلامی کی۔ طوفان سر پر ہے اور میں اس کا رخ پھیرنے کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

اگلا دن' بینک میں میرا آخری دن تھا۔ سو مجھے دوسرے ڈپارٹمنٹ کی خواتین کے ساتھ ڈنر میں شریک ہونا تھا۔ سویا نگ کے متعلق سوچوں میں بری طرح گھری ہونے کے باوجود' اپنے ساتھی کارکنوں کے ساتھ مل کر ڈنر کرنے کا' یہ آخری موقع تھا۔ میں نے تقرب کو کینسل کرنے کے بجائے' انہیں بتایا کہ گھر پر کسی ضروری مصروفیت کی وجہ سے' میں ڈنر کے فوراً بعد جانا چاہوں گی۔ میں نے انہیں تقریب کو مختصر کرنے کی درخواست کی۔

چنانچہ' میں نو بجے سے پہلے ہی اپنے گھر کے گیٹ پر موجود تھی۔

''کون ہے؟'' ماں نے انٹر کام پر پوچھا۔

''می یا نگ ہوں!'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''سویا نگ گھر آ گئی کیا؟''

''انتظار کرو۔'' ماں نے کہا اور انٹر کام بند ہو گیا۔

ماں خود گیٹ کھولنے باہر آئیں۔ خارجی دروازہ کھولنے کیلئے انہیں آتے دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ اندر کچھ نہ کچھ ہو چکا ہے۔ میرے شبہے کے عین مطابق' ماں جی کے چہرے پر اذیت

کندہ تھی۔

''چپ ہی رہنا' تمہارے ابو سویا نگ کو بری طرح ڈانٹ رہے ہیں۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔''

خارجی دروازے پر آتی دھیمی آوازیں' ہمارے اندر آنے کے ساتھ ساتھ' واضح ہوتی چلی گئیں۔ سویا نگ ابو کے سامنے' صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ابو' دوسرے صوفے کے سرے پر' انتہائی بے چین بیٹھے تھے۔ سویا نگ' اس کے برعکس' صوفے میں دھنسی ہوئی' کسی تھکی ماندہ بلی کی طرح' گویا آرام فرما رہی تھی۔

''اپنے ہی والدین کو دھوکہ دینے کیلئے کیسی معافی؟ مجھے پتہ ہے آج کل بچے ماں باپ کی باتوں پر کان نہیں دھرتے اور اپنی مرضی چلاتے پھرتے ہیں' لیکن تم نے تو حد کر دی۔ ہم سے ہی دھوکہ کر ڈالا۔ کیا تمہیں اپنے ماں باپ کو دھوکہ دیتے اور بیوقوف بناتے ذرا شرم نہیں آئی۔ کیا اسی طرح کی چیزیں تمہیں کالج میں پڑھائی جاتی ہیں۔''

ابو نے بات کرتے کرتے' ایک نظر مجھ پر ڈالی جبکہ سویا نگ کی نگاہیں کافی ٹیبل پر مرکوز تھیں۔ وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔ وہ ساکت ضرور تھی لیکن لگ نہیں رہا تھا کہ ابو کی ڈانٹ ڈپٹ کا اس پر کوئی اثر ہوا ہوگا۔ سرد مہری اس کے چہرے پر واضح تھی۔

''میں آ گئی ہوں۔'' میں نے کہا اور اوپری منزل پر چلی گئی۔ جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور نیچے آ گئی۔ کھانے سے تو میں فارغ ہو چکی تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا کچن میں جا کر دو چار لقمے اور کھا لوں۔ اس طرح میں ابو اور سویا نگ کی باتیں' ان کی نظر میں آئے بغیر' آرام سے سن سکتی تھی۔

''اگر تم ہم سے بات نہیں کرو گی تو کیسے پتہ چلے گا کہ تمہارے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ آخر تمہیں کیا شکایتیں ہیں؟ کیا مسئلے ہیں؟ میں بتاتا ہوں' تمہارا مسئلہ ہے عیش و آرام!'' ابو سوالات کئے جا رہے تھے' میں ٹہلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔ سویا نگ نے پہلے کی طرح مجھے نظرانداز کیا۔ وہ اب بھی' اسی طرح آرام کے سے انداز میں' صوفے میں دھنسی بیٹھی تھی۔ اس کا سر' ہاتھ کے سہارے' ایک سمت کو جھکا ہوا تھا۔ میز پر دو آدمیوں کا کھانا لگ چکا تھا۔

''اچھا! تو سویا نگ نے بھی کھانا نہیں کھایا؟''

ماں نے سوپ اور چاولوں کی ڈشیں میری جانب بڑھاتے ہوئے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

''تمہاری ماں نے شروع میں مجھ سے بھی جھوٹ بولا۔'' ابو کہہ رہے تھے۔ ''ممکن ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے ہاتھوں' اتنی بری طرح' دھوکہ کھانے پر شرم محسوس کر رہی ہوں۔ انہیں شروع سے تمہارے سکول چھوڑنے کا پتہ تھا لیکن انہوں نے مجھے آج تک اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ ان کا خیال تھا کہ معاملہ میری سمجھ میں ہی نہیں آئے گا۔ خاصی کوشش کے بعد تمہاری ماں سے' یہ راز اگلوایا ہے میں نے۔ جب انہوں نے بتایا کہ اس بات کو کئی مہینے ہو گئے ہیں تو مجھے یقین نہیں آیا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حیرت کے مارے میں پتھرا کر رہ گیا۔ تعجب ہے!''

پانی کا گلاس پیتے ہوئے' ابو کی باتیں میرے کان میں پڑ رہی تھیں۔ ''سویانگ کو علم ہے کہ میں نے اس کے سکول فون کر کے' حقیقت معلوم کر لی تھی؟'' میں نے ماں جی سے آہستگی سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ سویانگ اس حقیقت سے ابھی بے خبر ہے۔ سویانگ کے معاملے میں' میں عموماً بولتی ہی نہیں تھی۔ اس دفعہ اس نے سکول چھوڑنے کی بات کی اور میں نے فوراً ہی تحقیقات شروع کر دی۔ مجھے عجیب سا احساس جرم ہونے لگا۔ اب میں یہ چاہتی تھی کہ کسی بھی طرح سویانگ سے اکیلے میں بات کی جائے۔

''اس میں چھپانے کی کیا بات ہے؟'' ماں نے کہا ''قدرتی بات ہے' بڑی بہنیں اپنی چھوٹی بہنوں کے معاملات میں دلچسپی لیتی ہیں۔

دلچسپی کا لفظ' کسی کیڑے کی طرح' مجھے اپنے چہرے پر رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے زبردستی کچھ سوپ حلق سے نیچے اتارنا شروع کر دیا' ابو کی آواز دوبارہ کانوں میں پڑنے لگی۔

''جو بھی حماقت تم سے سرزد ہوئی ہے' اسے تو بھگتنا ہی ہوگا۔ تم نے بے وقوفی کی اور پھر اسے چھپانے کیلئے اپنی فیس کی رقم بھی ضائع کر دی۔ اس پر تمہیں سرزنش تو ہونی ہی چاہئے مگر کیا تم سمجھتی ہو کہ کچھ ہزار روپوں کی خاطر' تمہیں سکول چھوڑنے کی آزادی مل جائے گی؟ اور تم نے ایسی کیا خوفناک غلطی کی تھی' جس کو چھپانے کیلئے تم نے پچھلی بہار میں سکول ہی چھوڑ دیا۔ کسی لڑکے کے چکر میں پڑ کر تو وقت ضائع نہیں کرتی رہیں؟''

ابو کا یہ ناشائستہ انداز مجھے ذرا نہیں بھایا۔ پھر مجھے سویانگ کی دھیمی آواز سنائی دی۔

''میں لاکھ صفائی دیتی رہوں' آپ کو سمجھ نہیں آئے گی۔ آپ کے موجودہ الفاظ اس کا ثبوت ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے فیس کی رقم خرچ کر دی تھی لیکن شروع میں' میرا خیال تھا کہ میں سکول جاتی رہوں گی۔''

''اچھا' تو میں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ٹھیک ہے ہم نے تمہیں تعلیم اسی لئے دلائی تھی کہ تم سے اس قسم کے جواب سنیں۔'' ابو لعن طعن کرتے ہوئے جب تھک جاتے تو اسی قسم کے فقرے' ان کے منہ سے' ادا ہوتے تھے۔ ہائی یانگ کے مطابق' بالآخر ایک ان پڑھ آدمی کا احساس کمتری بول پڑتا تھا۔ ''لوگ اپنے آپ کو بڑا' بہت بڑا سمجھتے ہیں۔'' ابو کی بات جاری تھی ''لیکن دراصل وہ مہاتما بدھ کے ہاتھ میں موجود روایتی بندر سے ذرا بھی بہتر نہیں ہوتے۔ تمہارا خیال ہے' تم بڑے سکون اور آرام میں ہو۔ ابھی پیدا ہوئے تمہیں عرصہ ہی کتنا ہوا ہے؟ ناکارہ لڑکی!'' ابو کی زبان درشت ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ سویانگ بھی ابو سے جھک جھک کئے جا رہی تھی۔ ''میں یہ نہیں کہہ رہی کہ میں کوئی خاص قسم کی لڑکی ہوں اس لئے آپ مجھے سمجھ نہیں سکتے۔ میں خود بھی ٹھوس انداز میں یہ واضح نہیں کر سکتی کہ جو کچھ مجھ سے ہو گیا' وہ میں نے کیوں کیا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک مصنوعی زندگی گزار رہی ہوں اور سکول مجھے محض دکھاوا لگتا ہے —— بہرحال' میں واپس نہیں جا سکتی۔''

''اس طرح کی باتیں تو کسی ماں باپ کے بھی پلے نہیں پڑیں گی۔ تم نے اپنے گھر والوں کو دھوکہ دیا ہے اور اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ غم اور غصے نے میرے دماغ اور بدن کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کوشش کے باوجود' میں سو نہیں سکا۔''

مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔ ماں جی خاموشی سے کولڈ ٹی بنا لائیں۔ ہمیشہ کی طرح' وہ اس وقت بھی منظر سے ہٹ گئی تھیں تاکہ ابو آزادانہ اپنی اتھارٹی کا استعمال کر سکیں۔ وہ انتہائی نازک صورتحال میں مداخلت کرتی تھیں۔ سب کے سامنے کپ رکھ کر' وہ ابو کے پاس جا بیٹھیں۔

''کچھ بھی ہو' تمہیں ہر حال میں' اس سمیسٹر میں داخلہ لینا ہے۔'' ماں جی نے سویانگ کو بتایا ''میں نے تمہارے سکول سے معلوم کیا ہے' ابھی داخلے کا وقت باقی ہے۔''

''رجسٹریشن کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا؟'' میں مسئلے کے حل کی اس نئی دریافت کے متعلق پوچھنے سیدھی ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی لیکن سویانگ کا جواب تھا کہ اسے داخلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بظاہر تو یہی لگا کہ بات وہاں ختم ہو گئی مگر اس کے بعد پیش آنے والا واقعہ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ شاید ابو کو اپنی اہانت کا احساس ہوا ہو کہ اتنی دیر اپنا سر کھپانے اور سویانگ کو سمجھانے کے باوجود' پرنالہ وہیں کا وہیں تھا۔ سویانگ کے اڑیل پن اور ضد کے ہاتھوں' اپنی مخفی توہین ابو سے برداشت نہ ہو سکی' بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا: ''پاگل لڑکی''

ان لوگوں کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں نا' اسی لئے یہ مسائل پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے' ابو غصے میں کہتے چلے گئے۔ ان کی نسل جنگ کی تباہ کاریوں سے گزری تھی' اپنے پیاروں کی لاشیں بکھری پڑی دیکھی تھیں' خوراک کی تلاش میں' نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے تھے۔ نہ جانے کس طرح کا گھر کا خرچہ پورا کیا جاتا تھا۔ انہی دنوں انہوں نے نائیلون کی جرابیں بنانے کی فیکٹری شروع کی تھی۔ اب وہ سویٹر ایکسپورٹ کرنے والی ایک فیکٹری کے مالک تھے۔ زندگی کے اس سارے عرصے میں انہوں نے کبھی بے فکری سے آرام کرنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ غرض انہوں نے اپنی پوری زندگی کی تاریخ دھرا دی۔ انہیں آج کل کے نوجوانوں کے الٹے سیدھے نظریات' بے فائدہ جلسے جلوس اور لایعنی سرگرمیاں بالکل پسند نہیں تھیں "میری نظروں سے دور ہو جاؤ" بالآخر وہ سویا نگ پر چیخ پڑے۔

ابو کا شدید غصہ اور ان کی لعن طعن سننے کے باوجود بھی' سویا نگ اسی طرح صوفے میں دھنسی بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ اکتاہٹ موجود تھی۔ شاید اس کی درماندگی نے' اسے کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے ابو کے رویے پر تکلیف ہوئی۔ وہ ہر بات کو مادی انداز میں لے رہے تھے۔ انہیں اپنے بچوں کے ذہنی اور روحانی اتار چڑھاؤ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا یا وہ اسے غیر اہم سمجھتے تھے۔ مجھے سویا نگ پر بھی غصہ آ رہا تھا' جو ابو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

میں نے سویا نگ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر اپنے ساتھ اوپر لے جانے لگی۔ وہ فوراً ہی اٹھ گئی اور جاتے جاتے ابو سے کہنے لگی "میرا خیال ہے' میں آپ کی مدد کے بغیر' بڑے آرام سے آگے بڑھ سکتی ہوں۔" یوں لگا جیسے ابو کی ساری باتوں کے جواب میں' یہ فقرہ کہنا' شاید اس پر فرض ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ابو نے اس کا یہ فقرہ نہیں سنا۔ وہ غصے میں ٹی وی کی آواز اونچی کرنے میں لگ گئے تھے۔ مجھے دوسرے گھرانوں کا تو علم نہیں مگر ہمارے ابو کو' ہر معاملے میں' اپنی بات منوانے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کچھ برداشت نہیں کرتے تھے۔

سویا نگ کے اوپری منزل پر جاتے ہی' میں نے کچن کا رخ کیا اور سوپ گرم کرنے لگی۔ ایک آدمی کا کھانا نکالا' چائے بنائی اور یہ سب ایک ٹرے میں سجا کر سویا نگ کے کمرے میں لے گئی۔ سیڑھیوں سے چڑھتے ہوئے مجھے میوزک کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ لیونارڈ کوہن کا وہی گانا تھا جو سویا نگ اکثر سنا کرتی تھی۔ دوسری منزل پر پہنچتے ہی' پس منظر میں

موجود گلوکارہ کی آواز' ایک دم تیز ہو کر' ہر طرف پھیلتی محسوس ہوئی۔ اس کے لہجے کا رنج اور کرب مجھے اپنے سینے میں گھستا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے سویا نگ کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔

''سویا نگ! دروازہ کھولو'' کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے دوبارہ دستک دی۔

کچھ لمحوں بعد' دروازہ کھل گیا۔ عورت کے گانے کی آواز زیادہ تیزی سے باہر آئی' ساتھ ہی سویا نگ کا تیوری چڑھا چہرہ بھی سامنے آیا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے بے جھجک پوچھا۔ پھر ٹرے پر اس کی نگاہ پڑی۔ اس کی نگاہوں میں چھپی حیرت کا مطلب یہ تھا کہ یہ حرکت اس کیلئے غیر متوقع تھی۔ بعد میں' مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس کیلئے کافی لانا چاہئے تھی۔ ''ماں نے مجھے کھانا لانے کو کہا تھا۔'' میں نے معمولی سی خفگی سے کہا اور اس کے انکار کرنے سے پہلے ہی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

بینک چھوڑنے کے بعد میں نے بڑے جوش و خروش سے سویا نگ کی سرگرمیوں کا پتہ لگانا شروع کر دیا۔ اپنی بینک ملازمت کو میں نے کبھی بھی مستقل نہیں سمجھا تھا' چنانچہ شادی سے پہلے' ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ میرے لئے عین فطری تھا۔ جیب خرچ مجھے گھر سے ملا کرتا تھا۔ چنانچہ پانچ سال کے دوران ملنے والی تنخواہ ریٹائرمنٹ پنشن اور مختلف بچتوں کے ذریعے میں نے چھ ملین ون کے قریب رقم جمع کر لی تھی۔ اپنے منگیتر کو پا لینے کے بعد' بینک میں میرے لئے مزید کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

میرے ایک انکل نے ـــــ جن کی ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل تھی ـــــ اپنے تعلقات کی بنا پر مجھے پانچ سال پہلے اس بینک میں رکھوا دیا تھا۔ میں نے وہاں خاصا تجربہ حاصل کیا اور بالآخر بینک کے ایک انتہائی اہم گاہک کی خدمت پر مامور کر دی گئی۔ یہ صاحب ایک پروفیسر تھے جو صرف پراپرٹی ٹیکس کی مد میں بیس ملین ون (کوریائی سکہ) ادا کیا کرتے تھے۔ پہلی دفعہ جب میں نے نوٹوں کے ڈھیر اپنے گرد دیکھے تو میرا سانس حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا اور بینک کا وقت ختم ہونے کے بعد' جب حساب کتاب کیا گیا تو میری حالت دیدنی تھی' نہ جانے میں کیا کیا حماقتیں کر چکی تھی۔ دس ہزار ون کے لگ بھگ فرق آ رہا تھا۔ میں اس فرق کو کسی طرح ٹھیک نہیں کر سکتی تھی چنانچہ نقصان کے عدد کا فارم پر کرنے کے بجائے' میں نے وہ نقصان' اپنی رقم سے پورا کر دیا لیکن ایک دن میرے اکاؤنٹ میں 360,000 ون کا فرق آ گیا۔ ہوا یہ کہ میں

نے 40 ہزار ون کے چیک کو چار لاکھ ون کا سمجھ کر ادائیگی کر ڈالی۔

میرے بعض ساتھی میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے کہ مجھے بینک کی نوکری کرنی ہی نہیں چاہئے۔ بعض کم پڑھے لکھے کیشیئرز سے میرا روزمرہ کا جھگڑا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں گریجویٹ ہونے کے ناطے' معاملات کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی لیکن ان دنوں میں مستقل نوکری کرنا چاہتی تھی چنانچہ میں ثابت قدم ہی رہی۔

کسی بھی دوسرے ادارے کی طرح' بینک کی بھی ایک چھوٹی سی سوسائٹی ہوتی ہے' میں نے وہاں یہ سیکھا کہ لوگوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ وہاں فراڈ کی کوششیں اکثر ہوتی تھیں۔ کوئی شخص' نظریں جھکائے بینک میں آتا' 9 لاکھ ون جمع کرا کے چلا جاتا۔ اگلے دن وہ بیوی سمیت آ دھمکتا اور کہتا کہ میں نے تو دس لاکھ ون جمع کرائے تھے۔ کبھی دو آدمی اکٹھے پیسے جمع کرانے بینک میں آتے' پیسے جمع کراتے اور کچھ ہی دیر بعد' کوئی آدمی وہی پیسے بینک سے نکلوانے اکیلا آ جاتا۔ اس قسم کے واقعات کی وجہ سے' کام کے دوران مجھے اچھی خاصی ٹینشن رہتی تھی۔ مزید برآں' بینک میں ہم ایک دوسرے پر بلاوجہ کی الزام تراشی بھی کر سکتے تھے۔ اس سے بچنے کیلئے' میں نے ایک مناسب فاصلہ رکھ کر' سبھی سے سلام دعا رکھی۔ بعض اوقات کوئی کیشیئر کسی گاہک کا ڈیپازٹ لیتے ہوئے ڈیپازٹ سلپ پر برابر والے کیشیئر کی مہر استعمال کر ڈالتی۔ اس طرح وہ ڈیپازٹ کو غائب کر کے سارا الزام اپنی ساتھی کارکن پر ڈال سکتی تھی۔ ایک کیشیئر نے اسی طرح چکر چلا کر' اپنے محبوب کے ڈوبتے ہوئے کاروبار کو بچانے میں کافی رقم لگا دی تھی۔ میں بھی کئی بار اس حرکت کا شکار ہوئی۔ اس کے بعد میں نے یہ عادت بنا لی کہ لمحے بھر کو بھی کھڑکی سے ہٹتی تو اپنی مہر ساتھ لے جاتی۔

موسیقی کی دنیا سے بالکل مختلف راستہ چننے کا سوچ کر ہی میں نے بینک کی ملازمت کی تھی لیکن بعض اوقات ذہنی الجھنیں مجھے پاگل کر دیتیں۔ اگر چاؤ سے میری ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتی یا بینک کی ملازمت کو لات مار دیتی۔

ابتداء میں' چاؤ مجھے بالکل نہیں بھائے۔ میں نے حقیقی دنیا میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ ان کا اسسٹنٹ منیجر ہونا ہی ہمارے درمیان فاصلے کا باعث رہا۔ میں لاشعوری طور پر بھی ان سے زیادہ گھلی ملی نہیں۔ ان دنوں میں ویسے بھی مردوں میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ ہوا یوں کہ میں جب کبھی کسی مشکل میں گھرتی' چاؤ میری بھرپور مدد کرتے چنانچہ میرے دل میں ان کیلئے قدر

پیدا ہونے لگی۔ بعض اوقات مجھے ان کی مدد کا علم ہوتا تھا اور بعض اوقات' ان کی مدد کا' مجھے پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ بہر حال' ملازمت پیشہ لوگوں میں' باہمی رومانس کچھ اسی انداز میں پروان چڑھتا ہے۔ جب بھی میرے کیش اور اکاؤنٹ میں فرق آتا اور میں بری طرح پریشان ہو کر جاتی۔ وہ مجھے یہ اندازہ لگانے کو کہتے کہ فرق کی نوعیت بڑی ہے یا چھوٹی۔ معاملے کو سمجھنے کا یہ طریقہ درست لائحہ عمل کی طرف لے جاتا۔ میں جب تک اپنا بیلنس درست نہ کر لیتی' وہ میرے پاس کھڑے رہتے۔ مہینے کے آخیر میں ہونے والا حساب کتاب خاصا طویل ہوتا تھا چنانچہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ شام کا کھانا بھی وہیں کھا لیا کرتے تھے کیونکہ اس رات ہمیں خاصی دیر بینک میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ ایسے مواقع پر چاؤ بھی ہمارے ساتھ آ جاتے۔ بس اسی طرح' ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے جس دن میں نے اپنے غصے پر قابو پا کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ تین لاکھ ساٹھ ہزار دن ـــــ جو میں غلطی سے کسی گاہک کو ادا کر بیٹھی تھی ـــــ بینک کو اپنے پاس سے ادا کروں گی' چاؤ نے مجھے ڈرنک کی پیشکش کی۔ یہ ایک طرح سے میری دوستانہ حوصلہ افزائی تھی۔

مجھے اپنے کام کے متعلق مہارت کا کوئی دعویٰ نہیں تھا لیکن اس دن تو مجھے خود سے نفرت سی ہو رہی تھی۔ میرے پندار کو گویا زبردست ٹھیس لگی تھی اور میں کسی کا بھی تشفی آمیز لہجہ سننے کیلئے تیار نہیں تھی چنانچہ چاؤ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی' میں نے انہیں بتا دیا کہ میں وضاحتی گوشوارہ بھرنے کے بجائے' اس نقصان کو اپنی جیب سے پورا کروں گی۔ جو کوئی بھی چالیس ہزار کے بجائے چار لاکھ دن لے گیا تھا' اس سے زائد رقم کی واپسی کی توقع عبث تھی۔ میں نے پوری ذمہ داری خود قبول کی اور اس کا بھگتان بھی۔

چاؤ نے میری مخالفت نہیں کی۔ انہوں نے یہ تجویز دی کہ چونکہ رقم خاصی بڑی ہے اس لئے اس کی ذمہ داری کو میرے اور سپروائزر کے درمیان بانٹ لیا جائے۔ (سپروائزر وہ خود تھے) میں نے یہ کہہ کر تجویز مسترد کر دی کہ اپنی بیوقوفی کے خمیازے میں' اپنے افسر کو تو کیا' میں اپنے والد تک کو شامل کرنا پسند نہیں کرتی۔

اس موقع پر' چاؤ نے' بڑے بھائی کا سا رویہ اختیار کر لیا اور کہنے لگے "تم محض اظہار تفاخر اور اپنے ہٹیلے پن کی وجہ سے بینک کی نوکری کر رہی ہو۔ پیانو بجانے کے بجائے' یہ رقم گننے کا خیال بھلا تمہارے ذہن میں آیا کیوں تھا؟ تم نے بینک کی نوکری کیلئے پیانو بجانے کا فنکارانہ

کام کیوں ٹھکرا دیا؟''

یہ سچ تھا۔ ہر بینک میوزک سکول کے ایک گریجویٹ کو ملازمت فراہم کرتا تھا جو اپنی عمومی ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ' خاص مواقع پر پیانو بجانے کا فنکارانہ مظاہرہ بھی کر سکے لیکن اپنے انکل کی وجہ سے' ایک مخصوص انتخابی عمل کے ذریعے' مجھے بینک میں کیشیئر کے کام کیلئے رکھا گیا اور میں نے ذہنی طور پر خود کو باقاعدہ تیار کیا تھا کہ مجھے محض ہائی سکول گریجویٹ سمجھا جائے۔

چاؤ کو میں نے صاف بتا دیا تھا کہ میں ایک خاص رقم جمع ہونے تک بینک میں کام کروں گی۔ہمیں چونکہ کسی کے ارادوں یا نیت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔اس لئے میں یہ رقم اپنی خودمختار زندگی کی تعمیر کیلئے جمع رکھنا چاہتی ہوں۔ مستقبل کا کیا پتہ؟ شوہر کا کاروبار ٹھپ ہوسکتا ہے' یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر' کسی اور کے ساتھ بھاگ جائے۔ یہ کہتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنے ذہن کا بوجھ چاؤ کے سامنے ہلکا کرتی رہتی ہوں۔اسی وقت مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ میں ان پر خاصا بھروسہ کرنے لگی ہوں۔

چاؤ نے مجھ سے کچھ پوچھنے کے بجائے' اپنا بے ساختہ قہقہہ روکنے کی بھرپور کوشش کی اور پھر بولے کہ اگر میں رقم اسی انداز میں ضائع کرتی رہی تو میں ریٹائرمنٹ تک شادی نہیں کر پاؤں گی۔ میں بھی اپنی ہنسی نہیں روک پائی اور جب انہوں نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی تو میں انکار نہیں کرسکی۔

سویا نگ کے مسائل کے حل کی کوشش کے دوران ہی' میں نے بینک کو اپنی شادی سے دو ماہ پہلے نوٹس بھی دے دیا۔بعض غیر متوقع پریشانیاں بھی سامنے آئیں۔ دوسری طرف' بینک کے چھوڑنے کی وجہ سے' مجھے اپنی بہن کیلئے زیادہ وقت وقف کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

مجھے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ سویا نگ کے ساتھ چلنا تھا۔ بداحتیاطی کام خراب بھی کر سکتی تھی۔ کئی سالوں سے ہمارے درمیان حقیقی یگانگت نہیں رہی تھی۔ سویا نگ نے اپنے گرد بہت ہی مضبوط خول چڑھا لیا تھا' جسے کھولنا یا توڑنا' بظاہر کار دارد ہی تھا۔

سب سے پہلے میں نے می یانگ جو سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سویا نگ کی سکول کے زمانے کی سہیلی تھی۔ پہلی دفعہ کالج کے داخلہ ٹیسٹ میں وہ بھی فیل ہوگئی تھی۔ دونوں نے باہمی دوستی کی وجہ سے ایک ہی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ یہ اور بات کہ ان کے ڈیپارٹمنٹ مختلف تھے اور پچھلے سال تک بہرحال می یانگ جو کا ہمارے گھر خاصا آنا جانا تھا۔کم از کم وہ

سویا نگ کے سکول چھوڑنے کے بارے میں پہلے سے واقف رہی ہوگی۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے گھر والوں کے بجائے دوستوں کے درمیان' باہمی افہام وتفہیم زیادہ بہتر ممکن ہے۔ اس عمر میں' میں بھی کچھ اسی طرح سوچا کرتی تھی۔

میں نے می یا نگ جو کا فون نمبر تلاش کیا اور فون کر ڈالا۔ پتہ یہ چلا کہ وہ فون تو پچھلے ایک سال سے بند پڑا تھا۔ ظاہر ہے' اس کا گھرانہ کہیں اور شفٹ ہو گیا تھا۔ صرف دو ماہ پہلے سویا نگ نے ماں جی کو بتایا تھا کہ وہ کچھ عرصہ می یا نگ جو کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ ماں نے سویا نگ پر بھروسہ کرتے ہوئے' می یا نگ جو کے گھر فون ہی نہیں کیا ہوگا' اسی لئے انہیں اس کے نئے نمبر کا علم بھی نہیں تھا۔ سویا نگ نے ماں کو بڑے خوبصورت انداز میں دھوکہ دیا تھا —— شاید وہ سکول چھوڑنے کے بعد سے' مسلسل ایسی حرکتیں کر رہی تھی۔

بینک کی ملازمت سے جان چھوٹنے کے بعد' اگلے دن میں بڑے مزے سے اپنے بستر پر لیٹی' نہ جانے کب کب کی' تھکان اتار رہی تھی۔ اچانک مجھے می یا نگ جو سے ملنے کا خیال آیا۔ میں نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا۔ اگر میں سویا نگ سے اس کی سہیلی کا نیا فون نمبر مانگتی تو ایسا لگتا جیسے کوئی جاسوس کسی مشتبہ آدمی کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک لمحے میں ان کی یونیورسٹی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ممکن ہے میری وہاں می یا نگ سے ملاقات نہ ہو پاتی' پھر بھی کچھ نہ کچھ معلومات تو مل ہی سکتی تھیں۔

میں سویا نگ کے کمرے سے گزرتی' سیڑھیوں کی جانب بڑھی تو وہاں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ دادی اور ہائی یا نگ کچن میں ناشتے سے دو دو ہاتھ کرنے میں مصروف تھیں۔ دادی ارغوانی رنگ کا بلاؤز پہنے ہوئے تھیں اور ان کے بالوں میں سنہرا ہیئر نیٹ لگا ہوا تھا۔ میں ان کے پاس بیٹھی تو خوشبو کے زبردست تھپیڑے نے میرا استقبال کیا۔ ان کا چہرہ بھی خاصا تروتازہ نظر آ رہا تھا۔ ابھی تین دن پہلے ہی' میں نے ہائی یا نگ کے ساتھ ناشتہ کیا تھا مگر مجھے ایسے لگا کہ نہ جانے کتنے عرصے بعد' میں اسے دیکھ رہی ہوں۔

''آج کوئی کلاسیں نہیں ہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔ میری آواز سن کر ہائی یا نگ نے اخبار پر مرکوز نظریں اٹھائیں اور میری جانب دیکھا۔ ''باجی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے بینک کی ملازمت چھوڑ دی؟ شادی کے بعد بھی' آپ یہ ملازمت جاری رکھ سکتی ہیں؟ بیکار رہنا تو ایک عذاب ہوتا ہے؟''

''بالکل صحیح!'' دادی اماں نے کہا ''اگر جاؤ تمہاری نوکری پسند نہیں کرتا تو تم اپنا تبادلہ کہیں اور کرا لو۔ اس جوانی میں کام کاج چھوڑ کر بیٹھ جانا' کوئی اچھی بات نہیں۔ فراغت آدمی کو کاٹ کھانے دوڑتی ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ شوہر تمہاری ضروریات کا خیال رکھے مگر اپنی معاشی آزادی کے بغیر' عورت برابری کا تصور نہیں کر سکتی۔'' دادی اماں جو کچھ کہتی تھیں' خود بھی اس کی بہترین مثال تھیں۔ مال جکوری میں ان کی وراثتی زمین تھی۔ اس کی قیمتیں بڑھیں تو انہوں نے اس کا ایک حصہ بیچ کر' کرائے پر دینے کے لیے کچھ جائیداد بنا ڈالی۔ ''آپ کو شاید علم نہیں' میں اب تک کچھ نہ کچھ اسی لئے کرتی رہی ہوں تاکہ مجھے کسی مرد کا تابع احسان نہ ہونا پڑے۔''

میں نے دادی اماں کو بتایا ''فکر نہ کریں' کوئی برا وقت پڑا تو میں اپنا پیٹ پال لوں گی' چاہے پیانو ہی کیوں نہ بجانا پڑے۔'' میں بے جھجک کہتی چلی گئی۔ شادی اور ملازمت کے مابین تعلق میرے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ ''سویا نگ ابھی تک نیچے نہیں آئی کیا؟''

ہائی یا نگ تیوری چڑھا کر بولی۔ ''اس نے تو ہمیں قدم قدم پر حیرت زدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا تم یہ چکر بازیاں' اتنی آسانی سے کیسے کر ڈالتی ہو؟ پتہ ہے اس کا جواب کیا تھا: مجھے ایک کام کرنا تھا سو کر دیا' تم جیسا' کتابوں کا کیڑا' یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا ـــــ آج کل کے بچے اتنے تیز طرار ہو گئے ہیں کہ کسی کو اپنے پروں پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے۔ وہ صرف خود کو صحیح سمجھتے ہیں۔''

''سویا نگ پر تو شیطان کا سایہ ہو گیا ہے۔'' دادی اماں نے اعلان کیا ''شیطان جو چاہتا ہے' اس سے کرا لیتا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میرے جاننے والے ایک پیر ہیں' میرے ساتھ ان کے پاس چلو' ممکن ہے وہ شفقت کا ہاتھ تمہارے سر پر رکھ دیں' یہ سنتے ہی وہ آگ بگولا ہو گئی۔

انتہائی لغو بات تھی۔ ''یسوع مسیح کا سایہ تو آپ کی ذات پر بھی ہے تو آپ خود ہی سویا نگ کے سر پر دست شفقت کیوں نہیں رکھتیں؟'' میں نے دادی ماں سے ترش لہجے میں سوال کیا۔ پھر میں ہائی یا نگ کی طرف متوجہ ہوئی ''اگر تمہارے پاس وقت ہو تو اگلے اتوار کو دونوں مل کر سویا نگ کو لنچ کیلئے باہر لے جائیں؟''

ہائی یا نگ پژمردہ لہجے میں بولی ''اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مجھے تو اس کی مکاریوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اب تو وہ مجھ سے بولتی ہی نہیں۔ البتہ' جب چاہے' میرے جوتے

پہن کر چلتی بنتی ہے۔ واپسی پر انہیں اتار کر ادھر ادھر پھینک دیتی ہے اور یہ جا' وہ جا' مٹی اور کیچڑ میں لت پت جوتے مجھے صاف کرنے پڑتے ہیں۔''

سچ یہ ہے کہ ہائی یا نگ کو جوتے جمع کرنے کا خبط ہے۔ درجن بھر ڈریس شوز اور شاید اتنے ہی مختلف اقسام کے جوتے ہوں گے اس کے پاس۔ جوتوں پر وہ خاصی فضول خرچی کرتی ہے لیکن یہ بات میں پہلی دفعہ سن رہی تھی کہ سویا نگ اس سے مانگ کر جوتے پہنتی رہی ہے۔

''تو کیا ہوا؟ تمہارے پاس اتنے سارے جوتے ہیں۔'' میں نے پیار سے اسے ڈانٹا۔

''لیکن سویا نگ کے پاس بھی تو اپنے جوتے ہیں؟''

''اس کے خیال میں تم اس کی سہیلی بھی تو ہو' اسی لئے وہ بعض اوقات بے تکلفی سے تمہیں تنگ کر ڈالتی ہے۔ مجھ سے تو اس نے کبھی جوتے نہیں مانگے۔'' میں اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بڑبڑائے جا رہی تھی'' بہتر بات یہ ہوتی کہ ہم جتنے ایک دوسرے کے قریب آئیں' اتنا ہی زیادہ اپنے طور طریقے سنواریں۔

اس صبح' سویا نگ کے بارے میں' میں نے ماں جی سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ ماں سمجھتی تھیں کہ سویا نگ چاہے نہ چاہے' ہمیں اسے دوبارہ سکول میں داخل کرانا چاہئے لیکن میرا خیال تھا کہ ہمیں اس کی سوچ کا احترام کرنا چاہئے۔ سویا نگ نے سکول چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا' ہم اسے داخل کرا دیتے ہیں' تب بھی وہ سکول نہیں جائے گی۔ ''اگر یہی کرنا ہے تو سب سے پہلے ہمیں سویا نگ کو اپنے نقطہ نظر کا قائل کرنا پڑے گا اور بہتر بھی یہی ہوگا۔'' میں نے کہا پھر ماں جی کو سمجھانے لگی کہ فی الوقت ہمیں سویا نگ کو چھیڑنا نہیں چاہئے' وہ جو کرنا چاہتی ہے' اسے کرنے دیا جائے۔ بیس سال کی عمر تک کے بچوں میں سمجھ بوجھ' کسی تیز دھار چاقو کی طرح کی ہوتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ سویا نگ کو اس مرحلے میں پریشان نہ کریں اور زندگی میں' اسے اپنی مرضی کا راستہ اختیار کرنے دیں۔

ماں جی ابھی تک اس کے دوبارہ داخلے پر مصر تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ سویا نگ نے بڑے بے ہودہ انداز میں سکول چھوڑا تھا اور اس کا ردعمل بھی انتہائی نامعقول تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ آج کل کے نوجوان' اپنے جذباتی پن میں حد سے زیادہ ردعمل کے ذریعے' اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ ہر جگہ یہی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ مجھے لگا کہ وہ میری بات کو سمجھ رہی ہیں۔ میں نے خود کو' عمر کے اس حصے میں لا کر' دیکھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ماں جی سے ذہنی ہم آہنگی

پیدا کرنا ناممکن بھی نہیں تھا۔ آخر کسی زمانے میں ''نامعقول باغی'' کے جیمز ڈین کی' وہ زبردست ''فین'' رہ چکی تھیں۔

اسی صبح میں می یانگ جو کی تلاش میں' سویانگ کے سکول گئی۔ کیمپس میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک پرانی پتھریلی عمارت دکھائی دی۔ اس کی اٹھان میں' کسی دیوی کا سا تقدس اور حسن تھا۔ باہری دنیا سے اس کا کوئی میل ہی نہیں تھا۔ مجھے اردگرد کا ماحول انتہائی روشن اور متبرک لگا۔ کئی سال بعد' میں کسی تعلیمی ادارے میں آئی تھی اور میرے دل میں عجیب وغریب جذبات کا طوفان سا اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔

تقریباً' گیارہ بجے میں تاریخ کے شعبے میں پہنچی۔ میں نے سب سے پہلے کلاس شیڈول پر نظر ڈالی۔ خوش قسمتی سے می یانگ جو کا ایک اہم پیریڈ ابھی شروع ہوا تھا۔ میں نے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک مدھم سی روشنی والی راہداری کی طرف میری توجہ مبذول ہوگئی۔ کلاسوں میں بچوں کے شور غل اور آنے جانے کی آوازیں میرے کان میں پڑ رہی تھیں۔ میں یونہی اٹھ کر چلی گئی۔ ٹہلتے ٹہلتے باہر کی طرف آئی تو اپنے سامنے خوبصورت خوشبودار سرخ گلابوں کی کیاریاں دیکھ کر مبہوت ہوگئی۔ جگمگاتے سورج تلے' سرخ گلاب—— حد نظر تک—— گویا خون کا چھڑکاؤ کرتے نظر آئے۔ میں بری طرح حواس باختہ ہوگئی۔

پھولوں کی کیاریوں کے بائیں جانب ایک گوشے پر میری نظر پڑی۔ انجیر کے درخت کی چھاؤں میں سے ہوتی' میں وہاں جا پہنچی' دو نوٹس بورڈ سامنے لگے تھے جن پر مختلف پوسٹرز اور نوٹس آویزاں تھے۔

مصنوعی قدریں' عوام پر ظلم وستم' ضمیر کی آواز

آرتھر ملر کی ''کروسیبل'' کی ٹکٹوں کی ایڈوانس بکنگ۔

''تکنیکی آزادی یا تکنیکی محتاجی'' پر تھیسز پیش کرنے کا اعلان۔

یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز کے آغاز کے تیس سال پورے ہونے پر' مشرق کی عظیم سرزمین کا میلہ جمہوریت' عوام اور کوریا کی قومی آزادی کی جانب سے تقریب ہم آہنگی۔

طلبہ! کیا آپ کو ایک نئے دور کی آواز سنائی نہیں دے رہی؟

وارننگ! اسے ہٹانا نہیں' ان لوگوں سے چوکنے رہو' جو ہمارے ادارے پر حملہ کر سکتے ہیں۔

نیم عالمانہ طرز تحریر میری توجہ بار بار اپنی طرف مبذول کرا رہا تھا۔ لفظ مجھے خون میں

نہائے ہوئے لگے۔ کسی لمحے دہشت زدگی مجھ پر سوار نظر آئی ور کسی لمحے زبردست جوش اور ولولہ میرے دل و دماغ پر حاوی ہونے لگا۔ یہ جگہ تو کسی معبد کی طرح مقدس اور مخصوص روایات کی حامل تھی۔ یہاں آنے اور رہنے والوں کو بعض خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ یہ اور بات کہ اس احاطے سے باہر قدم نکالتے ہی وہ سب رعاتیں لمحہ بھر میں ختم ہو جاتیں اور ان کے دشمن' ان کے جواں خون کے پیاسے ہتھیاروں سمیت' ان کے استقبال کیلئے موجود ہوتے۔

بنچ پر بیٹھے ہوئے مجھے گٹار کی آواز سنائی دی۔ موسیقی غالباً کسی ہسپانوی رقص کی تھی مگر تھی بہت سرد اور پیچیدہ۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس سے طلبہ کی ہنسی مذاق کی آوازیں بھی کان میں پڑ رہی تھیں۔ اونچی ایڑی کے جوتے اور کھلے ڈلے کپڑے پہنے ایک لڑکی تیزی سے میرے پاس سے گزری۔ اس کے کانوں میں مضحکہ خیز حد تک لمبے آویزے پڑے تھے۔ شاید یہ بھی نوجوانی کا اپنا انداز ہوگا۔

گٹار کی سریلی موسیقی کو بے توجہی سے سنتے ہوئے اور اردگرد کے منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے' یکا یک مجھے ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ شاید سر پر آئی ہوئی اپنی شادی کا کوئی خیال تھا؟ نہیں' یہ بات نہیں تھی۔ اگر میری روح بہار کے موسم میں زخمی نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں اپنے اردگرد موجود فطری حسن کے ایک ایک رخ سے تمام زندگی' اسی طرح حظ اٹھانے کی تمنا کرتی۔ میری دلی آرزو ہوتی کہ موسم بہار کسی شفاف سبز غبارے کی طرح ہمیشہ میرے ماحول میں تیرتا رہے اور میرے گزرتے لمحات دنیا کی سب سے خوبصورت اور لازوال یادیں کہلائیں۔

کلاس ختم ہوتے ہی' می یانگ جو کو ڈھونڈنے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ حواس باختہ ہوگئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے ملنے آئی ہوں تو غالباً اس کا ذہن اس ملاقات کے سبب کا کھوج لگانے میں جت گیا۔ میں نے می یانگ جو کو لنچ کرانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ہم سکول سے نکل کر مغربی طرز کے ایک ریستوران میں جا پہنچے۔

ہمارے بیٹھتے ہی می یانگ جو نے سویانگ کے بارے میں دریافت کیا۔

''تم کتنا عرصہ پہلے اس سے ملی تھیں؟'' میں نے جوابی حملہ کیا۔ اس کے ٹیلیفون نمبر کی تبدیلی ابھی تک میرے ذہن میں تھی۔

''کچھ مہینے پہلے ـــــ شاید فائنل سے پہلے۔''

''ٹھیک ہے' سویانگ ان دنوں تمہارے گھر پر ہی تھی۔ تم نے ہمیں فون بھی کیا تھا؟''

میرے سر پر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ شکر ہے' سویانگ نے اس معاملے میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔

''ہاں ـــــ وہ صبح کوئی چار بجے چلی گئی تھی۔ دراصل وہ کرفیو کی وجہ سے' مجبوراً میرے پاس رہ گئی تھی۔

''کرفیو؟ لیکن آج کل تو کوئی کرفیو نہیں ہے۔''

''لیکن صبح چار بجے کا وقت ایکشن لینے کیلئے انتہائی ڈرامائی اور مؤثر ہوتا ہے۔'' می یانگ جو نے مذاقاً کہا۔

''ہم دونوں ساری رات بیٹھی باتیں کرتی رہیں لیکن کسی بھی مسئلے پر ہم متفق نہیں ہو سکیں۔ چار بجتے ہی سویانگ وہاں سے بھاگ لی۔ یوں لگا جیسے ایک لحہ مزید رکنا بھی اس کیلئے مشکل تھا۔ ''میں جا رہی ہوں'' اس نے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سیدھی چل دی۔ خاصی تنک مزاج لگتی ہے' ہے نا؟'' می یانگ جو کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ آج کل نوجوان ہمارے اندازے سے آگے کی چیز ہیں' جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میرے بینک جانے تک' اس دن سویانگ گھر واپس نہیں آئی تھی۔ اس ملگجے اندھیرے میں صبح سویرے وہ کہاں جا سکتی تھی؟ میں یہ سن کر بھی فکرمند تھی کہ اس رات یہ دونوں سہیلیاں نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہی تھیں۔

''ہم لوگ سچائی کے متعلق اپنے نظریات پر بات کر رہے تھے۔'' می یانگ جو نے بتایا' سماجی ناہمواریوں کے مسائل میں اسے خاصی دلچسپی تھی۔ ملک کے عبوری صنعتی معاشرے کے ڈھانچے کی وجہ سے کسی ایک گروپ کی سیاسی یا معاشی فتح' دوسرے گروپ کے مفادات کو زک پہنچا کر ہی حاصل کی جا سکتی تھی۔ ہر سماجی طبقہ اپنے بالائی طبقے کے ظلم و ستم کی مزاحمت کرتا مگر اپنے نچلے طبقے پر وہی ظلم و جبر اختیار کرنا بالکل جائز سمجھتا تھا۔

اس صورتحال میں معاشرے کا مغلوب اور نادار طبقہ اگر اپنے حالات کو بہتر بنانے اور اپنی آمدنی بڑھانے کیلئے' کسی قانونی نظام کے قیام کیلئے جدوجہد کرے تو یہ عین فطری عمل ہوگا' کیونکہ کوئی دوسرا راستہ ممکن ہی نہیں۔

پھر می یانگ جو طلبہ کی تحریک کی جانب آ گئی۔ طلبہ مراعات یافتہ طبقہ ہوتے ہیں اور اس حیثیت میں انہیں سماجی ترقی کے عمل میں اپنا قائدانہ کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ لوگ معاشرے میں مناسب جگہ پا کر' مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اپنی آرام دہ زندگی کو بچانے کیلئے' ہر الٹی سیدھی حرکت

کرنے لگتے ہیں۔ وہ حقیقت پسند بن کر حقیقتوں سے سمجھوتہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب بتائیں طلبہ کے سوا اور کون ہوگا جو حقیقی لڑائی جاری رکھ سکے؟

''یہ تو اشرافیہ کی سوچ کا سا انداز ہے۔'' میں نے بحث کرنا چاہی۔

''یہ ترقی پسندانہ سوچ ہے۔'' می یانگ جو نے میری تصحیح کی۔ ''طلبہ نے یہ کیا کہ مجبور و مقہور طبقوں کو سماجی نظام کے تضادات کے بارے میں واضح کرنا شروع کر دیا اور یہی کردار انہیں ادا کرنا بھی چاہیئے تھا۔ محنت کش تحریک کا مرکزی حصہ تو مزدور ہی بنیں گے۔ طلبہ کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم تھا۔

اپنے نظریات کی صداقت اور آفاقیت کا مشاہدہ کرنے کیلئے می یانگ جو اور کئی دوسرے طلبہ، چھٹیوں کے دوران فیکٹریوں میں کام کرنے بھی گئے۔ می یانگ جو ایک ایکسپورٹ فیکٹری میں زیرِ تربیت کارکن کی حیثیت سے گئی۔ کالروں کی استری، بٹنوں کے کاج اور آستینوں کے کف لگانے جیسے مختلف کاموں کے عوض اسے اسی ہزار ون ماہوار تنخواہ مل رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ دوسرے کارکن ساتھیوں جیسے کام کرے اور ان کے ساتھ ہی ماحول کا لطف اٹھائے، چنانچہ وہ آج کل سنجیدگی سے سلائی مشین پر کام کرنا سیکھ رہی تھی۔

میں کھانے سے فارغ ہو چکی تھی مگر می یانگ جو، جذبات کی رو میں بہہ کر، معاشی ناہمواریوں پر دانت پیستی اور طلبہ تحریک کی باتیں کرنے میں اس طرح مگن رہی تھی کہ اس کا سارا کھانا پڑا تھا۔ میں نے کھانے کی جانب اس کی توجہ دلائی اور پھر وہ وقت اسے یاد دلانے لگی جب کالج میں داخلے کی دوسری کوشش کیلئے وہ محنت کر رہی تھی، اس کے لمبے بال، کسی دیہاتی لڑکی کے بالوں کی طرح پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔

''پتہ ہے، اس طرح کی جگہوں پر بورژوا انداز میں چھری کانٹے کا استعمال بڑا مضحکہ خیز لگتا ہے۔'' اس نے کہا اور دوبارہ اپنا سلسلہ کھول دیا۔ ''میں بس اسی قسم کی باتیں کرتی رہی تھی سو یانگ کے ساتھ۔ اس کا ردِعمل کچھ یوں تھا: کیا ان معاملات پر واقعی تمہیں اتنی تشویش ہے۔ مجھے تو یہ سوڈو ایلیٹ ازم لگتا ہے۔ ابھی تمہیں یہ تو پتہ نہیں کہ تم خود کون ہو اور تم چلی ہو عوامی ضمیر کو بلند کرنے اور عوامی تحریک کی حمایت کرنے۔'' پھر وہ مجھ سے کھل گئی۔ تحریکیں یقیناً اچھی ہوتی ہیں لیکن ان سے متعلقہ دوسری تکالیف اور تضادات کو بھی پوری طرح سمجھنا چاہیئے۔ تم سمجھتی ہو کہ تم اور تمہارے دوست ہی روشن خیال لوگ ہیں، انہی کے سامنے کوئی مخلصانہ مقصد ہے؟ اگر تم

یہی سمجھتی ہو تو اس بد دماغی کا کیا کیا جا سکتا ہے' تم بھی اتنی ہی سنگدل ہو' جتنا وہ نظام' جس کے خلاف تم نبرد آزما ہو۔

یہ ساری باتیں سن کر' میں اچھی طرح سمجھ گئی کہ اس رات سویانگ اور می یانگ جو کی گفتگو کس نہج پر چل رہی تھی۔ سویانگ نے ماں جی سے کہا تھا کہ اس کی اپنی اخلاقی قدریں زیادہ اہم ہیں اور وہ سکول سے خارج ہونے کا خطرہ مول لے کر بھی' ایک احتجاج میں شریک ہوگی لیکن اس وقت سویانگ کے سکول چھوڑنے سے زیادہ می یانگ جو میں پیدا شدہ تبدیلی مجھے زیادہ متجسس کر رہی تھی۔ میں مذاق مذاق میں کہنا چاہ رہی تھی کہ ایک سال میں اس کی ماہیت اتنی بدل گئی ہے کہ آمنے سامنے بیٹھنے کے باوجود میں شدید ''جنریشن گیپ'' محسوس کر رہی ہوں لیکن میں نے کہا یہ ''خوش قسمت ہو تم کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اپنی قدریں قائم کر چکی ہو۔''

می یانگ جو گوشت کا ٹکڑا کاٹتے کاٹتے رک گئی اور زیادہ پرجوش انداز میں بولی۔

''یہ اس طرح کی خوش قسمتی نہیں ہے جس میں ایک لاٹری ٹکٹ آپ کی جھولی میں بے پناہ دولت ڈال دیتا ہے۔ میرے لئے ایک راستہ کھل گیا کیونکہ میں سنجیدگی سے اس کی تلاش میں تھی۔'' ایک مختصر سی خاموشی کے بعد وہ پھر شروع ہوگئی۔

''جس سال میں کالج کے داخلہ ٹیسٹ میں ناکام ہوئی تھی' میرا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ روحانی آوارہ گردی میں لگ گئی لیکن جب میں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا اور کالج میں داخلہ لے لیا تو اپنے بارے میں سوچنا' میں نے بالکل چھوڑ دیا اور بعض اہم سماجی حقیقتوں کا ادراک کرنے لگی۔'' کیا خوبصورت اور مدلل انداز تھا اس کا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے شاباش دوں۔ آخر میں' میں نے اس سے پوچھا کہ کیا سویانگ کے سکول چھوڑنے کے بارے میں' اسے علم ہے۔

بالکل ـــــ سکول چھوڑتے ہوئے' اس نے مجھے بتایا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اگلے دن ہی اس نے سکول چھوڑنے کا فارم جمع کرا دیا۔''

''کب بتایا تھا اس نے تمہیں؟'' ''غالباً اپریل کے درمیان میں' میگ نولیا کے خوبصورت پھول اور پتے مرجھانے لگے تھے۔ اس دن ہوا بھی بہت خنک آمیز اور تیز تھی۔ سویانگ میگ نولیا کے درختوں کے سائے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ ٹھنڈ کے ناقابل برداشت ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ پژمردہ سا تھا۔ میں نے جب اسے زرد مرجھاتے پھولوں

کے درمیان بیٹھے دیکھا تو مجھے بہت دکھ ہوا' اس کا چہرہ' ظاہر ہے' ان پھولوں سے خاصا بڑا تھا لیکن ان مخصوص لمحات میں' وہ مجھے بہت چھوٹا لگا۔ بہرحال وہ دن تھا ـــــ جب اس نے مجھے سکول چھوڑنے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔''

سویانگ نے می یانگ جو کو بھی کم وبیش وہی باتیں بتائی تھیں' جو اس نے ہم سے کی تھیں' سویانگ کا کہنا تھا کہ وہ مصنوعی زندگی گزار رہی ہے۔ سکول اسے محض ڈھکوسلہ لگتا تھا اور وہ خود بھی اندر سے خود کو کھوکھلا محسوس کرتی تھی۔ کسی بھی چیز میں اسے کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔

یہ الفاظ ابھی تک میرے لئے لایعنی تھے۔ میں سویانگ کی باتیں غالباً ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر ہلایا اور پھر می یانگ جو سے پوچھا۔

''آخر سویانگ کیا چیز ڈھونڈنا چاہ رہی تھی؟''

''غالباً' وہ سچ کی تلاش میں تھی۔''

مجھے کچھ غصہ سا محسوس ہوا۔ پھر یاد آیا کہ می یانگ جو نے ابتداء میں ''سچ کے متعلق ہمارے نظریات'' کا ذکر کیا تو تھا۔ غالباً' یہ لفظ ''سچ'' ان کا مشترکہ ''نسب نما'' تھا۔ سچ! کتنا مبہم اور غیر واضح لفظ ہے یہ! سو وہ سچ کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ (سچ کوئی خوبصورت تتلی تو ہے نہیں!) یہ تو بالکل ایسا تھا جیسے وہ نرم اور لطیف ہوا کو پکڑنا چاہتی ہو۔ ایک سرد سی آہ میرے منہ سے نکلی۔ می یانگ کھانے سے فارغ ہوگئی تو میں نے ویٹرلیس کو کافی لانے کیلئے کہا۔ ویٹرلیس نے استفہامیہ انداز میں کافی کی مختلف اقسام گنوانا شروع کر دیں۔ میں نے ویانا کافی کیلئے کہہ دیا۔

''مجھے مغربی چیزیں پسند نہیں'' می یانگ جو نے کہا مگر مجبوراً اس نے موکا کافی کا آرڈر دے دیا۔ میں نے ایک تیکھی سی نگاہ می یانگ جو پر ڈالی اور اچانک مجھے سمجھ آگئی کہ اس دن صبح ہونے سے بھی پہلے سویانگ کیوں اس کے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ میری کافی آگئی' میں نے چسکی لیتے ہوئے کہا کہ اس سرد دن ہونے والی ملاقات' کیا ان کی آخری ملاقات تھی۔

می یانگ جو کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''ہاں'' پھر کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس نے انتہائی غیر متوقع بات کہہ ڈالی۔ ''میں نے بتایا تھا کہ میں گرمیوں میں ایک صنعتی ادارے میں کام کرتی رہی ہوں۔ جب یہ بات میں نے سویانگ کو بتائی تو اس نے بھی انتہائی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے بتایا کہ وہ بھی کسی بار میں کام کرنے کا سوچ رہی ہے۔''

کافی کی چسکی لیتے لیتے مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟''

''اس کا کہنا تھا کہ وہ ہوسٹس بننے جا رہی ہے۔'' یا نگ جو نے نظریں میز پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''اور شاید پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ کالج کے داخلے میں ناکامی کے بعد اس نے' کوئی مہینہ بھر ''نوڈل پیس'' میں ویٹریس کے طور پر کام بھی کیا۔''

''اس نے یہ بھی کر ڈالا؟ مگر کیوں؟'' میرا دکھ یقیناً میرے چہرے پر پڑھا جا رہا ہوگا۔

می یا نگ جو تھوڑی دیر کیلئے اپنے خیالوں میں کھو گئی تھی ''غالباً وہ بے مقصدیت کا شکار ہو گئی ہے۔ میں خود بھی کافی عرصہ اسی طرح بھٹکتی رہی ہوں ——''

میرے لئے یہ ایک زبردست ذہنی دھچکا تھا۔ نوڈل ہاؤس میں ویٹریس؟ اس کیلئے تو میں اسے معاف کر دیتی لیکن یہ تو میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ سویانگ بار میں ہوسٹس کا کام کرے۔ کیا وہ اسے بے مقصدیت قرار دے گی۔

ایک امیر گھرانے کی لڑکی کیلئے' بے دھڑک ایسا کام کرنا ممکن بھی ہوگا۔ می یا نگ جو نے طنزاً سویانگ سے کہا بھی تھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ''میں شاید یہ فقرہ نہ کہتی لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی یہ حرکت بے سوچی سمجھی سی لگی تھی۔'' می یا نگ جو کی یہ وضاحت میری پریشانی کو کم کرنے کے بجائے میرے ذہنی خلفشار کو کچھ اور بڑھا گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں فرنچ ڈیپارٹمنٹ میں آنے کا سوچ رہی تھی مگر یہ بات ذہن سے اتر گئی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ تم اس کے پروفیسروں سے ملنا چاہتی تھیں۔ وہ تو پیشہ ور لوگ ہیں' جنہیں اپنے مستقبل کے تحفظ سے غرض ہے اور بس! یہ تمہاری خوش قسمتی ہوگی اگر انہیں سویانگ کا نام بھی یاد آ جائے۔''

می یا نگ جو کا لہجہ خاصا تلخ تھا مگر میرا ابھی فرنچ ڈیپارٹمنٹ جانے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ میری اپنی یادداشت میں بھی ایسے ایک دو ہی استاد تھے' میوزک سکول میں' جن کی میں دل سے قدر کرتی تھی' ورنہ دوسروں سے تو بحیثیت انسان' شاید میں بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی۔ می یا نگ جو کا مشورہ تھا کہ فرنچ ڈیپارٹمنٹ میں سویانگ کی ایک قریبی دوست سے ملنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اگر آپ کو اپنے سوالات کی نوعیت کا علم ہی نہیں تو پروفیسروں سے ملنے کا فائدہ؟

چنانچہ میں نے اپنی ڈائری میں می یا نگ کا نیا ٹیلیفون نمبر اور سویانگ کی سہیلی شن کیا نگ آک کا نام لکھ لیا۔ میں نے غالباً اس کا نام پہلے بھی سن رکھا تھا۔

کیمپس کے بیرونی دروازے کے پاس می یا نگ جو نے رخصت ہوتے ہوئے کہا ''سویا نگ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ اپنے گھر والوں کو پسند نہیں کرتی لیکن اگر وہ گرم جوشی سے اس میں دلچسپی لینا شروع کر دیں تو غالباً اس کا ڈپریشن دور ہو جائے گا اور وہ اپنی پریشانیوں کی ڈائری اٹھا کر پھینک دے گی۔''

''پریشانیوں کی ڈائری؟'' میں کچھ الجھ سی گئی۔ می یا نگ جو اس اثناء میں جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے بال لہراتی' واپس چلی گئی تھی۔ میں گھر واپس آئی تو سویا نگ گھر سے جا چکی تھی۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ دادی اماں بھی گھر نہیں تھیں دوسری منزل پر مکمل سکوت طاری تھا۔ خزاں چپکے چپکے ماحول میں اپنے قدم جما رہی تھی۔

میں نے ایک دو بار سویا نگ کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور پھر نچلی منزل پر آ گئی۔ ماں جی کچن میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر' میں ٹی وی لاؤنج کی درازوں میں کمروں کی چابیاں ڈھونڈنے لگی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو؟'' ماں نے پوچھا۔

مجھے انہیں بتانا پڑا —— کمروں کی چابی کا گچھا ''میں سویا نگ کے کمرے سے اپنا ریکارڈ لینا چاہتی ہوں۔'' میں نے فٹافٹ وضاحت کی۔ زنگ آلود چابیاں کچن کی ایک دراز سے مل گئیں۔ سویا نگ کے کمرے کے علاوہ' ہر کمرے کی دو دو چابیاں تھیں۔

''کیا دونوں چابیاں اسی کے پاس ہیں؟'' ماں نے سر اٹھاتے ہوئے مشتبہ لہجے میں کہا۔

بلاشبہ سویا نگ نے یہی کیا ہوگا۔ ظاہر ہے' اپنے بہت سے راز چھپانے کیلئے وہ یہ کر سکتی تھی۔

میں چپ چاپ قریبی مارکیٹ چلی گئی اور وہاں سے چابی بنانے والے کاریگر کو بلا لائی۔ دروازہ تو آسانی سے کھل گیا مگر ڈپلی کیٹ چابی بنوانے کیلئے تالے کو عارضی طور پر وہاں سے لے جانا پڑتا۔ میں نے اسے اجازت دے دی اور وہ دو گھنٹے بعد واپس آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

میں تیزی سے سویا نگ کے کمرے میں گھس گئی۔ اس کی درازیں کھلی پڑی تھیں۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر مجھے وہ ڈائری کہیں نظر نہیں آئی۔ لکھنے کا پیڈ' پرانی ایڈریس بک' تصویریں' پوسٹ کارڈز' گیتوں کی کتاب اور نہ جانے کیا کیا اردگرد بکھرا پڑا تھا۔ بالآخر ڈائری مجھے —— محض اتفاقاً —— کتابوں کے ریک میں' کئی کتابوں کے درمیان نظر آ گئی۔ اس کی تمام کاپیاں ایک ہی سائز کی تھیں۔ صرف ان کے رنگ مختلف تھے۔ اورنج' سبز' نیلا' بھورا۔ سویا نگ نے

ڈائری کیلئے سب سے سادہ' براؤن رنگ کی کاپی چن رکھی تھی۔ پہلے چند صفحے اخلاقیات کے کسی کورس کے متعلق تھے۔ اگر میں نے اگلے صفحے کھول کر' انہیں بغور نہ دیکھا ہوتا تو میں اسے ایک عام سی کاپی سمجھ کر واپس شیلف میں رکھ دیتی۔

ڈائری لکھتے لکھتے' اس نے آدھی کاپی ختم کر دی تھی' ڈائری کے پہلے صفحے پر دو جون کی تاریخ لکھی تھی لیکن پتہ یہ چلا کہ سویا تنگ عرصے سے ڈائری لکھنے کی عادی تھی۔

میں نے پرانی ساری ڈائریاں جلا ڈالی ہیں۔ میں مکمل جرم' انتہائی مہارت اور چابکدستی کی قائل ہوں' ان ڈائریوں میں موجود' اپنے بچگانہ پن سے' مجھے خوف آتا ہے لیکن اب اپنے آپ پر قابو پا لینے اور ڈائری دوبارہ لکھنے کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے بچپن اور اپنی ذات کی دریافت اور اس کی جذباتیت' سب ختم! اس کے برعکس اب میں اپنے مقصد ——— سچ کی تلاش' سچ جو میری روح کی شکارگاہ کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے ——— پر بھرپور نظر رکھنے کی کوشش کروں گی۔

آج بھی مجھے اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے' کچھ ایسا درد ہے' رات کو سونے سے پہلے جب میں کمرے کی لائٹ بجھاتی ہوں اور خود کو نیند کی آغوش میں ڈالنے کی خواہش کے باوجود' جاگتی رہتی ہوں اور یہ درد مجھ پر سوار ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے تکیے کے نیچے سے ہارمونیکا نکالتی ہوں اور اسے بجانے لگتی ہوں۔ ایک گیت کی دھن' جو برسوں پہلے میں نے ہی بنائی تھی' میری یادوں کے زینے سے اتر آتی ہے ——— کچھ کچھ محلات جیسا! یہ گانا محل میں رہنے والی ایک لڑکی کے بارے میں تھا۔

اب میں خود ایک بند محل ہوں۔ دوسروں سے میں نے اپنا ہر تعلق توڑ ڈالا ہے۔ ایک زمانے میں' میں نے بہت سے دکھ محض اس لئے اٹھائے کہ لوگ مجھے سمجھ ہی نہیں پاتے تھے۔ لیکن اب میں اس پر ایک شاندار تبصرہ کر سکتی ہوں۔'' کیا یہ حقیت نہیں مجھے ''میں'' کے طور پر پہچانا اسی لئے جاتا ہے کہ میں دوسروں سے مختلف ہوں۔

4 جون۔ ہوئی چنگ کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ کافی دیر اکٹھے بیٹھے رہنے کے باوجود' اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہیں آئی۔ مجھ سے اس کا اجنبیت کا یہ تاثر برداشت نہیں ہوا تو میں نے اس کے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر پوچھا کہ وہ کس الجھن کا شکار ہے۔

''تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور میں کسی عورت سے اس بارے میں

بات نہیں کرنا چاہتا۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ اتنے ترش لہجے میں' اس نے کبھی بات نہیں کی تھی۔

میرے ماتھے پر پڑنے والے بل' اس نے دیکھے تو فوراً بھانپ گیا۔ اپنے دفاع کیلئے اس نے سگریٹ کا ایک زوردار کش لگایا اور اس کا چہرہ سگریٹ کے دھوئیں کے پردے میں چھپ گیا۔ ''تم مجھے اچھی طرح نہیں جانتیں' میں بڑا ڈرپوک آدمی ہوں' محبت کرنے والی عورتیں تو اندھی ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا: ''میں ان جگہوں کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہوں جہاں تمہیں چوٹ لگتی ہے یا تم جھنجھنا جاتے ہو' کسی مائیکروسکوپ کی طرح' یہ ہوتی ہے محبت۔''

اس لمحے' ہوئی چنگ کے ہونٹ پر موجود سفید ستارہ' کسی سمندری مرغابی کی طرح' نیچے گرتا محسوس ہوا' لگا جیسے یہ سب محض لفظوں کا کھیل ہے' اف میری تنہائی!

9 جون۔ اس صبح دادی اماں کی سالگرہ کے سلسلے میں آنے والی ادھیڑ عمر نوکرانیوں کو دیکھ کر' مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں اپنا ناشتہ پورا کئے بغیر ہی کچن سے نکل آئی۔ ان کی بدقسمتی ان کے چہروں سے ظاہر تھی۔ کمینہ پن ان کے لہجوں میں بسا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک عورت' کیک بناتے ہوئے بولی ''میرے شوہر کا تعلق پیانگ ینگ سے ہے' اپنے زمانے میں' وہ یہ کیک مجھے بہت کھلایا کرتا تھا۔'' اس وقت وہ عورت وہی کیک کسی اور کے کچن میں بناتے ہوئے یہ جتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی زندگی کتنی خوشگوار گزری ہے۔ وہ ہماری میز پر جا بیٹھی اور اپنی منحنی آواز میں کہنے لگی۔ ''لگتا ہے' مجھے کوئی چمچہ نہیں ملے گا——''

دادی اماں' چرچ سے آنے والی کچھ پرانی سہیلیوں سے کہہ رہی تھیں: ''کاش میں ایسے گھر میں رہی ہوتی جہاں یہ کمبخت تالاب نہ ہوتا۔ مچھلیوں کی افزائش بھی نری مصیبت ہے۔''

دولت مند طبقہ پہلے زندگی کی حقیقتوں سے کٹتا ہے اور پھر اپنی تنہائیوں سے فرار کی کوشش میں خود پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں بناؤ سنگھار کرنا اور گلابی چھتری ہاتھ میں لئے' اتراتے پھرنا—— آخر کیا مزا آتا ہے ان بوڑھی عورتوں کو؟ بہرحال ایک بات ہے' تنہائیوں کے ناگ دیوتا کی شعلے برساتی زبان کے سامنے بھی' یہ عورتیں خودکشی کی ہمت نہیں کر سکتیں۔

دلچسپی اور تناؤ کی ملی جلی کیفیت میں' میں سویانگ کی ڈائری کا پورا پہلا صفحہ پڑھ گئی۔ اگر میں پڑھتی چلی جاؤں' میں نے سوچا' تو سویانگ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگا۔ سو میں

ڈائری میں محو ہو گئی۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا اور چابی بنانے والا واپس بھی آ گیا۔ ڈائری کیا تھی' ایک زبردست خزانہ تھا۔ سویا نگ کے کردار اور خیالات کے بہت سے رخ سامنے آئے۔ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں' اپنے بوائے فرینڈ ہوئی چنگ اور اپنے گھر والوں کے متعلق کیا سوچتی ہے۔ اس کا صحیح مشاہدہ ہوا! کچھ جگہوں پر اس نے گھر والوں کے بارے میں اچھی خاصی تصویر کشی کر رکھی تھی' اسکے بعض تبصرے خاصے اذیت انگیز تھے۔

پہاڑوں اور ندیوں میں تبدیلی نہیں آتی: وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ' میرے گھر والوں کی لعن طعن بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اپنے کمرے سے باہر ننگے پاؤں پھرنا نہیں چاہتی' یہاں تک کہ گھر کی راہداری میں بھی نہیں۔

یہ فقرہ بھی درج تھا: کسی کا کہنا ہے کہ انسان بہرحال جانور ہی تو ہے۔ ماں جی اور ابو بھی جانوروں جیسا ایک جوڑا ہیں۔

میں نے ایک دفعہ ابو کو یہ کہتے سنا تھا کہ ان احتجاج کرنے والے نوجوانوں کو موت کی سزا دینی چاہئے۔ سویا نگ نے یہ بات سن کر' بمشکل خود پر قابو رکھا تھا اور ماں جی چپ چاپ ابو کیلئے گاجر کا جوس نکالنے میں لگی رہی تھیں۔

ابو نے شاید یہ الفاظ اس لئے کہے ہوں کہ ایکسپورٹ بزنس میں بے تحاشا مندے سے ان کا دماغ خراب تھا۔ بہرحال وجہ جو بھی رہی ہو۔ ماں جی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ تو بس انہیں گاجر کا جوس پلانے میں لگی رہتی ہیں۔ کیا نگ آ ک نے' ہمارے گھر آنے کے بعد' ایک دفعہ کہا تھا ''بڑی شان سے رہتے ہیں تمہارے والدین'' پھر شاید احساس کمتری کے زیر اثر' اس نے بات بدل کر' اپنا سوال دھرایا۔ ''تمہارا گھر خاصا بڑا لگتا ہے' ہے نا؟'' اگر بڑائی کا تصور اتنا اہم ہے تو کاش کوئی بڑا لمبا تڑنگا دیو کہیں سے نمودار ہوتا اور مجھے' اس پنجرے سے نکال کر' اپنے ہاتھوں میں دبوچے کسی نامعلوم اور دور افتادہ مقام پر لے جاتا۔

پھر سویا نگ نے ابو کی سویٹر فیکٹری کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار کیا تھا جو شاید موجودہ نئی نسل کے ذہن کی صحیح عکاسی تھے: اب تک کی میری زندگی مادی طور پر بڑی آسودہ گزری ہے' کوئی پریشانیاں نہیں دیکھیں میں نے' اس کیلئے ابو کا شکریہ لیکن اگر میں اسی چیز کی می یا نگ جو کی نظر سے دیکھوں تو یہ سب کچھ تو مزدوروں کے خون اور پسینے کا پھل ہے۔ میں نے ان سے چھین لیا ان کی محنت کا پھل۔ شاید یہ بات ہی صحیح ہے۔ یہ تو امریکہ کی دولت کی طرح

ہے جو کالوں کا خون چوس کر حاصل کی گئی تھی۔ خوشحالی کے پیچھے' کہیں نہ کہیں اس کے شکار بھی واضح نظر آتے ہیں۔

بہرحال یہ ابو کی مہربانی ہے کہ میں پیٹی بورژوا ٹھاٹھ باٹھ سے رہ رہی ہوں۔ مجھے تو مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے مکان دیکھ کر ہی خوف آتا ہے' نہ جانے وہ وہاں کیسے رہتے ہیں؟ فی الحال اس مسئلے کو پھر کبھی کیلئے اٹھا رکھتی ہوں۔ اس کے بارے میں سوچنے سے بھی میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

گھر والوں کیلئے سویا نگ کی ناپسندیدگی کے جذبات نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارے گھرانے کا کوئی بڑا مسئلہ بھی ہے —— ہائی آ ک کے سوا' وہ دادا کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ کسی نوجوان رقاصہ کے ہاں جنم لیا تھا اس نے' وہ ہمارے گھر کے آدھے تہہ خانے میں رہا کرتا تھا اگرچہ میں اسے چچا ہی سمجھتی تھی مگر وہ عمر میں سویا نگ سے بھی چھوٹا تھا۔ کالج کے داخلے کے ٹیسٹ میں وہ بھی فیل ہو گیا تھا۔ اس کے کمرے سے آنے والی ڈھولک کی وحشیانہ آواز اور اس کے کپڑے میں ہر دم بستی بدبو کی وجہ سے' ہم لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ لڑکا گویا ہمارے گھر کیلئے کلنک کا داغ تھا۔

میں نے بارہا یہ محسوس کیا تھا کہ ماں جی اور ابو کے شاندار تعلقات میں جنسی ہم آہنگی بنیادی نکتہ تھا لیکن اس حقیقت کا لفظوں کی شکل میں نظر کے سامنے آنا' سویا نگ کا یہ تجزیہ کہ ان کی یکجائی محض حیوانی جبلت کے تحت تھی —— خاصا دہشت ناک تھا۔

می یا نگ جو نے جس ڈائری کو ڈپریسنگ کہا تھا' میرے لئے وہ حیرت انگیز انکشافات کا پلندہ تھی۔ دو فقرے آئسی روڈ نامی اس بار کے متعلق بھی تھے' جس کا تذکرہ می یا نگ جو نے کیا تھا اور غالباً سویا نگ وہاں کام کرتی رہی تھی۔ آئسی روڈ کے نام میں ہی سویا نگ کو کشش محسوس ہوئی ہو گی۔ اس نے بار کی مالکہ کے بارے میں لکھا تھا کہ اس کا ٹمپریچر —— عمومی جسمانی حرارت کے مقابلے میں —— ہمیشہ زیادہ رہتا تھا۔ وہ کسی پیشہ ور نام رکھنے والے کے پاس گئی تھی۔ اس نے اس کا جو نام تجویز کیا اس میں بنگ —— بمعنی برف —— بھی شامل تھا۔

مگر میں بھی تو ہوں جس کا جسمانی ٹمپریچر ہمیشہ زیادہ رہتا ہے۔ میرا خون ہمیشہ گرم رہتا ہے اور جب یہ اکٹھا ہو کر میرے دماغ میں آتا ہے تو بڑا خوفناک درد ہوتا ہے —— لگتا ہے

کسی لمحے بھی یہ پھٹ جائے گا۔ اگر میں بھی اپنے نام میں پنگ شامل کرسکوں تا کہ میرے سر میں جمع خون بھی ٹھنڈا پڑ جائے تو کتنا اچھا لگے۔ پنگ یانگ —— منجمد بھیڑ —— ٹھٹھر کر مر جانے والی بھیڑ ——

آئسی روڈ بار میں یہ تھا سویانگ کا پہلا دن۔ بار میں گاہکوں کا رش نہیں تھا۔ لگ یہ رہا تھا کہ سویانگ کو کسی میز پر میزبانی نہیں کرنی پڑے گی۔ نیچے ان دعاؤں کی تفصیل تھی۔ عجیب و غریب دعائیں' جو بار کی روایت کے مطابق اس نے کئی بار دل ہی دل میں پڑھ ڈالیں۔

دس بجے ایک ہوسٹس نے مجھ سے کہا کہ میں کسی حیل و حجت کے بغیر' اس کے کہنے کے مطابق عمل کرتی جاؤں وہ مجھے ایک جگہ لے گئی جہاں پہلے ہی کافی عورتیں جمع تھیں۔ ایک عورت نے اپنی ہتھیلی پر نمک ڈالا اور اسے کھا گئی۔ پھر سبھی عورتوں نے باری باری وہ عمل دہرایا۔ میں بھی اس عجیب سی رسم میں شریک ہوگئی۔

رسم کے بعد میرے کانوں میں دھیمی دھیمی سی آواز پڑی' غالباً وہ کچھ یوں تھی' آج ایک نئی لڑکی نے کام شروع کیا ہے اور آج ہی گاہک نہیں آ رہے۔ لگتا ہے جیسے سب نے یہاں سے دور رہنے کا تہیہ کر لیا ہے' مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ان عورتوں نے نمک کھا کر' گویا —— کسی مچھلی کی طرح —— خود کو گلنے سڑنے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

اگلے دن سویانگ نے انتہائی تیز اور بھدے انداز میں لکھا تھا۔

''میں بہت ڈپریس تھی اس لئے خود کو شراب میں ڈبو دیا'' اس کے بعد تین دن تک ڈائری نہیں لکھی گئی۔ اس کے بعد' اس نے جسم فروشی کے بارے میں کچھ فقرے لکھے تھے۔ غالباً اس نے یہ کسی کتاب سے نقل کئے تھے۔

یہ غالباً انسانی فطرت ہے اور بہت سے جنس زدہ لوگ خود کو اس سے بچا نہیں سکتے' اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ جسم فروشی کے دھندے کو ختم نہیں کیا جا سکتا لیکن جسم فروشی فطرت کا عطیہ نہیں بلکہ ایک سماجی ضرورت کی کارگزاری ہے' جنگ اور معاشی بدحالی کے دنوں میں یہ دھندا خوب پھلتا پھولتا ہے اور عورتیں بہرحال اس کا شکار ہوتی ہیں۔

بہرصورت جنس کی خاطر عورت کو محض ایک چیز —— غیر انسانی چیز —— سمجھ لینا خاصا ناخوشگوار اور تکلیف دہ احساس ہے۔ نالی کے ایک کیڑے نے' میرے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر مجھے کچھ رقم دینے کی کوشش کی۔ میں نے فوراً ہی نوٹ باہر نکالے اور اس کے سامنے پرزے

پرزے کر کے اڑا دیئے۔ می یانگ جو غلط کہہ رہی تھی کہ میرا ہوسٹس بننا' ایک امیر گھرانے کی لڑکی کا محض فوری ردعمل تھا اور نہ ہی میں کوئی گری پڑی لڑکی ہوں جس سے اپنی جوانی سنبھالی نہ جا رہی ہو۔ مجھے نچلی ترین تہہ تک گر جانے دؤ وہاں' جہاں تک پہنچنا میرے لئے ممکن ہو۔

میں اہم ترین چیز کیا کرنا چاہتی ہوں—— میں صرف اتنا کرنا چاہتی ہوں—— میری طبقاتی سوچ' میرے اندر کی بورژوا ذہنیت بری طرح ٹوٹ پھوٹ جائے۔

میرا جی چاہا کہ میں ڈائری کو بند کر کے پٹخ دوں۔ میں ان وحشیانہ حرکتوں کو سمجھنے سے قاصر تھی' زیادہ اذیت اس بات کی تھی کہ یہ سارے انکشافات خود سویانگ کے متعلق تھے' میں اس کی ڈائری کے حوالے سے' اس کے بارے میں کچھ جان کے' اس کے قریب ہونا چاہتی تھی لیکن اب—— یوں لگا ہمارے درمیان ایک طوفانی دریا بہہ رہا ہے' جسے پار کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سویانگ انتہائی تیز طوفانی ریلے میں بہہ گئی ہے اور میں—— الجھنوں کی دلدل میں اپنے پاؤں دیئے—— اسے پانی کے تیز بہاؤ میں تنکے کی طرح بہتے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔

میں سویانگ کے کمرے میں کوئی دو گھنٹے بیٹھی رہی' میں نے اس کی میز پر سے سگریٹ اٹھائی اور اسے پیتے ہوئے اپنے خیالوں میں گم ہو گئی۔ چابی بنانے والا واپس آ گیا' ڈپلی کیٹ چابی بن چکی تھی' جب دروازے کی ناب دوبارہ فٹ ہو رہی تھی' میں نے ڈائری کو اس کی جگہ پر رکھ دیا' کمرے میں تازہ ہوا کی آمد کیلئے کھڑکی کھول دی اور پھر اپنی وہاں موجودگی کے سارے نشانات مٹا دیئے۔ اب میں جب چاہتی' سویانگ کے کمرے میں آ جا سکتی تھی۔

بینک چھوڑنے کے باوجود' میرے پاس زیادہ فالتو وقت نہیں تھا' پیانو کو میں نے عرصے سے نظرانداز کیا ہوا تھا۔ اب میں روزانہ پیانو بجانے لگی' ہر ہفتے بینک جا کر' وہاں عورتوں کو سارنگی اور ستار کا سبق دیا کرتی۔ پیانو کی مشق بھی اس لئے جاری تھی کہ میں سوچ رہی تھی' شادی کے بعد پڑوس کے بچوں کو پیانو سکھاؤں گی لیکن سچ یہ ہے کہ میں گریجویٹ سکول کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پیانو میں مشاقی اور عبور حاصل کرنے کیلئے میرے دل میں ایک نیا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ پھر یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ صلاحیت کی بنیاد پر' اس سماج میں حاصل ہونے والا ایک اور تمغہ' ممکن ہے' زندگی کے کسی حصہ میں' میرے کام آ جائے۔

میرا زیادہ تر وقت' ماں جی کے ساتھ' بازار میں ان چیزوں کی شاپنگ میں گزرتا تھا' جو

شادی کے بعد میرے کام آنا تھیں۔ جاؤ سے بھی میری بلاناغہ ملاقاتیں جاری تھیں لیکن ان مصروفیتوں کے باوجود سویا نگ بدستور میرے سر پر سوار تھی۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں کیا نگ آ ک کا ٹیلیفون آ گیا۔

اسے قسمت ہی کہیے کہ سویا نگ اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ میں اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ چنانچہ کیا نگ آ ک کا نام سن کر مجھے دلی خوشی ہوئی' میں نے کیا نگ آ ک کو اپنے بارے میں بتایا اور اسے کہا کہ میں اس سے ملنے کے بارے میں سوچ رہی تھی' پھر براہ راست اس سے پوچھ لیا کہ کیا وہ کچھ وقت نکال سکتی ہے۔ کیا نگ آ ک فوراً راضی ہوگئی' اس نے ملنے کی وجہ تک نہیں پوچھی' وہ یونیورسٹی کے قریب واقع ایک کیفے ''لکڑ گھوڑے'' میں جز وقتی نوکری کر رہی تھی' اس نے مجھے وہیں آنے کو کہا۔

میں چھ بجے سے پہلے ہی کیفے پہنچ گئی' کیا نگ آ ک کو وہاں سات بجے تک کام کرنا تھا' اگر باتیں زیادہ طویل ہوگئیں تو ہم ڈنر کیلئے کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔ میں نے سوچا

کیفے ''لکڑ گھوڑا'' یونیورسٹی کے قریب' بیٹھنے کی یقیناً معقول اور صاف ستھری جگہ تھا۔ ماحول بھی خوشگوار اور پرسکون تھا' خاصی بڑی اور کھلی جگہ تھی مگر صرف تین میزیں خالی تھیں' میں کچن کی جانب منہ کر کے' ایک میز پر بیٹھ گئی اور ویٹریسوں کو آتے جاتے دیکھنے لگی' سبھی کالج کی لڑکیاں لگ رہی تھیں' سبز ایپرن پہنے بنی سنوری اور اجلی اجلی۔

میں نے ایک ویٹریس کو بیئر کی بوتل لانے کا آرڈر دیا اور شن کیا نگ آ ک کو بلانے کیلئے بھی کہا۔ اس نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھالی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ اندر سے ہی اس کی آواز کانوں میں پڑی ''بروک شل بیپ کیلئے انٹرویو۔''

لمبے بالوں والی ایک ویٹریس نے کچن میں کام کرتے کرتے' میری جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کی نوکیلی تھوڑی اور اس کا جگمگاتا مسکراتا چہرہ اسے واقعی بروک شیلڈ کی مشابہت دے رہا تھا' اس نے لمحے بھر کو مجھ پر ترچھی نظر ڈالی' پھر وہ مجھے پہچان گئی۔

مجھ سے ملنے میں' اس کی مرضی بھی شامل تھی مگر وہ اپنی شفٹ کے اختتام تک میرے پاس نہیں آ سکی۔ میں بیٹھی نئے آنے والے گاہکوں کی تعداد گن رہی تھی اور کیا نگ آ ک مسلسل کچن میں مصروف تھی۔ انڈے تل رہی ہے' کافی پھینٹ رہی ہے' کچھ اور ویٹریس بھی نظر آئیں جو بڑے مزے سے برتن دھونے میں لگی ہوئی تھیں' پھر میں دیواروں پر لٹکے ہوئے چینی پودوں کی

گنتی میں لگ گئی۔ اسی اثناء میں ایک نوجوان جوڑا میرے برابر کی میز پر آ بیٹھا۔ گنگھریالے بالوں والے آدمی کے ہاتھ مسلسل عورت کے کندھوں کے اردگرد جمے ہوئے تھے اور وہ بار بار اس کے رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھ رہا تھا۔ میں اس پریشان کن نظارے سے بچنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ کیا نگ آ ک میری میز پر آ گئی۔

''اتنی دیر انتظار کرنے پر معذرت'' اس نے دلکش انداز میں اپنی ناک چڑھائی۔

گھنٹے بھر کے انتظار نے مجھے تھکا دیا تھا'' ان لڑکے لڑکیوں کے درمیان مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔'' میں نے کن انکھیوں سے برابر والے جوڑے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' جو اب پوری طرح ایک دوسرے میں پیوست لگ رہے تھے۔

''اس کا برا نہ مانو' یہ جنریشن گیپ ہے ___ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں' اس لئے انہیں اوروں کی خبر ہی نہیں۔'' کیا نگ آ ک کی تیزی سے جھپکتی آنکھیں کہنا یہ چاہ رہی تھیں کہ دراصل عجیب تو میں ہوں۔ جنریشن گیپ کے متعلق اس کی رائے نے مجھے حیران کر دیا مگر میں فوراً ہی اصل مقصد کی طرف آ گئی۔ ''میں نے تمہیں انتہائی مصروف اوقات میں ڈسٹرب کیا۔'' ممکن ہے وہی مجھ سے بچنا چاہ رہی ہو مگر میں نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا۔

''ہم کچھ دیر تو بات کر ہی سکتے ہیں۔'' کیا نگ آ ک نے فوراً کہا پھر اس نے اپنی گھڑی کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے بتایا کہ ساڑھے سات بجے اسے کسی سے ملنا ہے۔ مجھے بے عزتی کا سا احساس ہوا مگر میں سویا نگ کے بارے میں جاننے کا معمولی سا موقع بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اس سے سوالات کئے' وہ خاموشی سے ان کا جواب دیتی گئی' جیسے اس کیلئے یہ سب کچھ متوقع تھا۔ جب میں نے سویا نگ کے سکول چھوڑنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے پہلے سے پتہ تھا بلکہ سکول چھوڑنے کا نوٹس جمع کرانے' وہ دونوں اکٹھے ہی آفس گئے تھے۔

''تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ سویا نگ نے سکول کیوں چھوڑا؟''

کیا نگ نے اس سوال کے جواب میں خود ایک سوال جڑ دیا'' کہیں ایسا تو نہیں کہ اس ماحول میں وہ رچ بس نہ سکی ہو؟'' میری حد تک تو یہ ایسی اہم بات نہیں کہ کوئی احتجاجی جلسوں میں شریک ہوتا ہے یا نہیں' شروع میں سویا نگ نے احتجاج میں حصہ لیا مگر بعد میں' وہ اس سے کنارہ کش ہو گئی۔ پھر اس کا ردعمل ملا جلا سا تھا۔ کبھی کبھار احتجاج میں شامل نہ ہونے کا اسے

دکھ بھی ہوتا تھا۔''

''کیا یہ احتجاجی مظاہرے اتنے ہی اہم ہیں؟ اس کی رائے میں' کیا اسے کوئی لڑاکا ہونا چاہئے تھا۔''

''میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ وہ ہر چیز میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔''

''کہیں وہ بیزاریت اور بیگانگی کا شکار تو نہیں ہو گئی۔'' بے سوچے سمجھے یہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے۔ مجھے شدید دکھ کا احساس ہوا' سویانگ کے سکول میں لڑکے لڑکیوں کو ہنستے مسکراتے اور گٹار بجاتے دیکھ کر مجھے لحاتی تنہائی اپنا شکار بنانے لگی تھی۔ پھر مجھے وہ زمانہ بھی یاد آیا' جب میں سب سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ صرف تنہائیاں میری ساتھی تھیں۔۔۔

میں جاننا چاہ رہی تھی کہ سویانگ اور کیانگ آ ک کا ملنا جلنا کتنا تھا۔ کیانگ نے بتایا کہ وہ گرمی کی چھٹیوں میں ہر دوسرے دن یہاں آیا کرتی تھی مگر ان دنوں وہ کبھی کبھار ہی یہاں آتی تھی۔ وہ غالباً دو ہفتے پہلے اسے ملی تھی۔ ''مزے کر رہی ہو گی کہیں۔'' اس نے کہا۔

ایک لحہ' میں چپ رہی۔ پھر سویانگ کے بوائے فرینڈ ہوئی چنگ کے بارے میں کیانگ سے پوچھنے لگی۔ میرا خیال ہے' بڑی بہن ہونے کے ناطے' اس کے ذاتی معاملات معلوم کرنا میرا حق تھا۔

''کیا وہ اس کے بارے میں بات کرتی ہے؟'' کیانگ آ ک نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں ایک مغربی طرز کے ریستوران ''سم تھنگ'' میں ملے تھے۔ وہ خود بھی اس وقت سویانگ کے ساتھ تھی۔ ''حیرت ہے' وہ اتنا عرصہ اکٹھے رہ گئے؟''

''اور یہ عرصہ ہے کتنا لمبا؟''

''موسم بہار سے ہی' جب اس نے سکول چھوڑا تھا۔''

حیرت زدہ قہقہہ میرے منہ سے نکلا۔ اب خزاں سر پر تھی۔ ان کے ملنے کی نوعیت اور جگہ کے اعتبار سے واقعی یہ عرصہ خاصا بڑا تھا۔ ایک بار پھر مجھے لگا جیسے میری تجسس آمیز گفتگو اسے پریشان کر رہی تھی' میں ہوئی چنگ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی لیکن کیانگ نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ وہ شعبہ کیمیا کا کوئی جونیئر لڑکا تھا۔

مجھے پتہ چلا کہ چانگ نو کے دوسرے بلاک سے معاملے کا کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ یہاں کالج میں داخلے کی تیاری کرانے والے مختلف تعلیمی مراکز موجود تھے۔ کیانگ آ ک کے مطابق

سویا نگ کا یہاں کافی آنا جانا تھا۔ کالج میں داخلے میں ناکامی کے بعد' وہ یہاں آنے لگی تھی۔ ریستوران میں لڑکے لڑکیوں کا خاصا رش رہتا تھا۔ یہ نوجوان' اپنی اپنی میزوں پر موجود انٹرکام کے ذریعے' ایک دوسرے کے ساتھ ''کالٹ انگ'' نامی کھیل کھیلا کرتے تھے۔

مجھے اس لفظ ''کالٹ انگ'' میں دلچسپی سی محسوس ہوئی مگر کیا نگ اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ مزید رکنا اور بات جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں اسے یہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کہ ہماری اس ملاقات کا تذکرہ سویا نگ سے نہ کرے۔ ''وہ آج کل کچھ زیادہ ہی آزاد رو ہو گئی ہے' میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا آزادی نوجوانوں کا استحقاق نہیں؟'' کیا نگ نے اپنے ایپرن سے آئینہ نکال کر' اس میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے گھر جانے کے بجائے' چاؤ سے بینک رابطہ کیا اور بتایا کہ میں اپنے کام سے فارغ ہو گئی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ بیس منٹ بعد عمومی معمول کے مطابق ''سنی سائیڈ ٹی روم'' پہنچ جائیں گے۔

''میں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔'' انہوں نے مزید کہا۔

چو کے محبت بھرے لہجے نے' مجھے اپنے حواس کو یکجا کرنے میں بڑی مدد دی۔ میں جلد از جلد ان تک پہنچ جانا چاہتی تھی سو میں نے کوانگ وامن تک کیلئے ٹیکسی لے لی۔

میں تو می یا نگ جو کے انقلابی خیالات پر ہی حیرت زدہ تھی۔ اب کیا نگ آ ک کی خوش دلی مگر ساتھ ہی اس کی اپنی ہی ذات میں محویت کا نظارہ کیا تو مجھے سویا نگ کی تنہائی بری طرح محسوس ہوئی' جیسے یہ تنہائی مجھے ہی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہو۔

—— میں می یا نگ جو جیسے لوگوں کے خیالات کی پیروی کرنے کی کوشش میں ہوں لیکن کیا نگ آ ک اور ہوئی چنگ جیسے لوگوں کا عمل اور ان کی سرگرمیاں بھی مجھے پسند ہیں —— سویا نگ نے ڈائری میں لکھا تھا ''میں عقلیت پسندی کا احترام کرتی ہوں لیکن اپنی جبلتوں کا گلہ نہیں گھونٹ سکتی —— مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی کی بھی پیروی نہیں کرنا چاہتی —— میں اپنی اس ہمہ جہتی پر بڑا فخر کیا کرتی تھی —— اس سے مجھے انسانیت کے پھیلاؤ کا احساس ہوتا تھا —— لیکن اب میں متلون مزاج ہو گئی ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ سویا نگ نے اپنی اندرونی کیفیات کبھی بھی ہوئی چنگ پر ظاہر نہیں کیں۔ وہ ''سم تھنگ'' کیفے میں ملے تھے۔ بلا وجہ ایک تلخ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آ گئی۔ مجھے بیس

سالہ سویا نگ پر بے پناہ ترس آیا۔ آزادروی نوجوانوں کا استحقاق نہیں بلکہ انہیں سزا تھی۔

میں بیس سال کی ہوئی تو ایک نا کتخدا روح کی طرح تھی۔ ماں جی مجھے خوب بنایا سنوارا کرتیں' کبھی منقش بلاؤز پہنا رہی ہیں اور کبھی چینی لباس۔ میرے گھنے بالوں کی خوبصورتی انہی کی دیکھ بھال کا نتیجہ تھی۔ وہ مجھے کسی مقدس دوشیزہ کی طرح سجایا کرتی تھیں مگر حقیقت میں' میں بڑی بدفطرت تھی' چھپ چھپ کر سگریٹ پیتی۔ پھر اس کی بو کو چھپانے کیلئے ایک میٹھی شہد چیری چبا جاتی اور معصومیت سے یوں سیٹیاں بجاتی پھرتی جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ابو ثقافتی معاملات میں شدید احساس کمتری کا شکار تھے۔ وہ مجھے ایک باوقار یونیورسٹی میں موسیقی کی طالبہ سمجھتے ہوئے' میری بہت قدر کرتے تھے۔ گھر میں بس ماں کے بعد' میری ہی چلتی تھی۔ میں عموماً ابو کی توقعات پر پورا اترتی تھی۔ شروع شروع میں مجھے باخ کی موسیقی کی باریکیوں کا اندازہ نہیں تھا۔ مجھے ابتداء میں وہ ریاضی کی طرح لگی' بے مزہ اور خشک۔ لیکن بس موسیقی سے مس کی دیر تھی۔ موسیقی کے استاد سے میں نے سنا کہ مجھ میں موسیقی کا بے پناہ ٹیلنٹ ہے۔ موسیقی کیلئے میرا جوش و جذبہ پورے کالج میں مشہور ہوگیا۔ میں نے پیانو کی مشق کی انتہا کر دی تھی۔ ہر سال' میرے سکول والے' ایک عام مقابلے کے ذریعے مجھے ''نوعمروں کے موسیقی کے قومی میلے میں شرکت کیلئے بھیجا کرتے' میں بڑی ہونہار طالبہ تھی' موسیقی سے میرا انتہائی گہرا اور زبردست تعلق تھا اگر میں تکنیک کے ساتھ شاعری کے لطیف تعلق کو بھی سمجھ جاتی' نقادوں کا خیال تھا' تو میری فنی مہارت اپنی بلندیوں کو چھو لیتی۔

لیکن مجھے پیانوسٹ کی حیثیت سے کامیابیوں کی طرف بڑھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ایک تو میرے سامنے عملی زندگی کا سفر تھا اور دوسرے گلوکارہ بننے کے بجائے کالج گریجویٹ ہونا اور جون کے گلاب کی طرح حسین دلہن بننا میرا خواب تھا۔ کیا سبھی عورتیں یہی راستہ نہیں اپناتیں؟ پبلک باتھ میں مساج کرنے والی عورت' مجھے لڑکی سمجھ کر' انتہائی نرم و نازک انداز میں مساج کیا کرتی تھی لیکن میں نے عمر کے ساتھ ساتھ اپنی جوانی اور خوبصورتی کو' بے داغ رکھنے کی جو کوشش کی تھی تو وہ صرف میرے لئے ہی نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں پیانو اور سنگترے کے رنگ کے لیمپ کے ساتھ میں نے اپنے خوابوں میں ایک متحرک آئینہ لگا رکھا تھا۔ جہاں سے میں اپنے خوابوں کے شہزادے کی آمد کی منتظر تھی تاکہ وہ آئے اور میرے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے۔

اس زمانے میں' لوگوں کے جم غفیر میں کہیں بھی مجھے اپنے خوابوں کا شہزادہ دکھائی نہیں دیا۔ میرے کہنے کا یہ مقصد قطعی نہیں کہ میں اپنے متوقع شہزادے کی خصوصیات گنوانے لگوں گی۔ اس وقت تو خیر مجھے ان باتوں کا شعور ہی نہیں تھا۔ پہلی دفعہ میں نے اسے خطاطی کے ایک سٹوڈیو میں دیکھا' میری ایک مصور دوست نے مجھے اس سے ملوایا تھا۔ میں نے بہرحال اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔

میں نے سٹوڈیو میں اسے کسی سے بھی بات کرتے نہیں دیکھا تھا اور میں خود بھی اس کے بارے میں قطعی لاعلم تھی۔ غالباً ان دنوں وہ بے کار تھا کیونکہ وہ مختلف اوقات میں سٹوڈیو آیا کرتا تھا۔ کالج سٹوڈنٹس کی تو ان دنوں گرمی کی چھٹیاں تھیں مگر شکل وصورت سے وہ طالبعلم نہیں لگتا تھا۔ صاف ستھرا ہونے کے باوجود' اس کا افسردہ چہرہ' بکھرے ہوئے بال اور عینک کے پیچھے سے جھانکتی بے تاثر آنکھیں' اس کی جوانی کو بے کیف اور بے رنگ بنا رہے تھے۔

میری توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی تو اس کی بدخطی کی وجہ سے۔ سٹوڈیو جاتے ہوئے کوئی دو ہفتے ہوئے ہوں گے کہ ایک دن مجھے میز پر' جہاں میں مشق کرتی تھی ایک نوٹ بک نظر آئی۔ سائز میں یہ کالج کی نوٹ بک سے آدھی تھی۔ میں اسے ایک طرف رکھنے جا رہی تھی' پھر نہ جانے کیا سوچ کر' شاید تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر' میں نے اسے کھول لیا۔ ایک اچٹتی نظر سے ہی پتہ چل گیا کہ نوٹ بک کے مالک کا خط کتنا چھوٹا' بھدا' بدنما اور گندا تھا۔

میں نے مڈل سکول کی لڑکی سے' جو شام کو آفس میں بیٹھتی تھی' پوچھا کہ یہ کاپی کس کی ہے۔ اگر یہ لکھائی اسی لڑکی کی ہوتی تو میں بالکل حیران نہ ہوتی۔ تحریر سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ نوٹ بک کسی بڑی عمر کے لڑکے کی ہے۔ لڑکی نے نوٹ بک دیکھ کر کہا کہ اس کا مالک امریکہ جا رہا ہے۔ کاپی سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ انگلش کی کلاسیں پڑھ رہا ہے۔ ان کلاسوں میں عموماً' امریکہ روانگی کے خواہشمند افراد ہی آیا کرتے تھے۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور عینک والا شخص اندر داخل ہوا' شیطان کو یاد کرو اور وہ حاضر۔ لڑکی کی دبی دبی ہنسی نکل گئی' آنے والا ہونق سا بن گیا' میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے لڑکی کو ناسمجھ بچوں کی طرح سمجھایا کہ یہ تحریر دراصل کسی معذور لڑکی کی ہے۔

میں آدمی سے خاصی دور تھی مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں در آنے والی برہمی مجھے اچھی طرح یاد ہے' میں اس ردعمل پر ساکت اور حیرت زدہ رہ گئی۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہی

نہیں تھا' تاہم فوراً ہی اس آدمی کے چہرے پر نرمی آ گئی۔ ''اسی لیے تو میں یہاں آیا ہوں۔''

اس کے بعد سے اس نے اپنی جگہ بدل لی اور دروازے کے بالکل قریب جا کر بیٹھ گیا' میری جگہ سے خاصا دور۔ میں اپنے آپ میں مست اور بے پرواہ تھی۔ میں نے اس کے اور اس کی حرکت کے بارے میں سوچا تک نہیں۔

سال کے اختتام کے قریب اس کی حاضریوں میں بے قاعدگی آ گئی۔ ہم میں سے کئی لوگوں کا کھانا چینی ریستوران سے آیا کرتا تھا۔ ان کا لڑکا کئی بار' اس آدمی سے رقم کی وصولی کیلئے آیا' لڑکے کا کہنا تھا کہ وہ پیکنگ ساس نوڈلز کھایا کرتا تھا اور ادائیگی کیلئے چیک دیتا تھا' جسے وہ لڑکا لے نہیں سکتا تھا۔ لڑکے کا تیسرا چکر کرسمس کے دن سے ایک روز پہلے لگا مگر اس دن بھی' وہ خالی ہی لوٹا۔ لڑکا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے بل کی رقم پوچھی۔ ظاہر ہے' نوڈلز کی چند پلیٹیں کوئی بہت مہنگی تو رہی نہیں ہوں گی۔ معمولی سا بل تھا' میں نے اسے رقم ادا کر دی۔ چھٹیوں کا موسم تھا اور ویسے بھی' ادھار کھانے کیلئے کسی کا بار بار سٹوڈیو میں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

کرسمس کے بعد' تین دن تک میں گھر میں ہی رہی' تیسرے دن مجھے اسی آدمی کا ٹیلیفون آ گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے ہی ریستوران والوں کو میرا ادھار چکایا ہے''

اس نے جلدی جلدی سے کہا ''میں معذرت چاہتا ہوں۔'' مجھے یقین آ گیا کہ وہ نرا احمق اور گاودی تھا۔ وہ بات کرسمس کی مبارک دے کر بھی شروع کر سکتا تھا۔

پیسے لوٹانے کے لئے وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے دو دن بعد' ڈنر اکٹھے کرنے کی پیشکش کی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر منع کرنے کی کوشش کی کہ میں اگلے دن سے باقاعدہ سٹوڈیو جانا شروع کر دوں گی' چنانچہ اسے بلاوجہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

''دیکھو نا' اگر حالات معمول کے مطابق رہے تو میں جنوری میں امریکہ چلا جاؤں گا چنانچہ اب کلاسوں میں میرا آنا مشکل ہی ہے۔'' وہ کچھ ہچکچایا پھر ہمت کر کے اس نے کہہ دیا ''میں چاہتا ہوں کہ ہم ڈنر کر ہی لیں۔'' اس کی روانگی کے اچانک پروگرام کی وجہ سے میں نے ہوٹل میں ڈنر کی تجویز خوش دلی سے مان لی۔

ماں جی مجھے کسی تجارتی کمپنی کے پریذیڈنٹ کے لڑکے سے ملوانا چاہتی تھیں۔ ابو کے ان کے ساتھ تجارتی نوعیت کے تعلقات تھے۔ لڑکا امریکہ میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا اور ان دنوں' موسم سرما کی چھٹیوں میں' اپنی متوقع بیوی کی تلاش میں کوریا آیا ہوا تھا۔

میں نے صاف انکار کر دیا، محبوب کے بغیر، موسم سرما کی چھٹیاں، کاٹ کھانے کو آتی ہیں، لیکن ایسا برا حال بھی نہیں تھا میرا۔ میرے ذہن میں انتظار کا ایک دھندلا سا تصور تو تھا لیکن گریجوایشن سے پہلے میں شادی کے معاملے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ رومانٹک وہ خاک ہوتا خشک کاروباری آدمی!

ماں جی مجھے منانے کی کوشش کرتی رہیں۔ غصّے میں، میں یہ کہہ کر گھر سے باہر نکل آئی کہ آیندہ میں اپنے معاملات کی دیکھ بھال خود ہی کروں گی۔ یہ تھی تناؤ کی کیفیت جو مجھ پر سوار تھی۔ سکول کے زمانے میں مجھے سکھایا گیا تھا کہ اگر سکول میں دیر تک ٹھہرنا ہو تو گھر فون کر کے بتا دیا جائے۔ کالج کے زمانے میں، میں کبھی بھی دس بجے کے بعد گھر سے باہر نہیں رہی۔ ہائی یا نگ اور سویا نگ پر اتنی سختی نہیں ہوئی۔ لگتا ہے میرے والدین میرے متعلق کچھ زیادہ ہی محتاط تھے کیونکہ میں ان کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ میں اس سلوک سے بری طرح تنگ آ گئی تھی۔

اگر مجھے صحیح یاد ہے تو میں اس رات وائن کی پوری بوتل چڑھا گئی تھی۔ اس نے بیئر کی دو بوتلیں پیں مگر وائن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ڈنر کے دوران کوئی اچھا موسیقار تازہ گانوں کی خوبصورت دھنیں بجا رہا تھا۔ ڈائننگ ہال میں جگمگاتے فانوس اپنی روشنی بکھیر رہے تھے۔ کوئی میز خالی نہیں تھی۔ مجھے اس بھرے پرے ماحول میں گھبراہٹ کا احساس ہوا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے مجھے سرخ رنگ کا ایک پیکٹ تھما دیا۔ میں اسے لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس میں جرابیں ہیں۔ میں کوئی بہتر چیز لینا چاہتا تھا مگر شاید آپ اسے لینے سے انکار کر دیتیں۔ اس کی آواز اس کے گلے میں اٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے پیکٹ کھول لیا۔ اس میں جرابوں کے سات جوڑے پھول کی شکل میں بکھرے رکھے تھے۔

''میری ممنونیت کا اظہار سمجھیں۔'' آدمی نے کہا مگر اب بھی وہ بے چین لگ رہا تھا۔

میں نے بڑی بہن کی طرح سر ہلایا۔

اس رات میں کتنی اجنبی اور ہولناک جگہ جا پھنسی تھی، اسے ذہن میں لانا اور اس کی وضاحت بالکل ایسے ہی ہے جیسے میرے دل میں سوراخ کیا جانے لگے۔ لمحاتی طور پر بہر حال میری افسردگی کچھ کم ہوئی تھی۔ موسیقی کی لے کے ساتھ ساتھ میری مے نوشی جاری تھی۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم وہاں سے اٹھے مگر ابھی میرا گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے مجھے جب کار میں سیر کی دعوت دی تو میں نے خوشی سے قبول کر لی۔ ویسے بھی ہوٹل سے نکلنے

والے لوگوں کے جمگھٹے میں مجھے ٹیکسی ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

لگتا ہے باقاعدہ منصوبہ بندی ہوئی تھی۔ میرے کہنے کے مطابق گاڑی تیزی سے پلک وانگ ڈنگ کی جانب روانہ ہوگئی لیکن پھر وہ میرے رہائشی علاقے کے قریب سے دوسری جانب مڑ گئی۔ مجھے صورت حال جاننے میں کچھ وقت لگا لیکن اس آدمی نے خود پر سکوت طاری کرلیا۔ اردگرد تیز رفتار ٹریفک جاری تھی۔ کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے میرے چیخنے چلانے کی آواز کسی کے کانوں میں پڑی ہی نہیں۔

وہ گاڑی کو شہر کے دور افتادہ کونے میں لے گیا اور جب گاڑی درختوں کے جھنڈ میں ایک اندرونی روش پر مڑی تو میری ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ گاڑی کا ہارن بجتے ہی کسی بوڑھے آدمی نے گیٹ کا دروازہ کھولا اور سلام کیا۔ وہ وہاں چوکیدار رہا ہوگا۔ مجھے تو یہ قدیم مشنریوں اور ڈاکوؤں کی کسی فلم کا منظر لگ رہا تھا۔ گاڑی کچھ دور تک گئی اور ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ وہاں میری چیخ و پکار دور دور تک کسی کے کانوں میں جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ گاڑی سے نیچے اترا اور میری طرف کا دروازہ کھولا تو میں نے ایک بار پھر اڑنے کی کوشش کی مگر اس نے سختی سے میری کلائی پکڑ کر مجھے باہر نکالا۔ عمارت کی کھڑکیوں میں سے روشنی آرہی تھی۔ وہ مجھے تقریباً گھسیٹتا ہوا ایک ویران لونگ روم میں سے ہوتے اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ سب سے پہلے اس نے کمرے کو بند کیا۔ پھر مجھے ایک کرسی پر دھکیل دیا۔ اس کی بے تاثر آنکھیں مسلسل مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ کہاں ہیں ہم؟ اس ساری حرکت کا آخر مطلب کیا ہے؟ اردگرد نظر دوڑاتے ہوئے میں بری طرح چیختی رہی۔ کمرے میں ایک جانب بیڈ تھا۔ جس پر چیتے کی کھال کی طرح کی چادر پڑی تھی۔ دوسری جانب ایک آرام دہ صوفہ رکھا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وارڈ روب موجود تھی۔ کمرہ اپنی سجاوٹ کے اعتبار سے کسی نو دولتیے کے مزاج کا عکاس لگ رہا تھا۔ بیڈ کے برابر میں جدید ترین آڈیو سسٹم نصب تھا۔ اس کے اوپر رنگ برنگے گلابوں سے بھرا گلدستہ موجود تھا۔ اپنی نفرت کے اظہار کے لئے میں نے ان چیزوں کی جانب اپنی پشت کی تو سامنے کھڑکی نظر آئی۔ میں فوراً اس کی طرف لپکی۔

”تم یہاں سے فرار نہیں ہوسکتیں۔ بہتر ہے یہ سوچنا چھوڑ دو۔“

میں نے کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ کھڑکی بند تھی تاہم باہر کی سمت لوہے کی سلاخیں نظر آرہی تھیں۔ شیشے برف کی طرح سرد تھے مگر ان پر ہلکی سی نمی بھی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے یقیناً

ہیٹر کھول دیا ہوگا۔

میں نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا۔ میں اندر سے ٹوٹ چکی تھی مگر عجیب بات ہے مجھ میں حوصلہ بھی آ گیا تھا: اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں شیشے کا ٹکڑا تمہیں دے ماروں گی۔

ایک عیارانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی اور وہ اپنی بیلٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

''میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ وعدہ رہا۔ جب تک میرے سامنے جھکی رہو گی' میں تمہارے سر کے ایک بال تک کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میرا خیال ہے' تمہاری اوقات یاد دلانے کے لئے اتنا ہی کافی رہے گا۔ تم بہت مغرور ہونا۔''

اس نے بتایا کہ میں نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ میں نے انتہائی سرد مہری سے کہا کہ مجھے اب بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن اس نے مجھے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ اس کے عمل میں بھی استر داد مخفی ہے۔ ''یقیناً اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ میں ذہنی طور پر معذور ہوں۔'' وہ بڑبڑایا۔ میرے جسم میں گویا جان ہی نہیں رہی۔ میں پتھرا کر رہ گئی کہ خطاطی کے سٹوڈیو میں میرے بے سوچے سمجھے ریمارکس نے مجھے کس حال تک پہنچا دیا ہے۔

اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ ابتدا اس نے جیکٹ سے کی۔ یوں لگا جیسے کوئی سانپ اپنی کینچلی بدل رہا ہے اور پھر وہ پورے کا پورا ننگا میرے سامنے کھڑا تھا۔ گھنے بالوں سے بھرا ہوا جسم اور اس کا تناؤ دیکھ کر دہشت کے مارے میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔

اس دن پہلی دفعہ مجھے پتہ چلا کہ مردوں کے بھی خفیہ بال ہوتے ہیں۔ کسی جانور کے بالوں کی طرح تھے اس کے بال۔ میرے لئے یہ بھی ایک دھچکا تھا۔ میرے ذہن میں مرد کا عریاں بدن مائکل اینجلو کے مجسموں سے مشابہ تھا۔

اس نے مجھے بھی کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ میری سرد آنکھیں بدستور اسے گھور رہی تھیں۔ ''تم تو کتے سے بھی بدتر ہو۔ میں نے کسی کتے کو بھی اس وحشیانہ انداز میں کسی کتیا کو تنگ کرتے نہیں سنا۔'' میں نے کہا۔

دل ہی دل میں میں اپنے خاندان کے نیک دل چرواہے کو آواز دے رہی تھی۔

اس پر کسی دعا کا اثر نہیں ہوا۔ شاید وہ انسان ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک قدم میری طرف بڑھنا چاہا۔ میں نے اپنے اوورکوٹ کا ایک بٹن کھول دیا اور کوئی چارہ تھا ہی نہیں۔ اس عفریت سے گریز کا راستہ کہاں رہا تھا۔ میری آنکھوں کی پلکیں تک لرز رہی

تھیں۔ اچانک مجھے حیوانوں کے متعلق کسی رسالے میں پڑھا ہوا ایک فقرہ یاد آ گیا۔ لوگوں کو جانوروں کو یہ سکھانا چاہئے کہ انسان خود بھی جانور ہیں۔ ٹھیک ہے اپنے کپڑے اتار کر میں اس جانور کو بتاؤں گی کہ میں بھی ایک جانور ہوں حالانکہ اس فاترالعقل مخلوق کے سامنے میں اپنے کنوارے جسم کو عریاں کرتے ہوئے خود بھی اپنی بدقسمتی پر رو رہی تھی۔ بہر حال اپنے بچاؤ کے لئے میں نے کسی خطرناک جنگجو کی طرح ایک طریقہ سوچ لیا تھا۔

لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر تشنج کے اثرات نمودار ہوئے۔ گویا وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ پھر اس کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ اس کے چہرے پر خباثت اور کمینگی کی کوئی رمق نظر نہیں آئی۔ اس کے بجائے ایک عجیب سا ہونق پن دکھائی دے رہا تھا۔ میں اپنی نفرت آ گیں نگاہیں اس پر جمائے ہوئے تھی۔

کچھ ہی دیر میں اس کا چہرہ دوبارہ پتھرا گیا اور وہ اپنے بیڈ کی جانب جانے لگا۔ پھر کسی روبوٹ کی طرح وہ اپنے بیڈ پر جا لیٹا اور خود لذتی میں مصروف ہو گیا۔

''کبھی مجھے بھی کسی عورت سے پیار ہوا تھا۔ میں فوج میں چلا گیا تو اس نے اپنی نظریں بدل لیں۔ میں نے آخری مرتبہ اس سے ملاقات کی بھیک مانگی۔ ہم ایک ریستوران میں ملے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ پھر وہ چلی گئی۔ جب میں چائے کا بل ادا کرنے گیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے حصے کا بل ادا کر کے گئی ہے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ عورتیں کتنی پتھر ہو سکتی ہیں۔ بس ان کی سوچ بدلنے کی دیر ہے۔ بعد میں میں نے اس کی تین سہیلیوں کو باری باری اغوا کیا اور اپنی خواہشات کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ایک بار انتہائی ہوشیاری سے انہیں اپنے پاس اکٹھے بلایا اور ان کو جتلایا کہ میں کس خوبصورتی سے عورتوں کو فریب دے سکتا ہوں۔''

وہ آدمی ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہا تھا جیسے خواب کی گہرائی میں کہیں دیکھ رہا ہو۔ اس کے پورے بدن پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس عفریت کا بدن خود بخود ڈھیلا پڑنے لگا۔ تھکاوٹ کی نامعلوم سی کیفیت نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ غنودگی میں اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ تشنج کی کیفیت ختم ہوتے ہی وہ پرسکون لگ رہا تھا۔

میں نے جب اس کا بے روح چہرہ دیکھا تو میرے ذہن میں اس کے لئے موجود نفرت لمحہ بھر میں ختم ہو گئی۔ وہ ایک کمزور انسان تھا۔ دوسروں کا پیار کھو دینے کے بعد اس نے خود کو

ضائع کرڈالا تھا۔ عورت کی بے وفائی کا احساس اسے ہر گھڑی توڑ پھوڑ رہا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے ماضی میں زندہ تھا اور حقیقتوں سے منہ چھپانا چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے حال' اخلاقی اصولوں' خواہشات غرض ہر شے سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس کا ارتقا ختم گیا تھا اور اب وہ روحانی طور پر ایک معذور انسان تھا۔

میں اس خوفناک اور آسیب زدہ گھر سے رات کے اندھیرے میں ہی بھاگ لی۔ مجھے لگا جیسے میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھی ہوں ۔ چونکہ اس کا گھر عام آبادی سے خاصا دور تھا۔ کھلے اور صاف ستھرے راستے تک پہنچنے کے لئے مجھے اچھے خاصے گھنے درختوں کے جھنڈ سے گزرنا پڑا۔ اردگرد کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھر گویا تاریکی کی قبر میں دفن تھے۔ باہر صرف میں تھی اور بدن میں اترتی ہوئی تیز اور یخ بستہ ہوا۔ چہرہ برف کے مارے سن ہو رہا تھا۔ جلدی میں میرا سکارف وہیں کہیں رہ گیا تھا۔ بہر حال میں ننگے پاؤں بھی ہوتی تو کبھی وہاں واپس جانے کا نہ سوچتی۔ کبھی کبھار چاند بادلوں کی اوٹ سے اپنا چہرہ نکالتا تو اردگرد اس کی روشنی پھیل جاتی۔ میں بےخوف وخطر چلی جا رہی تھی۔

بظاہر مجھے کوئی زخم نہیں آیا لیکن اس واقعے نے میری زندگی لرزا کر رکھ دی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ موسیقی کا جوش وجذبہ مجھ میں سے بالکل مفقود ہو گیا۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ روح کو تسکین پہنچاتے ہیں لیکن اب مجھے موسیقی کی حدود کا پتہ چل گیا تھا۔ عظیم باخ بھی غالباً مجھے نہیں بچا سکتا تھا۔ مسئلہ دراصل موسیقی کے ساتھ نہیں' میرے ساتھ تھا۔ اپالو نامی خلائی جہاز کی چاند پر اترتے ہوئے اخباری تصویر ذہن میں آتی ہے۔ میں اس وقت خاصی کم عمر تھی مگر وہ تصور آج بھی مجھے بہت شاندار لگتا ہے اور یہ سورج: کتنی توانائی خرچ کر کے ہر طرف روشنی اور حرارت پھیلاتا ہے اور ٹھنڈا نہیں پڑتا؟ کائنات کے یہ عجائبات مذہب اور آرٹ سے بھی ماورا محسوس ہوتے ہیں۔ لوگ فنون لطیفہ کو بڑا عظیم گردانتے ہیں مگر ان سب کا تعلق تو صرف انسان سے ہے۔

ان دنوں ہر جذبہ میرے دل و دماغ سے محو ہوتا جا رہا تھا۔ میرے ایک دوست نے جس کے ساتھ ایک دفعہ میں ڈیٹ پر بھی گئی تھی۔ بتایا کہ اس کی شادی اسمبلی کے کسی رکن کی لڑکی سے ہونے والی ہے۔ میں نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اسے پھنسایا اور اپنی دوشیزگی جس پر کبھی مجھے بڑا ناز تھا انچاون کے قریب ساحل سمندر کی تپتی ریت اور پیاسی لہروں کے درمیان کہیں پھینک

آئی۔ وہ دوست بھی عجیب فطرت کا تھا' فٹ بال میچ دیکھتے ہوئے فرائڈپر لمبی چوڑی بحث کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ عالمانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کو دلکش گانے سنا کر محظوظ بھی کرسکتا تھا۔غریب گھرانے سے تعلق کی وجہ سے اپنا مستقبل بنانے کے لئے اس نے بہتر سمجھا کہ کسی دولت مند گھرانے میں شادی کرلی جائے۔ میں نے اسی لئے اس سے اپنے تعلقات دوستی کی حدتک رکھے۔

انچاون جانے کی میری غیر متوقع تجویز پر اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔لیکن اگلے دن ہوٹل کے باتھ روم میں میری نگاہ یونہی اپنے سفید رومال پر موجود خون کے دھبوں پر جاپڑی۔ میرے لئے اب یہ سب کچھ بے معنی ہوگیا تھا۔ کسی ردی کاغذ کی طرح اسے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے میں گویا کھڑکی کے متحرک شیشوں والا خوبصورت خواب بھی توڑ پھوڑ کر پھینک رہی تھی۔

ایک دفعہ کسی دوست نے مجھے بتایا تھا کہ میں ایک ایسی دنیا کی باسی ہوں جہاں بدقسمتی کا سایہ کبھی پڑ ہی نہیں سکتا۔ایک اور دوست جب بھی ملتا' سیدھا مجھے اپنے گھر لے جاتا اور پھر بعد میں آنکھیں چراتا پھرتا۔اس نے ایک بار مجھے کہا تھا میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ بعد میں وہ فوج میں چلا گیا۔ایک طرح سے وہ صحیح بھی تھا۔زندگی کا ہر عیش وآرام میری رسائی میں تھا۔ ماں کو پتہ تھا کہ علم وفن کے جس شعبے سے مجھے لگاؤ ہے۔وہ درمیانے طبقے کی لڑکیوں کو معاشرے میں بہتر مقام دلاتا ہے۔اس لئے مجھے کسی طرح کی کمی یا کسی خاص دشواری کا کبھی سامنا کرنا ہی نہیں پڑا۔ دنیا میں قدم قدم پر بکھرا ہوا دکھ اور درد جب میری آنکھوں کے سامنے آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں تو اپنے حصے کی ہر خوشی پہلے ہی لے چکی ہوں اور تقسیم کے اخلاقی اصولوں کے مطابق اب مجھے لوگوں میں خوشی بانٹنا تھی۔اس ہیبت ناک واقعے سے پہلے یہ اصول شاید میری نظر سے اوجھل رہا تھا۔میں یہ بھی سوچ سکتی تھی۔کہ زندگی میرے ساتھ بھی خاصی نامہربان رہی ہے۔کیا مجھے اپنے قرضے چکانے کا موقع پہلے ہی نہیں ملنا چاہیئے تھا؟

کالج گریجوایشن کے بعد مجھے کسی انگریز مصنف کی ایک کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔اس کا ایک مضمون پڑھتے ہوئے میں اپنے آنسو ضبط نہ کرسکی۔مصنف نے شہر کے قریب ایک اجاڑ سی جگہ پر ایک دس سالہ لڑکے کو درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بری طرح روتے دیکھا۔اس کے والدین نے اسے کسی کے پاس چھ پنس کا قرضہ چکانے کے لئے بھیجا تھا لیکن وہ یہ پیسے راستے میں گم کر بیٹھا۔موسم بہار کے ایک خوبصورت دن ایک معصوم لڑکا اپنے کھلنڈرے پن اور

شرارتوں کو بھولے ہوئے زار وقطار روئے جا رہا تھا۔ رحم دل مصنف نے اپنی تمام تر غربت کے باوجود اپنی جمع پونجی جیب سے نکال کر اس لڑکے کے حوالے کی اور اسے گھر بھیج دیا۔

میں ہی وہ لڑکا تھا جو اپنے چھ پنس گم ہو جانے پر بری طرح رو رہا تھا۔ ادھار ادا کرنے کے بجائے اپنی رقم کسی غلط جگہ ضائع کر بیٹھا تھا۔ اگر کوئی خدا ہے تو اس وقت اس کا دل بھی بری طرح دکھا ہو گا لیکن کمزور لوگ اپنے آنسوؤں سمیت زندگی سے نبرد آزما رہتے ہیں۔

اپنی منگنی والے دن میں نے یہ کہانی چاؤ کو سنائی۔ ''تم ہو وہ شخص' جس نے لڑکے کو چھ پنس دیئے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا! آج تم کچھ عجیب عجیب سی نہیں لگ رہیں۔'' لیکن انہوں نے یہ سوال کیا نہیں مجھے چاؤ کی یہ عادت بہت اچھی لگتی ہے۔ منگنی کے بعد بھی انہوں نے مجھے مس پی کہنا نہیں چھوڑا۔ بینک چھوڑنے کے بعد بھی سویا نگ سے میری ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے بچنے کی کوشش کرتی ۔ مین گھر میں ہوتی تھی۔ وہ گھر سے نکلتی اور رات گئے تک باہر ہی رہتی۔ یہ اس کا روز مرہ کا معمول تھا۔ بعض اوقات میں اس کے لئے کھانے کی کوئی خاص چیز تیار کرتی تا کہ رات کو آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کی جا سکے لیکن ہوتا یہ کہ اوپر آنے سے پہلے عموماً اسے ابو کی ڈانٹ کھانے کو مل جاتی۔ ایسی صورت میں اس کے دروازے پر دستک دینا گویا مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ انہی دنوں ایک دفعہ پھر مجھے اس کے کمرے میں جانے اور اس کی ڈائری پڑھنے کا موقع ملا۔

۷ استمبر: ہوئی چنگ سے ملنے کے لئے میں سکول کے قریب ہی ایک کیفے میں گئی۔ میں بری طرح نڈھال تھی اور چہرے پر ویرانی سی طاری تھی۔ اس نے میری لال انگارہ آنکھوں کو دیکھا تو کہنے لگا: رو رو کر اپنی آنکھوں کا بیڑہ غرق کر لو اور ہاں احتجاجی مظاہروں میں جانا نہ چھوڑنا۔ یہ تھا وہ ہوئی چنگ' کلاسوں میں غیر حاضری اور جلسے جلوسوں سے غائب ہونے کی وجہ سے اس کا نام پاپی لان پڑ گیا تھا۔ تاہم دعویٰ اس کا اب بھی یہی تھا کہ وہ آنسو گیس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لوگ آنسو گیس پھیلی فضا میں جب ادھر ادھر بھاگتے ہیں تو لگتا ہے جیسے میں ان کے سروں پر چپت مار کر مزے لے رہا ہوں' یہ ہے میری بالغ نظری۔ دراصل یہ ہے تمہارا دوغلا چہرہ! اے تجزیہ نگار خاتون: کبھی تو ہنس ہنسا بھی لیا کرو۔ یہ لو تمہارے میٹھے دکھوں کے نام! ہم نے اپنی گیم دوبارہ بھی شاید بیس منٹ میں ختم کر لی۔ وہی وقت' وہی جگہ' وہی پنگ پانگ

کھیلنے کا انداز۔ جب میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں تو یادوں میں خوشبو نہیں بستی، کوئی مزا محسوس نہیں ہوتا۔اب مجھے سمجھ آ ئی، تم بس ایک نر جانور ہو۔جانور سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔اس کے باوجود یہ بات میں کبھی نہیں بھلا پاؤں گی کہ ایک دفعہ تم نے پیاری کہہ کر بلایا تھا اور ایک اور موقع پر مجھے تیز دھار خنجر کا نام بھی دیا تھا۔

۱۹ستمبر: میں آج ایک پبلک باتھ میں گئی اور اس کے بھاپ والے کمرے میں گیس چیمبر کا کھیل کھیلنے لگی۔میں نے کچھ دیر کے لئے اپنا سانس روک لیا تھا۔ایمانداری کی بات ہے۔ موت مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوئی تو میں چھلانگ لگا کر وہاں سے نکل آئی۔اور میرے پیچھے۔ایک خوبصورت سا بلا اپنی آنکھیں مچ مچاتا نکلا۔میں نے اس کی معصوم آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی اور نہ جانے کیوں میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔کتنا خوش نما! کتنا لطیف وجود تھا اس کا! لیکن میں؟ میں کہاں ہوں............؟

۲۱ستمبر: آکوپنکچر کے ایک زبردست ماہر کا لیکچر سننے کے لئے میں ہوئی چنگ کے ساتھ گئی۔لیکچر اور روحانی عمل کے بعد اس نے ہمیں ین یانگ اور پانچ عناصر کے اصولوں پر مبنی ہمارے ہاروسکوپ کے بارے میں بتایا۔ہوئی چنگ کی شخصیت کا پتہ چلا کہ اس میں دو حصے پانی دو حصے دھات اور ایک حصہ آگ ہے۔مجھ میں چار حصے دھات اور ایک حصہ لکڑی تھی۔عامل نے کہا: ''خدا کی پناہ''اور زور سے اپنا سر ہلانے لگا۔"اتنا گہرا تضاد! تم دونوں کی جوڑی عملاً ممکن ہی نہیں۔" جس کسی کی شخصیت پر دھات کا عنصر حاوی ہو اور اس کی مٹھی میں چاقو بھی ہو وہ عموماً جج بنتا ہے اور سزائیں دیتا ہے۔جج یا ڈاکٹر بننے کی صورت میں کامیابیاں میرے قدم چومیں گی''اس نے مجھ سے کہا۔کیا خیال ہے۔واپسی پر ہوئی چنگ خود کلامی کر رہا تھا:''یہ درست ہے کہ تم ایک ایسی بچی ہو جس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔تم تو خطرناک ہو لیکن............ بچے انجانے میں خود کو زخمی کر لیتے ہیں۔لیکن میں کسی دوسرے کے بجائے خود اپنا جائزہ لیتی ہوں اور زیادہ تر خود کو موردِالزام ٹھہراتی ہوں۔

۲۳ستمبر: میں خود کو بے وجود لگ رہی ہوں۔سر کا درد، مسلسل درد یہ ثابت کر رہا ہے کہ میں زندہ ہوں۔

ہوئی چنگ کا نام کئی بار میری نظروں سے گزرا تھا۔ میں ان کی باہمی قربت کا کچھ کچھ

اندازہ لگا سکتی تھی۔ ''ہماری گیم'' کے خصوصی تاثر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ جنسی کھیل کو پنگ پانگ کا نام دینا...... میں سویا نگ کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بری طرح پریشان ہوگئی۔

ستمبر کے آخری دنوں میں فصل کی کٹائی کے تہوار سے ایک دن پہلے سویا نگ کوئی آدھی رات کو گھر پہنچی میں نے خارجی گیٹ کھولا تو مجھے اس سے شراب کی زبردست بو آتی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھی اوپری منزل کے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ میں نے الٹیوں کی آواز سنی۔ کچھ منٹ بعد وہ باتھ روم سے باہر نکلی۔ اس کا چہرہ نقاہت زدہ لگ رہا تھا۔ میں وہاں کھڑی اس لئے تھی کہ اس سے بات کروں گی۔ میں نے اس سے پوچھا بھی' کیا اس کا پیٹ خراب ہے۔ اس نے سر سے ہی اثبات میں جواب دیا۔ شاید نقاہت کے مارے وہ بول نہیں پا رہی تھی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سویا نگ اس رات کم از کم دو دفعہ اور باتھ روم میں گئی۔ صبح کو بھی اس کا معدہ صحیح نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے وقت پر اٹھنے کے بجائے سوتی رہی۔ چھٹی کی وجہ سے ماں جی کی خواہش تھی کہ ہم سب ناشتہ ایک ساتھ کریں لیکن سویا نگ نے سر کے اشارے سے منع کر دیا اور اپنے بیڈ میں لیٹی رہی۔ میں نے گھر والوں کو بتایا کہ سویا نگ کی طبیعت خراب ہے۔ ناشتے کے بعد میں نے تھوڑا سا دلیہ بنایا اور اس کے ساتھ تلی ہوئی مچھلی اور رائس کیک رکھ کر سویا نگ کے کمرے میں لے گئی۔ شاید پچھتاوے کا کوئی احساس تھا کہ وہ فوراً اٹھ بیٹھی اور میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اس کی سانسوں میں ابھی تک شراب کی بو موجود تھی ۔ میں نے مذاق میں کہا کہ بینک سے تو چھٹی ہوگئی' اب میں روزانہ دلیا اور کیک بنا سکتی ہوں ۔ سویا نگ کے ساتھ مل بیٹھے اور گپ شپ لگائے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ میری یادداشت اسے پکڑ نہیں پا رہی تھی۔ سویا نگ کو کھلانے کے لئے میں نے خود بھی کیک اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ کھاتے کھاتے میں نے پوچھا۔ ''ان دنوں کہاں غائب رہتی ہو؟'' میں نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نرم اور ملائم رکھنے کی کوشش کی۔ ''گھر میں رہوں تو مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ سو میں خود کو گھر سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' اس کی نگاہوں میں شک وشبہ کی پرچھائیں تک نظر نہیں آ رہی تھی۔

''خود اپنی تلاش کے لئے آدمی کو اپنے اندر نہیں جھانکنا چاہئے کیا؟''

''بالکل کنفیوشس کا سا انداز ہے آپ کا۔''

میں نے اس سے کچھ سوالات بھی کئے۔ اس دفعہ سکول میں رجسٹریشن نہ کرانے پر اسے

کوئی پشیمانی تو نہیں، کیا سکول جانے کی کوئی خواہش نہیں؟ اور کیا وہ اپنے دوستوں سے اکثر ملتی جلتی ہے؟ بے اعتنائی سے اس نے ہر بار ایک ہی جواب دیا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

وقتی طور پر مجھے پریشانی تو ہوئی مگر میں نے سوچا کہ اپنے سر کا بوجھ اتار ہی لینا چاہیے۔

''بات یہ ہے کہ میں تمہیں سمجھنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ احساس اکثر تنگ کرتا ہے کہ میں تمہیں نظر انداز کرتی رہی ہوں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ مجھے اب اپنے گھر والوں کی قدر زیادہ محسوس ہوتی ہے اور تم ۔۔۔ تم سب سے زیادہ میرے ذہن پر سوار ہو۔ تم نے سب سے کیوں چھپایا کہ تم سکول چھوڑ رہی ہو۔ کیا یہ اتنا بڑا راز تھا کہ تم گھر میں کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھیں۔''

''راز واز کوئی نہیں تھا۔ بس بتانے کی زحمت سے بچنا چاہ رہی تھی۔'' دلیہ کھاتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔ معاملہ کچھ اس طرح تھا جیسے ٹینس کھیلنے کی خواہش کے باوجود آپ کھیل نہیں سکتے کیونکہ آپ کے پارٹنر میں کھیلنے کا جذبہ ہی نہیں۔ بہر حال میں نے جو کہنا تھا، کہتی چلی گئی۔ ''کالج کا اپنا ایک پر لطف زمانہ ہے، دنیا ہے تم اسے دیکھ کر کہتی ہو کہ یہ کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ مجھے پتہ ہے تم نے تو محنت بھی خاصی کی تھی اور انٹری ٹیسٹ میں پاس ہونے والوں سے کہیں زیادہ امیدیں بھی نہیں تھیں۔ لیکن پھر کیا ہوا کھوکھلے پن کے احساس کے ساتھ تم نے سب کچھ ختم کر ڈالا۔ غالباً تم یہ سمجھتی ہو کہ سکول وغیرہ سب خرافات ہیں اور پھر تم نے اپنی ہی قدروں کو حیرانی سے دیکھنا شروع کر دیا''

''المیہ؟'' سویا تنگ بڑبڑائی۔ اس کے ماتھے پر بل آ گئے تھے۔

''کل میں ایک دوست کے ساتھ زیر زمین راستے سے گزر رہی تھی۔ وہاں کوئی آدمی سگریٹ لائٹر بیچ رہا تھا۔ اس نے ہمیں اشارہ کیا۔ کیوں بھئی طالب علمو؟ ایک لائٹر خریدو گے نا؟ میرا خیال ہے، میں ابھی طالب علم ہوں۔ سکول چھوڑ دینے کے باوجود۔ لیکن اس شخص کا مجھے طالبعلم کہہ کر بلانا عجیب سا لگا۔ جیسے کسی عمر رسیدہ عورت کو اس کے بالوں کی وجہ سے اس کی پشت پر موجود کوئی مس کہہ کر آواز دے تو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی ہیں آپ، لیکن وہ آدمی ہر گزرنے والے کو طالب علم کہہ کر ہی متوجہ کر رہا تھا۔ میرے دوست نے کہا: طالبعلم کہلانا ہر کوئی پسند کرتا ہے۔ میں بھلا یہ خطاب کیوں چھوڑوں گی، جب ساری دنیا اسے پسند کرتی ہے۔ میں ہونا کیا چاہتی ہوں؟ میں ابھی تک نہیں جانتی کہ میں چاہتی کیا ہوں ۔۔۔ اور یہی میرا

المیہ ہے۔''

ایک لمحے کو مجھے سمجھ ہی نہیں آئی کہ میں کیا کہوں۔ اسی طرح اسے بھی علم نہیں تھا کہ وہ چاہتی کیا ہے۔لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ زندگی کے دھارے میں بہتے ہوئے ہم اپنی فوری خواہشات کی دریافت کر چکے ہیں؟

''اور کیا یہ خواہشات مطلق ہونے کے بجائے بدلتی نہیں رہتیں؟ جیسے ہی کچھ خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے'ہم ان کی جگہ کچھ اور خواہشات پیدا کر لیتے ہیں اور سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔''

سویا نگ' خواہش کے بجائے' غالباً آئیڈیل کی بات کر رہی تھی۔ اگر وہ ابھی تک اپنا آئیڈیل یا اپنی خواہش دریافت نہیں کر پائی تو اس طرح کی پریشانی۔۔۔کسی چیز کے حاصل نہ ہونے کا غم تو مستقبل کا مسئلہ ہونا چاہئے نہ کہ حال کا۔ فوری المیہ تو وہ ہوتا ہے جب ہمارا آئیڈیل ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

ہمارے پاس کسی شے کا نہ ہونا تو اس کے حصول کی خواہش اور امید کو مہمیز دیتا ہے۔ میں نے جب اسے یہ مہمل سی توجیہہ دی تو مجھے یاد آیا کہ کسی کتاب میں میں نے کچھ اسی طرح کا حوالہ پڑھا تھا۔اسی اثنا میں سویا نگ دلیئے کی پلیٹ صاف کر چکی تھی۔ اور اب وہ رائس کیک پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ اس نے ٹرے اپنے زانوؤں سے اٹھا کر فرش پر رکھ دی۔'' خیالات کے موازنے میں' الفاظ بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں اور جہاں تک بھوک کا تعلق ہے تو یہ حیوانی جبلت ہے۔تمہیں پتہ ہے۔ کھانے پینے کے بعد تم میں تروتازگی اور شگفتگی آ جاتی ہے۔'' سویا نگ کا قہقہہ ابل پڑا۔ خوشگوار فضا محسوس ہوتے ہی میں نے ایک سوال داغ دیا۔'' تم واقعی کسی بار میں کام کر رہی ہو؟'' میری آنکھیں اس کے چہرے پر اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کیک کھاتے کھاتے رک گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے جھوٹ بولا کہ میری اتفاقاً میا نگ جو سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہاری طرف سے خاصی فکر مند ہوں۔تو اس نے مجھے یہ بات بتائی۔'' کسی اور جگہ کے مقابلے میں بار ہی کیوں؟''

اس نے پرسکون لہجے میں جواب دے کر مجھے حیرت زدہ کر دیا۔'' صرف چار دن کا م کیا تھا۔کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

''تمہیں رقم کی ضرورت تھی؟'' میں نے یونہی ادھر ادھر کی ہانک دی۔ مجھے علم تھا کہ یہ وجہ ہرگز نہیں ہوگی اس بار' سویا نگ نے براہ راست جواب نہیں دیا۔

''ایک حرامی نے میرے بریزیر میں پیسے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے پیسے نکال کر اس کے منہ پر دے مارے'اسی جگہ اور پھر میں نے وہ نوکری چھوڑ دی۔''

سویا نگ نے گویا غصّے کے عالم میں'اپنے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو پیچھے کی جانب کرلیا مگر بہت سے بال اب بھی اس کی پیشانی پرلہرا رہے تھے۔ بالکل کسی کھلنڈر سے بچے کے آوارہ بالوں کی طرح۔ نہ جانے کیوں اس کے بچپن کا ایک واقعہ یادوں کے زینے سے پھسلتا ہوا سامنے آ گیا۔ ڈانس سٹوڈیو سے اپنے گھر کی جانب آتے ہوئے ہم سڑک کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کہ ایک سائیکل سویا نگ سے ٹکراتی ہوئی تیزی سے گزری۔ سویا نگ ایک درخت سے ٹکرا کر گر پڑی۔ سویا نگ کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی مگر وہ سڑک سے ہٹ کر میری دوسری جانب آ گئی اور انتہائی تنک کر بولی۔''اگر آپ کسی بچے کو بچانا ہی چاہتی ہیں تو کیا آپ کو سڑک کے کنارے کی جانب نہیں ہونا چاہئے؟''

''تمہیں یاد ہے وہ؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ مجھے تو تمہارے سر میں لگا زرد ربن بھی یاد ہے۔

میں نے ایسا کچھ کہا تھا؟''اس نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

مجے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی تیز طرار اور آنکھیں مٹکانے والی سویا نگ ہے' جسے میں بچپن سے جانتی ہوں۔ دادی اماں کی آواز آئی۔ وہ کسی کو بلا رہی تھیں۔ میں نے ٹرے اٹھائی اور کھڑی ہوگئی۔ ہم اپنے بزرگوں کی قبروں پر جایا کرتے ہیں' آج کے دن۔ تم تیار ہو رہی ہو؟''

''میں نہیں جا رہی۔''

کافی ہوگیا۔ میں نے سوچا۔ ایک لمحے کو وہیں کھڑے کھڑے میں نے پوچھا: اندنوں تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں' ہے نا یہی بات؟ کہو تو خرچ کے لئے کچھ رقم دے دوں؟ مجھے یوں لگا جیسے میں اسے چارہ ڈال رہی ہوں۔

''پیسے؟'' سویا نگ نے چبھتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی' پھر بولی۔''اگر تمہارے پاس کچھ پیسے فالتو ہیں تو............ میں لے لوں گی۔''

سویا نگ اس ہفتے دوبار گھر سے باہر رہی۔ پہلی بار فصل کی کٹائی کے تہوار کے اگلے روز۔ اس شام چاؤ ہمارے گھرانے کے ساتھ ڈنر کر رہے تھے۔ ظاہر ہے گھر والے سویا نگ کے گھر سے باہر رہنے پر تبصرہ کر رہے ہوں گے۔ چار دن بعد پھر سویا نگ گھر نہیں آئی۔ اس سہ پہر' میں

ماں جی کے ساتھ فرنیچر دیکھنے چلی گئی۔ شام کو چاؤ کے ساتھ ملاقات طے تھی سو رات کو دیر سے گھر آنا ہوا۔ بقول دادی اماّں کے' سویا نگ کے کسی دوست کا فیلی فون آیا تھا۔ چنانچہ وہ سہ پہر ہی کو گھر سے چلی گئی تھی۔ یہ علم ہونے کے بعد کہ سویا نگ نے نہ تو رات کوٹیلیفون کیا اور نہ ہی اگلی صبح تک گھر پہنچی تھی' دادی اماّں کو گھر کا بزرگ ہونے کے ناطے وعظ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا اور وہ ایسا موقعہ کبھی ضائع نہیں کرتی تھیں۔

کیا زمانہ آ گیا ہے۔'لڑکے لڑکیوں میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ دونوں ہی اپنے بال کٹواتے ہیں' بیگی پینٹوں میں آوارہ گردی کرتے ہیں۔لڑنے مرنے کو تیار رہتے ہیں اور یہی نہیں' ان کی واقف ایک خاتون............جو چرچ کی رکن ہیں اور یونیورسٹی کے قریب ان کا میڈیکل سٹور بھی ہے............کے مطابق لڑکیاں عام سگریٹ پینے لگی ہیں۔ یونیورسٹی کے نوعمر لڑکے دن دہاڑے سٹور سے کنڈوم خریدنے آتے ہیں۔شرم وحیا رہی ہی نہیں۔اس سے زیادہ اور کیا قیامت آئے گی۔دادی اماں نے تجزیاتی جملہ بھی کہہ ڈالا۔

سویا نگ کے گھر سے غائب ہونے پر ماں جی کے حواس ویسے ہی گم تھے۔دادی کی الٹی سیدھی اور بے محل باتیں سن کر چمچہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ غصے میں میز سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔کچن میں ایک کیک' جو ادھ پکا تھا' جا کر اسے دیکھنے لگیں۔دماغ قابو میں نہیں تھا۔کیک کو پلٹنے کی کوشش کی تو سارا کیک ہی فرش پر آ رہا۔دادی اماں نے اس کا کوئی نوٹس لیا ہی نہیں۔انہوں نے اپنا فیصلہ دینے کے لئے خاصے خوبصورت الفاظ چنے۔

''جوانی کے پر آسانی سے ٹوٹنے لگتے ہیں بلکہ واقعتاً وہ ٹوٹ رہے ہیں۔''

مجھے دادی اماّں کا یہ فقرہ کسی ڈرامے سے لیا ہوا لگا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے ایک بار سویا نگ کے کمرے کا دروازہ کھولا۔اندر جا کر اسے بڑی آہستگی سے بند کر لیا۔خوف یہ تھا کہ کہیں دادی اماں اپنے کمرے سے باہر نہ آ جائیں۔ پھر میں نے ڈائری نکالی۔ڈائری مجھے کسی بے چین روح کی درد بھری سسکیوں اور سبکیوں کا مجموعہ لگ رہی تھی۔لیکن سچ بتاؤں شرلاک ہومز بننے کا کھیل' اپنی جگہ' لطف دے رہا تھا۔ڈائری میں مزید تین اندراجات ہو چکے تھے۔

25 ستمبر: چرچ کی بوڑھی نیک دل خواتین مناجات کے گیت گا رہی تھیں اور میں' ان کی نقالی کرتے ہوئے ان کی آواز میں آواز ملا رہی تھی۔کوئی مانے یا نہ مانے' میں نے ان کے

گیتوں کے اختتام تک ان کا ساتھ دیا' کسی بھولی بھالی لڑکی کی طرح عرصہ دراز کے بعد' بائبل میرے ہاتھوں میں آئی ۔ میں نے باب پیدائش (47 لائن) پڑھی اور حضرت یعقوبؑ کے الفاظ گویا میرے دل میں گھستے چلے گئے: فرعون نے ان کی عمر پوچھی تو ان کا جواب تھا۔ میرے عارضی قیام کے دنوں میں سے ایک سوتیس سال گزر چکے ہیں۔

میرے عارضی قیام کی مہلت میں سے بیس سال گزر گئے ۔ لگتا ہے مجھ پر ٹنوں بوجھ لدا ہے' جیسے اس بوجھ کو اٹھائے' مجھے بھی ایک سوتیس سال ہو چکے ہیں۔ یہودیوں کو چالیس سال تک صحرا میں بھٹکنا پڑا تھا لیکن خدا کا وعدہ تھا کہ ان کے دکھوں کا مداوا ہوگا۔

میں خدا میں یقین نہیں رکھتی لیکن اگر کوئی خدا ہے تو مجھے اس کے پیروکاروں میں شامل ہونے کی کوئی خواہش بھی نہیں۔ ریاکارانہ مصلحت اندیشی مجھے نہیں آتی۔

7 اکتوبر: آدھی رات کو اچانک میری آنکھ کھل گئی ہے دور ونزدیک کوئی بھی نہیں ۔ مجھے اتھاہ تاریکی میں پھینکا جارہا ہے ۔ بہت دور کہیں میرے جاننے والے' میری جانب پشت کئے' نیچے لیٹ رہے ہیں۔ آج پھر میں چونگ نو میں فضول آوارہ گردی کرتی رہی۔ بلیو برڈ میں بیٹھ کر سگریٹ اڑاتی رہی۔ کسی آدمی کی گزرتے گزرتے مجھ پر نظر پڑی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہارا چہرہ جانا پہچانا لگتا ہے۔''

ساتھ وقت گزارنے کی ایک بے ہودہ سی کوشش۔ لیکن ہم ہمیشہ ہی جانے پہچانے چہرے کی دریافت کی امید لگائے رکھتے ہیں کیونکہ اجنبی چہرے' چاہے وہ کتنے بھی پرکشش کیوں نہ ہوں' ماسک کی طرح ہوتے ہیں اور ہمیں احساس تنہائی کے سوا کچھ نہیں دیتے ۔ کبھی تو کوئی جانا پہچانا چہرہ ہوگا جو بارش کے دوران' میرے ساتھ ایک ہی چھتری تلے ہوگا۔

17 کتوبر: پیار کی تعریفیں تو بہت سی ہیں لیکن دوسروں کی نسبت ایک زیادہ سیدھی سادی تعریف دل کو لگتی ہے۔ مرد اور عورت کے مابین منافع بخش تبادلہ۔ دونوں میں سے ہر فریق' اپنی توقع سے کہیں زیادہ دوسرے سے وصول کرنا چاہتا ہے۔ کیا ہوئی چنگ مجھ سے صرف جنسی تعلق چاہتا ہے؟ اور میں اس سے اپنا گزرا ہوا' ضائع شدہ وقت چاہتی ہوں۔ خلائی کیڈٹ میں دوسروں سے کہیں زیادہ برداشت اور ذہانت ہے لیکن اس میں ایک عجیب سی نامردی کی کیفیت پائی جاتی ہے اور میں اس سے بدمزہ ہو جاتی ہوں۔ کوئی بھی ایسا نہیں' میں جسے پانے کی خواہش کروں..................

ماں پوری صبح کچن میں پھیرے لگاتی رہیں۔ اداسی ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ دوپہر میں کچھ اور کرنے کی خواہش میں، وہ سلائی مشین لے بیٹھیں اور میری شادی کے لئے کشن کے غلاف سینے لگیں۔ اس دوران میں جاپان کی کسی کتاب کی ورق گردانی کرتی رہی۔ کوشش کے باوجود میں خود کو مرتکز نہیں کر پا رہی تھی۔ چنانچہ میں کھلی فضا میں جا کر بیٹھ گئی اور پڑھنے لگی۔ تنگ آ کر میں نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ دادی اماں کی کچھ سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے میرے کمرے پر دھاوا بول دیا اور مجھے کوئی خوبصورت گیت سنانے کی فرمائش کرنے لگیں۔

کتاب کا مطالعہ خاصا پھسپھسا ثابت ہوا تھا۔ بوریت سے بچنے کے لئے میں نے پبلک باتھ کا رخ کیا۔ عام کاروباری دن ہونے کی وجہ سے پبلک باتھ ہاؤس میں الو بول رہے تھے۔ سر پر انڈے کی زردی ملنے اور اس طرح کے دوسرے معمولات کے بجائے جن سے میں خاصی الجھا کرتی تھی، وہاں پر موجود عورت نے میرا مساج کرنا شروع کر دیا۔ بینک میں نوکری کے زمانے میں، میں نے یہ عیاشیاں کہاں کی تھیں۔ سو عرصہ دراز کے بعد ایک پرسکون اور آرام دہ کیفیت مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ نوجوان عورت کسی توانا کھلاڑی کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے میرے پورے بدن پر صابن ملا اور شیمپو لگایا۔ کسی بھی لڑکی کی طرح، میں نے بھی خود کو اس کے سپرد کر دیا وہاں لیٹے ہوئے مجھے وقت گزرنے کا کوئی احساس ہی نہیں رہا۔ بس یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرا سانس گھٹ رہا ہے اور میں شدید اذیت میں ہوں۔

بہت پہلے ایک دفعہ ایسا ہوا تھا۔ میرا احساسات غائب ہو گئے تھے اور مجھے اس کیفیت کا مزا بھی بہت آیا تھا۔ عجیب یاسیت اور ناامیدی کا تصوراتی کرشمہ تھا۔ مساج کرنے والی عورت کا ہلتا ہوا سینہ مجھ سے ٹکرا رہا تھا۔ جب میں نے اپنی نگاہیں اٹھتی ہوئی بھاپ پر مرکوز کیں تو مجھے باتھ ہاؤس کی چھت اوپر اور اوپر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کسی مندر کی بلند چھت سے بھی کہیں زیادہ اونچی۔ دوبارہ نگاہیں نیچے آئیں اور میرے اپنے بدن پر پھسلیں تو مجھے صابن کے جھاگ نظر آنے کے بجائے اپنا بدن سیسے کا لگا۔ میں بے پناہ بھاری ہو گئی تھی اور گہرائی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ عورت نے میرے بال چہرے سے ہٹا کر نیچے لٹکا دیئے اور دوبارہ انہیں شیمپو کرنے لگی۔ سر عقبی جانب جھکا ہونے کی وجہ سے سٹیم روم کے دروازے میں لگی کھڑکی پر میری نظر پڑ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بالوں والی ایک نوجوان عورت اپنا منہ تولیے میں لپیٹے آبی بخارات کے درمیان کھڑی تھی۔ غالباً میری بے چینی کی وجہ سے پریشان ہو کر وہ عورت منہ پر کپڑا لپیٹ

کر اس طرف جا کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے وہ آبی بخارات کا کوئی قیدی لگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں سویا نگ کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے' سٹیم باتھ کو گیس چیمبر کے روپ میں دیکھ رہی ہوں۔

گرم پانی میرے اوپر گرنے لگا تو میرا دم اور بھی گھٹنے لگا۔ سویا نگ نے لکھا تھا کہ کوئی بھی تو ایسا نہیں' جس کی خواہش کی جا سکے لیکن اس کے باوجود وہ لوگوں میں کچھ تلاش کرنے کی جستجو میں رہتی تھی۔ می یا نگ جو اسے ''سچائی'' کا نام دیتی تھی۔ لیکن سویا نگ غالباً ایک حقیقی اور جانا پہچانا چہرہ ڈھونڈ رہی تھی ؟ انسان کے دیئے ہوئے زخم' انسان کے ذریعے ہی مندمل ہوتے ہیں۔ لیکن سویا نگ کی بے راہ روی پراگندگی اور انتشار کی حدوں کو چھو رہی تھی

سویا نگ اس رات بھی ڈنر کے وقت تک گھر نہیں پہنچی۔ شام سات بجے مجھے اپنی ایک دوست میگزین رپورٹر سے ملنا تھا لیکن گھر سے نکلتے نکلتے اس کا فون آ گیا۔ اسے کسی نئی کہانی کا کام دے دیا گیا تھا۔ اپنی فوری مصروفیت کی وجہ سے اس نے کہا کہ ملاقات آئندہ کسی مناسب وقت کیلئے اٹھا رکھی جائے۔

ہائی یا نگ اور ابو جلدی گھر آ گئے تھے' چنانچہ ڈنر کی ٹیبل پر' سویا نگ کے علاوہ سبھی موجود تھے۔ میز پر بیٹھتے ہی ابو کو سویا نگ کی غیر حاضری کا پتہ چلا اور فوراً ہی ان کا پارا چڑھ گیا۔

''حد ہوگئی اس کی آزادی اور بے راہ روی کی۔ میں سمجھتا تھا چار بچوں کی پرورش کر کے میں نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا ہے۔'' ان کی آواز خاصی تیز تھی۔

اسی روز دادی اماں نے ماں جی کو الٹی سیدھی سنا کر' ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ مگر اس وقت وہ خاموش بیٹھی' ادھر ادھر دیکھتی رہیں۔ ان کی خاموشی نے ہم سب کو مخمصے میں ڈال دیا۔ ماں جی نے بات بدلنے کے لئے ہائی یا نگ کو متوجہ کر کے کہا۔ کسی کا فون آیا تھا۔ مگر ہائی یا نگ کو سمجھ نہیں آئی اور وہ اچھا کہہ کر دوبارہ کھانے میں مصروف ہوگئی۔

''اگر کوئی تمہارا دوست ہے تو تم اسے گھر کیوں نہیں بلاتیں اور ہم سے ملواتی کیوں نہیں؟

آخر تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ کون سی بات مناسب ہے اور کونسی غیر مناسب۔ مجھے یقین ہے کہ سویا نگ کسی لڑکے سے ملنے جلنے لگی ہے.......... ورنہ وہ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں ہرگز نہ کرتی۔'' ابو کے خیال میں سویا نگ کے سکول چھوڑنے کی وجہ محض اس کی کسی شخص سے دوستی تھی۔ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں بتلایا بھی کہ لڑکیاں اتنی بے وقوف نہیں کہ محض کسی لڑکے کے پیچھے اس طرح برباد ہوتی پھریں۔ سویا نگ' ابو کی سوچ کی حدود سے کہیں زیادہ ذہین اور سمجھدار

تھی۔ دراصل وہ کچھ مسائل میں الجھ کر رہ گئی تھی اور بس۔

''زیادہ چالاکی اور تیزی بھی مسئلہ بن جاتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اتنی تیز طرار ہے نہیں جتنا ظاہر کرتی ہے۔ اگر وہ اتنی ہی عقل مند اور ہوشیار ہوتی تو انٹری ٹیسٹ کے مقابلے میں منہ کے بل نہ گری ہوتی۔'' مقابلے کے متعلق ابو کی گفتگو نے مجھے بری طرح چڑا دیا۔ میں نے غصے میں ان سے براہ راست سوال جڑ دیا کہ آیا ان کے خیال میں کالج صنعتی تربیت کی جگہ ہیں لیکن ان کے چہرے پر فولاد کی سی سختی پا کر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ منہ بند ہی رکھا جائے۔

''کالج بھی مقابلہ کی جگہ ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہاں عیش کرنے کی تربیت دی جانی چاہئے۔ تمہارا کیا خیال ہے' میں نے تمہیں کالج کیوں بھیجا تھا۔ اس لئے کہ دوسری لڑکیوں کی نسبت تمہاری اچھی جگہ شادی ہو' تمہیں ایک اچھی نوکری مل سکے۔''

یہ وہ بات تھی جو ایک باپ ہونے کے ناطے وہ کہہ سکتے تھے۔ ایک تو میری اپنی دوست سے ملاقات ملتوی ہوگئی۔ دوسرے سویا نگ گھر سے غائب تھی۔ میں خاصی بے چین ہو رہی تھی۔ سویا نگ کی واپسی پر گھر میں ہنگامہ ہونا تھا۔ ابو ٹی وی لاؤنج میں جا بیٹھے تھے' جہاں سے وہ سویا نگ کی واپسی پر نظر رکھ سکتے تھے۔ عرصے بعد میں ہائی یا نگ کے کمرے میں جا پہنچی۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ دیوار پر انسانی جسم کی ساخت کا چارٹ لٹکا ہوا تھا۔ فولادی ریک پر' میڈیکل کی موٹی موٹی کتابیں ترتیب وار رکھی ہوئی تھیں۔ البتہ ڈیکوریشن کے طور پر خوبصورت مناظر والا' ایک کیلنڈر ضرور دیوار پر آویزاں تھا۔ ہائی یا نگ مادام بواری کا مطالعہ کر رہی تھی۔

''ارے: یہ بھی کوئی ناول ہے جسے پڑھا جائے؟''

''آج کل تو اس کا بڑا شور ہے جناب۔'' اس نے بھی ہلکے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''کیا خیال ہے' شہر نہ چلیں' ذرا چینج ہو جائے گا؟''

''آٹھ بج چکے ہیں۔ دیر نہیں ہو جائے گی؟'' ہائی یا نگ اس اچانک تجویز پر گڑ بڑا سی گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں شدید ذہنی پراگندگی کا شکار ہوں' سو ہمیں ہوا خوری کے لئے ذرا باہر چلنا چاہئے۔ چونگ نو کی تفریح کا آئیڈیا برا نہیں تھا۔ ''کچھ دن کی بات ہے۔ پھر ہم ایسے پروگرام کہاں بنا سکیں گے؟'' شاید میرے لہجے کی اداسی نے ہائی یا نگ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور وہ لباس تبدیل کرنے اٹھ گئی۔

چونگ نو میں قدم رکھتے ہی' مجھے یہ احساس ہونے لگا جیسے ہم کسی اجنبی جگہ آ گئے ہیں۔عرصہ ہوا' میں رات کے وقت یہاں آئی تھی۔اس وقت مخصوص کپڑے پہنے ہوئے نوجوانوں کے جم غفیر کے درمیان خود کو پا کر دل میں اپنائیت کا کوئی جذبہ نہیں جاگا۔عجیب بیگانگی سی محسوس ہوئی۔ہر جگہ کم عمر لڑکے لڑکیاں بکھرے ہوئے تھے۔واچ شاپ کے آگے' بلند سی بلڈنگ کی سیڑھیوں میں یا بئیر ہال کے داخلے کے دروازے کے سامنے بیٹھے ہوئے۔چلتے پھرتے ہاٹ ڈاگ کا لطف لیتے ہوئے یا یونہی ادھر ادھر چہل قدمی کرتے' سیٹیاں بجاتے اور آوازیں کستے ہوئے' غرض ہر طرف نوجوانوں کا قبضہ تھا۔

وہ ایک بڑی عوامی طاقت تھے' ایک حیرت انگیز انسانی گروہ جو اسٹیبلشمنٹ کی ہر شکل کے خلاف تھا۔ہنگاموں سے نمٹنے والی پولیس فورس کی دو بسیں سڑک کے ایک کنارے میں موجود تھیں۔لیکن کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔قریب ہی لوگوں کا ایک گروہ دائرے کی شکل میں کھڑا ہائی سکول کے گیت گانے میں مصروف تھا۔ایک دوسرے سے کاندھے ٹکراتے اور بمشکل اپنا راستہ بناتے ہوئے ہم انسانوں کے جنگل سے نکل کر ایک بغلی سڑک کی طرف چل پڑے۔ایک بڑی سی کھڑکی میں سے' لکڑی کی میز پر بیٹھا۔لڑکوں کا گروپ بیئر کی چسکیاں لیتا نظر آ رہا تھا۔اس نظارے نے مجھے اکوریم کی یاد تازہ کرادی۔ویڈیو کی ایک دوکان پر بے ہنگم آوازوں کا شور تھا۔ویڈیو کھیل چل رہے تھے۔کہیں جگمگاتی روشنی میں' باسکٹ بال کا میچ جاری تھا۔جہاں کھلاڑی کم اور تماشائی زیادہ کھیل رہے تھے۔

ہم آہستہ آہستہ دوسری جانب چلتے گئے۔چند پورٹیبل سٹال' رنگ برنگی روشنیوں میں جگمگاتے' قطار اندر قطار باقاعدہ کشتیوں کی طرح نظر آئے۔وہاں سنیکس اور شراب کی فروخت جاری تھی۔تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہائی یانگ نے دونوں میں سے کسی ایک کو ٹرائی کرنے کی تجویز رکھی۔میں نے اسے بتایا کہ ایک جگہ میرے ذہن میں ہے۔ہم وہاں بیٹھیں گے۔سو ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔کوئی نو بجے ہوں گے کہ ہم سم تھنگ تک پہنچ گئے۔یہاں ڈرنکس اور سنیکس لی جاسکتی تھیں اور اس کی رنگین کھڑکیاں' اس کی غیر معمولی خصوصیت تھیں۔اندرونی حصہ میں تاریکی کی وجہ سے گاہکوں کو دیکھنا بھی محال تھا۔نشستوں کے ساتھ اونچی اونچی پارٹیشن بنائی گئی تھی۔موسیقی بھی خاصی تیز تھی۔

خالی میز ملتے ہی' میری نگاہ دیوار پر ٹنگے انٹر کام پر پڑی۔سی سی کے انگریزی حروف اس

پر چھپے ہوئے تھے۔ ہر چیز اسی طرح تھی جیسی کیانگ آ ک نے بتائی تھی۔ ویٹر کو بلا کر میں نے اسے جن اور ٹانک کے دوگلاسوں کا آرڈر دیا۔ پھر اس سے انٹر کام کے استعمال کا طریقہ پوچھا۔اس نے وضاحت سے بتایا کہ انٹر کام کا ریسیور اٹھاتے ہی سلسلہ خود بخود ڈسک جوکی سے جاملے گا اور وہ آپ کا پسندیدہ گانا آپ کو سنوادے گی یا آپ کا رابطہ کسی اور بوتھ سے کرادے گی۔

''اس جگہ کا علم تمہیں کیسے ہوا؟'' ہائی یانگ نے مشتبہ انداز میں میری جانب دیکھا۔

''تم کالج میں ہو' کیا تم آج تک کسی ایسی جگہ نہیں گئیں؟''

کچھ ہی ہفتے پہلے' جب میں نے اور چاؤ نے سویانگ اور ہائی یانگ کو ڈنر کی دعوت دی تھی تو اس کے بعد ہم دونوں یہاں ڈرنکس لینے کے لئے آئے تھے۔ بہر حال میں نے' اپنے ذہن میں ابھرنے والے مختلف سوالات' ہائی یانگ سے کرنے شروع کردیئے۔ کیا اسکا کوئی بوائے فرینڈ تھا۔اس کا جواب اثبات میں تھا۔لیکن وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا لڑکا تھا۔جرمن ادب اس کا مضمون تھا۔دونوں کے حالات میں عدم مطابقت کی وجہ سے' ہائی یانگ کا' اس سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔وہ اس کے ساتھ ادھر ادھر گھومتی ضرور تھی مگر ان کے درمیان ایک فاصلہ بدستور موجود تھا۔وہ مادی سائنس کے کسی طالبعلم سے شادی کی خواہاں تھی۔ ایسا شخص جو میڈیکل مضامین میں اس کی مدد کرسکے۔

اسے کوئی پریشانی یا الجھن بھی نہیں تھی کیونکہ مستقبل کے بارے میں اس کے ارادے بالکل واضح تھے۔ ماں جی اور ابو کے ساتھ بھی اس کے تعلقات اطمینان بخش تھے' کیونکہ باہمی توقعات میں کسی طرح کا بھی غیر فطری عنصر نہیں تھا۔'' ہر چیز کی انتہا تک تم کیسے پہنچ سکتی ہو؟ کیا تم زندگی کو کسی کاروبار کی طرح دیکھتی ہو۔'' اگر قانون کے طالبعلم بھی دن رات پیسے خرچ کرتے رہیں' قانون کی ہر کتاب لیں' قانون کا ہر ضابطہ زبانی یاد کرتے جائیں' تب بھی ایک اچھا جج بننے سے پہلے انہیں زندگی کی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔کیا ڈاکٹروں کے معاملے میں صورت حال ایسی ہی نہیں؟''

ہائی یانگ' اپنے منہ میں انگوروں کے چند دانے ڈالے بغور مجھے سن رہی تھی۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ سنجیدہ لہجے میں شروع ہوگئی۔'' تمہارا خیال ہے مجھے کبھی کسی دکھ یا اذیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔میرے نزدیک تم ہو جس کی پرورش پھولوں کی طرح ہوئی ہے۔اور دیکھ

لو بالآخر تمہارے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔کسی کی بیوی بنوگی اور بس یہی خوشی ہے۔اپنے اندرونی تضادات کے اظہار کا جو بھی طریقہ ہائی یانگ نے اختیار کیا' اس سے غرض نہیں۔اہمیت اس کے تخیل کی ہے۔وہ کہتی رہی : میں تو تم سے ہمدردی بھی نہیں کرسکتی۔ بہر حال' وہ اپنے مستقبل کے خوابوں کی بات کر رہی تھی۔ پھر اس نے میڈیکل سکول میں داخلے کا مقصد بیان کیا۔

کچھ عرصہ پہلے' اس نے بلجیم نژاد مارگریٹ یورسنار کا ناول ''ہیڈرئین کی یادیں'' پڑھا تھا یورسنار کا یہ لازوال ناول ایک نامور جرنیل کے بارے میں تھا جو رعم کا حکمران بن گیا تھا۔اس نے اپنی سرزمین کو آزادی اور امن کی روشنی سے جگمگا دیا تھا لیکن بالآخر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔اس ناول کے ایک منظر میں' شدید بیماری کے ہاتھوں مجبور بادشاہ کو ایک ڈاکٹر لولاس سے یہ درخواست کرتے دکھایا گیا کہ وہ اس کے لئے زہر تیار کرے۔لولاس کو ہارڈئین سے شدید ہمدردی تھی مگر اپنے پیشہ ورانہ حلف کی وجہ سے اس نے اس کام سے صاف انکار کر دیا۔بادشاہ نے بار بار اس سے التجا کی اور بالآخر ڈاکٹر سے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔لیکن اس رات لیبارٹری میں اس ڈاکٹر کی لاش ملی۔بادشاہ کی التجا سے مسلسل انکار سے تھک کر اپنے حلف پر قائم رہنے کے لئے ڈاکٹر نے اپنے لئے موت کا انتخاب کرلیا۔''تم سمجھتی تھیں کہ میں میڈیکل سکول اس لئے گئی کہ مجھے پڑھنے لکھنے کا بے پناہ شوق تھا۔ہے نا یہی بات؟'' ہائی یانگ نے مجھ پر ایک بامعنی نگاہ ڈالی۔

میڈیکل سکول جانے کا فیصلہ' ہائی یانگ نے' ناول کے اس کردار سے متاثر ہو کر کیا تھا۔اپنی بہن کی فطرت کا یہ رخ میرے لئے انوکھا تھا۔جیسے ہائی یانگ کو میرے مصائب اور مشکلات کا پتہ نہیں تھا' بالکل اسی طرح میں اس کے خوابوں سے ناآشنا تھی۔چونکہ تصورات مادی صورت میں نظر نہیں آتے اس لئے بھی شاید ہم انہیں اپنے آپ تک محدود رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے سویانگ کی اذیتوں اور تکالیف تک میری رسائی نہیں ہو سکی تھی۔میں اس کی ڈائری سے' اس کی پریشانیوں اور الجھنوں کا اندازہ لگا کر' اس کی مدد کا سوچ رہی تھی مگر اصل اذیت میں تو وہی مبتلا تھی۔کیا اس کے پاس' ان سے نجات کا کوئی راستہ تھا؟

دس بجے کے بعد تقریباً سبھی جوڑے وہاں سے غائب ہونے لگے۔میزیں خالی ہوتی جا رہی تھیں۔ہائی یانگ کو جن اور ٹانک پینے میں اتنا مزا آیا کہ وہ اس کا تیسرا گلاس لے چکی

تھی۔اچانک انٹرکام بج اٹھا۔میں کچھ گھبرا سی گئی۔تاہم ریسیور تو اٹھانا ہی تھا۔

یہ سی سی میز ہے' کسی مردانہ آواز نے پوچھا۔وہ دوخواتین کو خاموش بیٹھے اور جن اورٹانک کا خط اٹھاتے دیکھ کرلطف اندوز ہورہا تھا۔اسی طرح کے چندفقرے کہنے کے بعد اس نے کہا:''اگر مناسب سمجھیں تو تھوڑی بہت گپ شپ ہو جائے؟'' سویانگ کو بھی غالباً ایسی ہی کال ریسیو ہوئی تھی' میں نے سوچا۔ایک اچھا موقع ملا تھا۔دراصل' میں خود انٹرکام پر بات کرنا چاہ رہی تھی۔میں نے فون کرنے والے پوچھا کہ کیا وہ کوئی طالبعلم ہے اوراس نے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔

''میں جمہوری یونیورسٹی میں جاتا ہوں۔ریاضی' قدرتی سائنس اور اینٹی کیمونزم میرے مضامین ہیں۔مجھے علم ہے کہ کسی جاسوس کی رپورٹ کسطرح ہوتی ہے۔H_2O پانی ہے۔میں کیمیا پڑھتا ہوں اور پانی پیتا ہوں۔ٹرگنومیٹری کے فنکشن پڑھتا ہوں جبکہ بلیرڈ کھیلتا ہوں اور اپنی فزیکل ایجوکیشن کی جگہ رقص کرنے جاتا ہوں۔''اس کے لفظوں کا کھیل کسی پہیلی سے کم نہیں تھا۔میں نے بلاسوچے سمجھے اس سے کچھ سوال کر ڈالے' جیسے اس روز وہ کیا کرتا پھر رہا تھا؟

''میں نے منہ ہاتھ دھویا' کچھ کھایا پیا' کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکا پھرا اور پھر یہاں آ گیا۔میں اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزراتا ہوں۔کل رات بھی میں نے اسی طرح دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتے گزاری تھی۔''

''تم ہر وقت گھر سے باہر رہنا کیوں پسند کرتے ہو؟ اپنے گھر والوں کو بتاتے ہو کہ تم گھر سے باہر رہو گے؟''اس پہلو کے بارے میں' میں خاص طور سے متجسس تھی۔

''ہاں' ہاں' بتاتا ہوں انہیں مگر وہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔میں انہیں کہتا ہوں کہ میں کسی دوست کے گھر رہوں گا۔''

''ہفتے میں کتنی دفعہ' تم چونگ نو آتے ہو؟''

''آٹھ دفعہ اوربعض اوقات ایک دن میں دومرتبہ۔''

میں قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور پھر اسے اپنی میز پر آنے کی دعوت دی۔اس کی حس مزاح سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہائی اسکول کا طالب علم نہیں بلکہ کسی کالج کا گریجوئیٹ ہے۔وہ اپنا بدصورت چہرہ دکھانا نہیں چاہتا تھا' یہ اس کے الفاظ تھے مگر چند ہی لمحوں بعد' ایک طویل قامت' صاف ستھرا نوجوان ہماری میز پر آ دھمکا۔خاصا شرمیلا اور کم گو ہونا چاہئے تھا اسے! میں نے

سوچا۔ لمبے لمبے بال اور مناسب لباس پہنے ہونے کے باوجود مجھے اس میں لڑکپن جھلکتا ہوا محسوس ہوا۔

میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ الیکٹریکل انجینئرنگ کررہا تھا۔اس کے دو دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ خارجی دروازے کے نزدیک موجود میز کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے بتایا۔ میں نے جواباً اسے بتایا کہ میری شادی ہونے جارہی ہے اور میں اپنی بہن کے ساتھ محض کچھ ہوا فوری اور دل بہلانے کے لئے یہاں چلی آئی تھی۔ شاید اسے کچھ مایوسی ہوئی ہو۔ میں تو تمہاری بڑی بہن کے برابر ہوں' میں نے کہا' تاہم اگر وہ مناسب سمجھیں تو میں انہیں بیئر پلا سکتی ہوں۔ سم تھنگ سے ہم سب اکٹھے ہی باہر نکلے۔ ہائی یانگ بے یقینی کے عالم میں میری شکل دیکھ رہی تھی۔ خاموش خاموش۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ بیٹھ کر پینا پلانا برا آئیڈیا نہیں۔ خاصی رات ہو چکی تھی۔ سڑک پر کاغذوں' ڈبوں اور نہ جانے کس کس چیز کے ڈھیر کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک سیاہ فام' بڑی مستقل مزاجی سے' اس کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کو' ٹھوکروں سے مزید پھیلائے جارہا تھا۔

''جانے لوگوں کے ساتھ کیا مصیبت ہے' جہاں چاہتے ہیں' کاٹھ کباڑ پھینکنا شروع کردیتے ہیں؟'' میں آہستگی سے بڑبڑائی۔

''وہ غیر مطمئن ہوتے ہیں' اس لئے۔'' اسی شخص کی آواز سنائی دی۔ غالباً اس نے میرا فقرہ سن لیا تھا۔ بے چین اور غیر مطمئن لوگ ____ اپنے چاروں طرف' بلکہ ہر جگہ گندگی پھیلاتے پھرتے ہیں۔''

''انہیں اپنے آپ پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ غالباً یہ نوجوان ہی ہوتے ہیں۔'' اس دفعہ اس نے شراب کے ایک خالی بوتل کو کک ماری۔

ہم ایک قریبی بیئر ہال میں' میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ جلد ہی بیئر کے پانچ مگ ہمارے سامنے آ گئے۔ میں نے آدھا گلاس منگایا تھا جب کہ باقی سب کا پورا پورا مگ تھا۔ سنیکس کا ڈبہ کھولتے ہوئے انجینئرنگ کے طالبعلم نے اپنے باقی دونوں دوستوں کا تعارف کرایا۔ پہلے وہ اس دوست کی طرف متوجہ ہوا۔ جو راستے میں پھیلے کوڑا کرکٹ کو ٹھوکریں مار کر مزید بکھیرتا آرہا تھا۔'' عدم اطمینانی اور بے چینی اس کی فطرت ہے؛ بزنس ایڈمنسٹریشن کا طالبعلم ہے۔ خوب پڑھتا ہے' جلسے جلوسوں میں شرکت کرتا ہے۔ عورتوں سے ملتا ملاتا ہے اور اپنی ماں کا اتنا خیال

کرتا ہے کہ رات گزارتے ہی سیدھا بیوہ ماں کی آغوش میں جا گرتا ہے۔ چوبیس گھنٹے اس کے لئے ناکافی ہیں اس لئے ہم نے اس کا نام پچیس رکھ دیا ہے۔

میرے سامنے بیٹھا ہوا' بڑی بڑی آنکھوں والا لڑکا' بزر تھا۔ جب بھی کوئی پروفیسر اپنے فضول اور بے ہودہ لیکچر کو طول دینے کی کوشش کرتا' پہلے طالبعلم نے بتایا۔ بزر کا کام تھا کہ وہ ساری کلاس کو بتا دیتا کہ پیریڈ ختم ہو چکا ہے۔ بزر نے انجینئرنگ کے طالب علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' اس کا نک نیم سب سے پیارا ہے۔ عریاں فلموں کا بے پناہ شوقین ہے' اس لئے ہم اسے ہارنو کہتے ہیں۔

ہائی یا نگ کی دبی دبی ہنسی نکل گئی۔ مجھے بڑی حیرت انگیز دنیا لگی یہ۔ خالص اور صاف شفاف لیکن ان سالوں میں' میں ایک بات اچھی طرح جان گئی ہوں کہ ہر شے محض جھوٹ کا پلندہ ہے اور بس۔ صرف کھرا پن اور ایمانداری ہی کافی نہیں۔ ممکن ہے کہ پڑھنے میں' آپ اپنا خون پسینہ ایک کر دیں مگر بے ایمانی کرنے والا آرام سے اے گریڈ لے جائے گا۔ آپ کو بے پناہ طاقت اور جرأت چاہئے۔ جب کبھی ہم طلبہ کو دیہاتی سکولوں میں بھیجے جانے کے خلاف شور مچاتے ہیں' انتظامیہ بالائی طبقے کے' فزیکل ایجوکیشن کے طلبہ کو ہم پر مسلط کر دیتی ہے اور وہ ہم پر کبھی بھی ترس نہیں کھاتے۔ اگر آپ کمزور ہیں تو اپنا وجود قائم ہی نہیں رکھ سکتے۔ چاہے آپ آئیوری ٹاور پر ہی کیوں نہ ہوں۔''

مثال کے طور پر' پچیس بات کئے جا رہا تھا' حال ہی میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کا ہیرو کراٹے ماسٹر تھا۔ کوئی آدمی اپنے آپ کو عملی زندگی میں آگے بڑھا ہی نہیں سکتا جب تک اس کے پاس' طاقت' دولت اور شہرت نہ ہو۔ زندگی گزارنے کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں کیونکہ دنیا کا رنگ ڈھنگ ہی یہ ہو گیا ہے۔

اس نے خود بھی پیسے کا انتخاب کیا تھا' اس نے زور دے کر کہا کیونکہ پیسے کے ذریعے جونہی اسے طاقت ملی' وہ ہر شخص کی زندگی کو بہتر بنانے میں' اس کی مدد کر رہا ہو گا۔

''ہم سکول آخر کس لئے جاتے ہیں؟ تاکہ زندگی گزارنے کا بہتر راستہ نکال سکیں ٹھیک ہے نا؟ سچائی کی تلاش' علم کی پیاس' یہ سب باتیں تو پھر بکواس اور جھوٹ ہی ہوئیں نا۔'' اس نے ترش لہجے میں کہا۔ کتابوں کی رسیا' ہائی یا نگ لاتعلق سی تھی۔ وہ ساری باتیں سننے کے باوجود چپ تھی۔ شاید اس کی خاموشی' ان سے اتفاق کا اشارہ ہو۔ سو یانگ کا کہنا تھا کہ زندگی میں کوئی

کشش اور مقصد ہے ہی نہیں ۔ اسی نا امیدی اور یاسیت کی ذہنی کیفیت میں‘اس نے سکول چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہوگا ۔ ’’جانتی ہو‘چونگ نو میں اتنے زیادہ نوجوان کیوں نظر آتے ہیں؟‘‘ پچپس نے پوچھا۔‘‘ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی مخرج چاہتے ہیں ۔ یہاں کوئی چیز بھی منظم صورت میں نہیں۔ ہر چیز بکھری بکھری اور الجھی ہوئی ہے مگر یہی تو زندگی کی لہر بہر ہے‘ زندگی کا مزا ہے‘ یہاں ان کا آنا اور چلنا پھرنا‘انہیں ذہنی سکون دیتا ہے‘‘

یہ تندوتیز ریمارکس سننے میں خاصا مزا آیا۔ میں نے بھی دخل درمعقولات کی ۔‘‘ حیرانی اس بات کی ہے کہ عورتوں سے تمہاری دوستی کس گہرائی کی حامل ہے؟‘‘

’’سچ تو یہ ہے‘اسی سے ہماری صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے ۔‘‘ ’’پچپس نے گویااعلان کیا ۔ہم یہاں آتے ہیں تو پیتے پلاتے بھی ہیں لیکن اصل کام لڑکیوں کا شکار ہے۔ظاہر ہے وہ بھی اسی لئے یہاں آتی ہیں۔خاص طور سے دیر تک یہاں پھرنے والی لڑکیاں۔‘‘

مجھے یوں لگا جیسے وہ صرف ایک رات کی دوستی کی بات کرر ہا ہے ۔میرے لئے ایسی بات ہضم کرنا ذرا مشکل کام تھا۔’’ان لڑکیوں کے متعلق تمہارے کوئی انسانی جذبات نہیں ہوتے؟ ان کے لئے تمہارے دلوں میں کوئی جذبہ ترحم نہیں ابھرتا۔۔تمہیں اپنی بہنوں کا کبھی خیال نہیں آتا۔‘‘ یہ الٹے سیدھے سوالات منہ سے خود بخود نکل رہے تھے شاید اس لئے کہ سویا نگ ابھی تک میرے اعصاب پر سوار تھی۔

’’اگر آدمی خود اپنا خیال نہیں رکھنا چاہتا تو کوئی دوسرا کیا کرے گا۔‘‘ پچپس نے سرد لہجے میں کہا۔ہارنو سمجھا کہ شاید مجھے پچپس کی بات نہیں سمجھ آئی ۔اس نے بات بالکل ہی واضح کردی۔

’’جب ایک مرداور عورت باہم اکٹھے ہوتے ہیں تو ایسی نوک جھونک تو چلتی ہی ہے۔ مجھے بتائیں‘میں لطافت اور پاکیزگی کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کسی محبوبہ میں؟ اس قسم کی سوچوں کا میرے پاس تو وقت ہے نہیں۔جلد ہی میں فوج میں چلا جاؤں گا۔‘‘

گھر لوٹتے لوٹتے آدھی رات گزر چکی تھی۔ ماں جی نے خاموشی سے خارجی دروازہ کھولا اور ہم اندر آ گئے ۔ٹی وی لاؤنج میں روشنی ہورہی تھی۔ابو سویانگ پر بری طرح برس رہے تھے اور وہ کچن کی جانب کے متحرک دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ ہم اندر آئے تو اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔

''اب تم جوان ہوگئی ہو مگر بغیر کسی وجہ کے اور بلا اجازت گھر سے باہر رہتی ہو۔ تم ہمیں سمجھتی کیا ہو؟ تمہاری ماں اتنی شرمندہ ہیں تمہاری وجہ سے کہ وہ تمہارے متعلق بات کرنا بھی نہیں چاہتیں۔'' ہائی یانگ ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتی ہوئی اوپری منزل کی طرف بڑھ گئی لیکن میں سیڑھیوں کی قریبی دیوار کے پاس ہی چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ ابو سویانگ کو برا بھلا کہتے رہے۔ رات آخر اس نے کہاں گزاری تھی؟ اگر وہ کسی دوست کے گھر تھی تو وہ کون تھا؟

ابو وہی باتیں دھرانے لگے تو سویانگ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''باہر رہنے میں خرابی ہی کیا ہے؟'' اس نے غصّے میں تھوکتے ہوئے کہا۔ میں اپنے معاملات بہتر سمجھ سکتی ہوں۔''

''اپنے معاملات خود سمجھ سکتی ہو؛ ہونہہ۔ دیکھیں تو کیا شاندار کارنامے سرانجام دے رہی ہو۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ کھڑے رہیں اور انتظار کرتے رہیں؟''

''بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد؛ والدین کو اولاد کے متعلق بلاوجہ پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ کافی ہوگئی میرے ساتھ۔ اب میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔'' سویانگ نے کہا۔

میں نے سویانگ کے قدم بڑھانے اور ابّو کے اٹھنے کی چاپیں بیک وقت سنیں۔ میں نے دیوار سے سر لگا کر ذرا سا ٹی وی لاؤنج میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ابو نے سویانگ کے تھپڑ کھینچ مارا تھا۔ سویانگ ذرا ڈگمگائی مگر فوراً سنبھل گئی۔ ابو نے شاید ایک ہاتھ اور مارنے کی کوشش کی مگر سویانگ؛ اس وقت ان کی پہنچ سے دور سیڑھیوں کے قریب جا چکی تھی۔

''خبیث کہیں کی'' ابو بری طرح چلائے۔ ان کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ''ابھی تک تو تمہاری ناک اور کان بہتے رہتے تھے اور اب تم راتیں گھر سے باہر گزار کر آتی ہو اور پھر اپنے ماں باپ سے بدتمیزی کرتی ہو۔ ان کا احترام تو کیا خاک آئے گا تمہیں۔ ذلالت کی بھی حد ہوتی ہے!'' میں سویانگ کے پیچھے؛ اس کے کمرے تک گئی لیکن وہ دروازہ بند کر چکی تھی اور میری دستک کے باوجود دروازہ نہیں کھول رہی تھی۔ ہائی یانگ ہاتھ منہ دھو کر؛ باتھ روم سے باہر آئی۔ ہم دونوں نے مل کو سویانگ کو آواز دینا شروع کردی۔ چند منٹ بعد؛ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کر کے سفید نائٹی پہن لی تھی۔ اور بالوں کو کنگھی سے سمیٹ رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟ کوئی خاص بات؟'' اس نے بڑے اطمینان سے پوچھا؛ جیسے کوئی بدمزگی ہوئی ہی نہ ہو۔ میں یہ سوچ کر آئی تھی کہ اس سے ہمدردی کے دو بول بولوں گی مگر صورت حال نے مجھے ہکا بکا کر دیا؛ ہائی یانگ کو تو صورت حال کا پتہ ہی نہیں تھا۔

''تھوڑی دیر بیٹھا نہ جائے؟ میرا کمرہ ہمیشہ تمہارے لئے کھلا ہوتا ہے، تمہیں تو پتہ ہے۔''

''بہتر یہی ہوگا کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔'' سویا نگ نے نسبتاً دھیمی مگر غصیلی آواز میں کہا اور فوراً ہی کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

ایک ہفتے کے بعد، سویا نگ نے دوبارہ گھر سے باہر رہ کر، گویا اعلان جنگ کر دیا۔ اس دفعہ وہ اکٹھی دو راتیں گھر سے باہر رہی۔ امی کا دکھ ان کے چہرے پر لکھا تھا اور میں ابو کا سامنا کرنے سے بچنے کی خاطر رات کا کھانا اور دیر سے کھا رہی تھی۔

جس روز سویا نگ گھر سے گئی ہے، وہ سارا دن میں نے اپنی سسرال میں گزارا۔ بینک سے واپسی کے بعد، چاؤ مجھے گھر چھوڑ گئے۔ اگلی صبح تک مجھے اور ماں جی کو اطمینان سے بیٹھنا اور کوئی بات کرنا نصیب نہ ہوسکا۔ ماں جی نے مجھ سے پوچھا کہ سویا نگ کا کوئی بوائے فرینڈ تو نہیں۔

جواب دینے میں مجھے ہچکچاہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں انہیں ہوئی جنگ کے بارے میں بتا نہیں پا رہی تھی۔ پتہ نہیں ماں جی کا کیا ردعمل ہو، میں خود بھی اس حقیقت کو قبول نہیں کرسکی تھی۔

''سویا نگ ایسی عمر میں ہے۔'' میں نے جواب دیا جہاں لڑکیاں وقتاً فوقتاً دوستوں سے ملتی رہتی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس کی کسی سے بھی گہری دوستی نہیں۔ سویا نگ کا گھر سے باہر رہنا غالباً کسی بوائے فرینڈ کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کے عمومی لائف سٹائل کے جز کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔ ڈسکو کلب اور ویڈیو ٹی روم ایسے لڑکے لڑکیوں سے ساری ساری رات بھرے رہتے ہیں۔'' میں نے وضاحت سے بتایا۔

''وہ ساری ساری رات ایسی جگہوں پر کیوں گزارتے ہیں؟ کیا وہ تھک نہیں جاتے؟''

''لگتا ہے کہ وہ گھر کی نسبت ان جگہوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔''

''اپنے گھر والوں سے ان کی ان بن رہتی ہوگی۔'' ماں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ گویا انہیں یقین ہو کہ ان کے گھر میں تو کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔'' یہ سویا نگ کیوں غلط راستے پر چلی جا رہی ہے؟ میں نے اپنی نگاہیں ماں جی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ پھر اپنا سر ہلایا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو آسانی سے سمجھ آ سکیں۔ لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ ہم لعن طعن کے ذریعے اس لڑکی کو ٹھیک کرسکتے ہیں۔'' میں نے خاصے ترش لہجے میں کہا۔

''تمہارے ابو بڑے درشت اور غصیلے مزاج کے آدمی ہیں اور ہاں، ان کے خیالات بھی پرانی طرح کے ہیں۔'' میری بات کی حمایت کرنے کے باوجود، وہ ابو کی طرف داری سے باز

نہیں آئیں۔''میں تم لوگوں کے کمروں میں جاتی ہوں تو اکثر وہاں سگریٹ کی بو باس محسوس ہوتی ہے۔ میں نے تمہارے ابو کو بتایا تو وہ کہنے لگے آج کل کے سارے بچے ایک ہی جیسے ہیں۔انہوں نے تو مجھے بھی کہا کہ زیادہ پریشانی ہوتو ایک آدھ سگریٹ میں بھی پی لیا کروں ایسے موقعوں پر وہ خاصے ماڈرن نظر آتے ہیں' جانتی ہونا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔جذباتی اور غصیلے ابو'اس معاملے میں بہرحال وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کررہے تھے۔میں ابو کو ناپسند نہیں کرتی۔

ناشتے کے بعد'میں سیدھی سویا نگ کے کمرے میں چلی گئی۔ ہر طرف سگریٹ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے میں موجود ایش ٹرے پر نظر ڈالی تو سگریٹوں کا ایک انبار'اس میں ڈھیر تھا۔میں نے کھڑکی کھول دی۔اس کی رضائی بستر پر کھلی پڑی تھی۔اس کے کپڑے انتہائی بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑے تھے۔دو کتابیں فرش پر گری ہوئی تھیں۔۔ والٹیئر کی شاعری کا مجموعہ اور ڈارون کی''حیات کا مبداء''

سویا نگ کی ڈائری میں تازہ ترین اندراج'ابو کے اسے تھپڑ مارنے کے واقعے سے متعلق تھا۔

شور اور ہنگامہ گزر گیا اور اب اتنا سکوت ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔لیکن اس سکوت اور طمانیت میں بھی کچھ نہ کچھ غیر معمولی کیفیت ہے جو میرے بدن کی پور پور میں گھس رہی ہے۔ یہ میرا کمرہ' کمرہ ہی نہیں لگتا' مجھے ایسا کمرہ درکار ہے جہاں ننھی زخمی بھیڑ سکون سے سو سکے۔ حیرت سے پتھرائی ہوئی اس ہرنی کے دل کو چین دے سکے اور زخموں سے چور روح کو دلاسے دے سکے ۔شاید مجھے ایسا کمرہ کبھی نہیں مل سکے گا ۔ایون وان گاخ ونسنٹ نے بیڈ چیمبر میں اپنے مخصوص پیچیدہ انداز میں' مگر کس خوبصورت اور زندگی سے بھرپور ماحول کی منظر کشی کی ہے۔لیکن وہاں بھی چین وسکون کے بجائے پریشانی کا احساس ہوتا ہے۔ بھرے درختوں کا فرش'جس کا سرخی مائل براؤن رنگ بمشکل ہی نظر آتا ہے۔غیر واضح اور گرد آلود شیشہ'بغیر چمک دمک کے' قرمزی کمبل............سویا نگ اس روز بے پناہ اداس رہی ہوگی

اپنے ہی کمرے کے بارے میں اس کی باتیں' کتنے گہرے دکھ کا اظہار تھیں اس کے موازنے میں اگلا اندراج چند دن بعد کیا گیا۔یہ خاصا ہلکا پلکا اور صابن کے بلبلوں کی طرح تھا۔ میں اپنے بال دھوتی ہوں اور گیلے بالوں کے ساتھ ہی لیٹ جاتی ہوں۔تھوڑی بہت

آئس کریم چکھتی ہوں۔ نہ کوئی بے چینی' نہ بے اطمینانی۔۔۔انسانی فطرت ایسی ہی تو ہے' کسی معصوم بچے کی طرح بے پروا۔

بس اچانک ہی' ایک میک اپ کٹ پر لکھے ہوئے الفاظ پر میری نگاہ پڑی' یوں تو اس کا معنی سنگھار اور خودنمائی ہے مگر حروف کے ذرا سے پھیر کے ساتھ اس کا مفہوم اکارت' بیکار میں بدل جاتا ہے اور اس لفظ کی یہی معنویت مجھے پسند ہے۔ سب سے زیادہ بیکار اور فضول چیزوں میں سے ایک جوش اور ہیجان ہے۔ یہ جلد پر لگائی گئی کسی خوشبو کی طرح ہوتا ہے۔ آخر میں ....اگر زندگی ہے تو............بس جوش اور ہیجان ہی باقی بچتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

ایک لائن چھوڑنے کے بعد' سویانگ نے شم چوانگ کی کہانی کا ایک پیرا نقل کیا ہوا تھا۔ وہ بچوں کے کسی رسالے میں اس کہانی کا آسان ترجمہ' ایک دن' رات گئے تک پڑھتی رہی تھی۔ شم چوانگ کی اپنے باپ سے جدائی کا منظر اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔ دنیا میں کسی کی شخصیت اتنی غیر متوازن اور متضاد بھی ہوگی؟ اس عمر میں کہانی پڑھتے پڑھتے آدمی جذباتی ہو ہی جاتا ہے۔ سبھی یہ بات جانتے ہیں۔ میں کچھ دیر' سویانگ کے کمرے میں خالی الذہن بیٹھی رہی۔ پھر می یانگ کو ٹیلی فون کرنے اٹھی۔ خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہی تھی۔ غالباً آج اس کی کلاسز نہیں تھیں۔

میں نے اس سے استفسار کیا کہ وہ سویانگ سے ملی ہے یا نہیں۔

''نہیں' کافی دن ہوگئے ملے ہوئے۔''

''کوئی خاص بات ہوگئی کیا؟'' می یانگ جو نے' تھوڑا سا وقفہ دے کر پوچھا۔

''پچھلے دو روز سے وہ غائب ہے اور ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں۔ میں اس کے بارے میں تم سے مزید کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' دوسری طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں ہلکی سی آواز میں گویا خود سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ممکن ہے ان باتوں کا مجھ پر خوشگوار اثر ہو۔''

می یانگ نے جواب دیا کہ دو بجے اس کی کوئی کلاس نہیں اس لئے سکول کے قریب کارڈ وڈ ٹی روم میں مل بیٹھنا مناسب رہے گا۔

داخلی دروازے کے پاس ایستادہ شیر کے مجسمے کو تقریباً چھوتی ہوئی میں اندر داخل ہوئی ہمارے شمال مغربی صوبے کے ایک لوک گیت کی مدہم موسیقی فضا میں گونج رہی تھی۔ دیوار پر آویزاں ایک قدیم عروسی لباس کا حسن میری نگاہوں میں تیرنے لگا۔ چھت کو رنگا رنگ پتنگوں

سے سجایا گیا تھا۔۔۔ یہ بھی عجیب دلفریب منظر تھا ۔عارضی میز کے طور پر مستعمل وڈ چیسٹ، تتلیوں کی شکل کے خوبصورت شمع دان، فریم میں سجی لوک تصویریں اور ایسی بہت سی اشیاء ادھر ادھر نظر آ رہی تھیں۔ کلاسیکی طرز کا یہ ٹی روم بہت پر سکون لگا۔ میں ابھی سیٹ پر بیٹھ کر مشروب کا آرڈر دینے سوچ ہی رہی تھی کہ می یا نگ جو نے میرے سامنے کی سیٹ سنبھال لی۔

''پسند آئی یہ جگہ۔ میں نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔'' آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں ہماری ثقافت بھی جھلکتی ہے۔ می یا نگ جو کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے بتایا کہ پچھلے سال انہی دنوں وہ اور سویا نگ یہاں بہت زیادہ آتے رہے تھے

''پے انسوری نامی نغموں کی ریکارڈنگ، خاص طور سے سویا نگ بہت شوق سے سنا کرتی تھی۔'' سویا نگ پے انسوری پسند کرتی تھی؟ میرے چہرے پر یقیناً حیرت نقش ہوگئی ہوگی۔

''گذشتہ خزاں میں سویا نگ نے پے انسوری کلب بھی جوائن کیا تھا۔ یہ لوگ ہفتے میں ایک بار کٹھے ہوا کرتے تھے۔'' می یا نگ جو کہہ رہی تھی۔ گھر میں کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا؟'' اسی اثنا میں ویٹریس میرے لئے رائس ڈرنک اور می یا نگ کیلئے مور پنکھ چائے لے آئی۔ چائے کا نام مور پنکھ اس لئے پڑا کہ اس کے پتوں کی شکل بالکل مور پنکھ کی طرح ہوتی ہے۔ چائے پیتے ہوئے، میں نے اپنی یادداشت کو کنگھالنے کی کوشش کی کہ آیا کبھی میں نے پے انسوری موسیقی سویا نگ کے کمرے میں بھی گونجتی سنی تھی۔ ہاں، یاد آیا، ایک بار سنی تھی، غالباً اتوار کا دن تھا۔ راہداری کی صفائی کرتے ہوئے، مجھے یہ موسیقی سنائی دی تھی۔ گانا تھا'' ''سرخ دیوار کا گیت۔'' اسے غیر معمولی حرکت جانتے ہوئے، لاشعوری طور پر میں نے سویا نگ کے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اندر دیکھا تو بظاہر وہ سوتی نظر آئی۔ فرش پر بے ترتیبی کے عالم میں، سر دروازے کے قریب تھا اور باقی جسم کمرے کی جانب۔

''آخر کس وجہ سے وہ پے انسوری نغموں کی جانب متوجہ ہوئی تھی؟''

می یا نگ جو نے اپنے کپ میں چائے انڈیلی۔'' اسکا کہنا تھا کہ جن دنوں وہ رقص کی تربیت لے رہی تھی، اسے روایتی موسیقی کے ان دلآویز نغموں سے بے پناہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ غالباً حقیقت بھی یہی رہی ہوگی۔ میں نے سوچا۔''اور ان نغموں کو گاتے ہوئے، وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی تھی۔'' وہ کن باتوں سے اپنے آپ کو بوجھل محسوس کرتی تھی؟ اور اب اسے ان گیتوں میں کوئی دلچسپی نہیں؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ یہ کیا کر رہی ہوں میں، اپنی ہی بہن

کے بارے میں دوسروں سے پوچھ رہی ہوں۔۔اسی گھر کی چھت تلے رہنے والی میں' لگتا ہے' کوئی دوسری تھی۔می یانگ جو نے چائے کا گھونٹ لے کر' اپنا گلا صاف کیا اور کہنے لگی۔ ''سمیسٹر ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے کلب چھوڑ دیا تھا۔وہاں موجود دوسرے نوجوان روایت کا مذاق اڑاتے تھے اور وہ اسے برا لگتا تھا۔اس کے نزدیک یہ محض جذباتی پن تھا اور وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔وہ انہیں موردالزام ٹھہراتی تھی کہ وہ روایت کی تعلیم لیتے ہیں اور باتیں دل ودماغ کی آزادی کی کررہے ہوتے ہیں' حالانکہ آزادی کی اصل روح ان میں سرے سے ہوتی ہی نہیں۔''

بات میری سمجھ میں آ گئی۔آج موسیقی کے طلبہ کوریائی دھنوں کی پیروی میں فخرمحسوس کرتے ہیں۔اسے کوئی چاہے تو ثقافتی یک جہتی کا نام بھی دے سکتا ہے۔سویانگ بھی غالباً اسی قومی ہیجان کا شکار ہوگئی تھی۔اوراسی تحریک کے نتیجے میں وہ پےانسوری سیکھنے لگی تھی۔

میں سویانگ کی ذہنی کیفیت کومحسوس کرنے کیلئے ٹامک ٹویاں ماررہی تھی۔اورمی یانگ کسی موضوعی تحقیق کی طرح اس معاملے میں حتی الامکان مدد کررہی تھی۔موسم بہار میں سویانگ اس شوق سے لاتعلق ہوگئی۔می یانگ جو کا خیال تھا کہ اس کی وجہ کلب کے دوسرے اراکین سے اسکا اختلاف تھا۔جس دن کلب کے نئے اراکین کا استقبال کیا جارہا تھا' سویانگ نے انتہائی لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے' سب کے سامنے سگریٹ پینا شروع کردی۔لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔میں خود بھی یہ بات سن کر متحیر رہ گئی۔

می یانگ جو نے بتایا کہ اس نے ایک بار سویانگ کو کسی لڑکے کے ساتھ' سر بازار' بری طرح الجھتے ہوئے دیکھا تھا۔اس بیچارے نے صرف اتنا کہا تھا کہ سویانگ کو عورت ہونے کے ناطے' دن دہاڑے شراب نہیں پینی چاہئے۔''لڑکیاں ایسی بات سن کر' عموماً چپ ہو جاتی ہیں اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔لیکن سویانگ نے ایسا نہیں کیا۔اس نے مجھے بتایا کہ لڑکپن کے کسی بھی مرحلے میں' اس نے ایسی بے ہودہ بات نہیں سنی تھی۔وہ تو اسے سرراہ تھپڑ مارنا چاہ رہی تھی۔آخر کسی کو کیا حق ہے کہ وہ عورتوں کو بتاتا پھرے کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔''

''ہاں' سویانگ ایسی ہی ہے۔'' ایک آہ میرے منہ سے نکلی۔میں اس سے بالکل متفق تھی۔سویانگ نے مخلوط تعلیمی ادارے میں آ کر غلطی کی تھی۔می یانگ جو نے بتایا۔''خواتین کے کالج میں وہ اپنی مرضی کی مالک خود ہوتی ہیں۔لیکن مخلوط اداروں میں غیرمعمولی ذہین خواتین یا

دوسروں کی توقعات سے ہم آہنگی پیدا نہ کرنے والی خواتین اپنے لئے خاصی مشکلات پیدا کر لیتی ہیں اور ہاں' کلب کا صدر ہمیشہ کوئی مرد ہی ہوتا ہے۔'' اس نے مزید کہا۔ میں نے حیرت سے اپنا سر ہلایا: کیا واقعی خواتین کا کالج سویا نگ کے لئے مناسب ہوتا۔ جب اس نے پہلی بار داخلے کا امتحان دیا تھا تو ماں جی اور ابو دونوں نے ہی' اسے لڑکیوں کے سکول میں جانے پر زور دیا تھا۔ ابو کی آزمودہ رائے تھی کہ عمر کے اس حصے میں' لڑکے لڑکیاں باہم مقابل ہوتے ہیں' سو جو لڑکیاں مخلوط اداروں میں جاتی ہیں' انہیں لڑکوں کے مقابل ہونے کی وجہ سے' ان کی نفرت کا نشانہ بننا پڑ جاتا ہے۔ یہ تھی ابو کی دوراندیشی مگر سویا نگ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ لڑکیوں کے سکول' جہاں بڑی بہن پڑھتی رہی ہے' اسے بالکل پسند نہیں۔

''وہ لڑکیوں کے سکول میں نہیں چل سکتی تھی اور وہ ان مخلوط سکولوں میں بھی نہیں چل پائی۔'' میں کوئی بھی تجزیہ کرنے سے قطعی قاصر تھی۔ مجھے سویا نگ کے سکول کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں تھا' یہاں بھی می یانگ جو نے' اپنی بہن کو سمجھنے میں' میری خاصی مدد کی۔ میں میوزک سکول کی گریجوایٹ تھی مگر سویا نگ نے پے انسوری کی تربیت کے بارے میں مجھے ایک لفظ بھی نہیں بتایا' حیرت ہے۔ بات چیت جاری رکھنے کی خاطر می یانگ جو نے اپنی اگلی کلاس بھی چھوڑ دی۔ میں می یانگ کی سرگرمیوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی سو میں نے ادھر ادھر کے سوالات کرنا شروع کردیئے۔ دولت پرستی اور اصلاح پسندی جیسی اصلاحات کا استعمال کرتے ہوئے می یانگ جو نے وضاحت کی کہ کس طرح سماج کی مرکزی طاقت کو۔۔ جس کا ذرائع پیداوار پر مکمل کنٹرول ہوتا ہے۔۔ حقیقتاً سماج سے ہی خارج کردیا جاتا ہے۔ پھر وہ مزدوروں کی تحریک کے بارے میں بتاتی رہی۔

''اگر تم اس نظریئے کو قبول کر بھی لو' پھر بھی اسے دلی طور پر محسوس نہیں کرسکتیں۔'' می یانگ نے کہا۔ پھر اچانک ہی اس نے پوچھا: ''اگر تم کوئی جادوگر ہوتیں تو کیا کرتیں؟''

''اچھا!'' خاصا دلچسپ اور انوکھا سا سوال تھا۔ بچپن میں ایسی بہت سی خواہشیں ہوتی تھیں۔ مثلاً ''اڑ کر' اپنی سہیلی کے کمرے میں پہنچ جانا تاکہ اسے حیرت زدہ کرسکوں۔ لیکن اب۔ میں اپنے ان خوابوں میں مگن تھی اور می یانگ جو مجھے دیکھے جارہی تھی۔

''میں اپنے جادو کو انصاف کی مدد کے لئے استعمال کروں گی۔'' اس نے بلا سوچے سمجھے کہا۔ شاید بچپن سے ہی یہ اس کا خواب تھا کہ وہ جادوگر بن کر' ان خبیث لوگوں کو عبرتناک

سزا دے جو کمزوروں پر ظلم توڑتے ہیں۔ روایتی داستانون کے نیک دل کرداروں سے وہ خاصی متاثر لگتی تھی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اس کے خوابوں کا زندگی کے حقائق اور اس کے اپنے نظریات سے گہرا تعلق تھا۔ آخر بلاوجہ تو...... مارچ ۱۹۱۹ء کی جاپان سے آزادی کی تحریک کی ہیروئن یوکوان سن کے نام پر......اسے سکول میں یوکوان سن کا نام نہیں دیا گیا تھا۔

''انصاف کا لفظ غالباً عرصہ دراز سے میرے تحت الشعور میں دبا ہوا تھا۔ دس سال بعد' جب یہ لفظ دوبارہ میرے سامنے آیا تو کچھ اس طرح کہ میرا نک نیم ہی انصاف پڑ گیا۔ کالج میں آنے کے بعد' میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنی جوانی دنیا کی سب سے خوبصورت چیز کے لئے وقف کردوں گی۔ اس وقت میں خود بھی اس خوبصورت چیز سے لاعلم تھی۔ بعد ازاں' اسے میں نے خود اپنے اندر دریافت کیا۔ انصاف' خوبصورت ترین چیز۔''

انصاف کے کسی بھی نظریئے کی نسبت' ان الفاظ میں سچائی کی نغمگی کہیں زیادہ تھی۔ کتنا دلکش اور حسین رخ تھا یہ می یا نگ جو کا' کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے' میں نے سوچا۔ ''خواتین کی تحریک جیسی سرگرمیوں میں دلچسپی لینا' اس کے لئے خاصا مفید رہے گا۔'' می یا نگ جو نے سویا نگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' وہ عورتوں کے مسائل اچھی طرح سمجھتی ہے کیونکہ وہ خود ان مسائل سے دوچار رہی ہے لیکن اس میں ثابت قدمی نام کو نہیں۔ ممکن ہے یہ اس کے ماحول کی وجہ سے ہو۔ ایک طرف وہ اپنی دولت مند دادی سے نفرت کرتی ہے۔ ماں باپ کی وہ باغی ہے۔ ان کے بورژوا نظریات اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ دوسری جانب' تمام تر آسائشوں اور آسایئوں کے باوجود' وہ اطمینان' سکون اور آسودگی کے مفہوم سے ناآشنا ہے۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ بورژوا نظریئے کی اصطلاح میرے کانوں میں پڑی اور اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ اس کی ڈائری کے مطابق' کہیں انہی وجوہات کی بنا پر تو' سویا نگ اپنے گھر والوں کو ناپسند نہیں کرتی تھی؟ ہمارے گھرانے میں زندگی کا تمام تر رہن سہن بورژوا نظریے ہی کا عکاس تھا۔ ''سویا نگ کی شخصیت کا ایک رخ اور بھی ہے' جو حقیقت کا ادراک نہیں کرتا۔'' می یا نگ جو کہتی جا رہی تھی۔'' وہ ہمیشہ الجھنوں کا شکار رہتی ہے۔ اس میں تبدیلی کی خواہش تو موجود ہے لیکن مجھے پتہ نہیں کہ اس میں اپنے اندر کی تبدیلی کا بھی کوئی تصور ہے یا نہیں؛ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ وہ تباہی کی سمت بڑھ رہی ہے۔ اپنی توقعات کی وجہ سے' میں اکثر اس پر تنقید کرتی رہتی ہوں لیکن لگتا ہے وہ کچھ کر نہیں سکتی۔''

''تم دونوں ہی اپنے اپنے معاملات میں حد سے زیادہ ذہین ہو۔'' میں می یانگ جو سے اختلاف نہیں کر سکی لیکن اب بھی میرے ذہن میں چبھن سی تھی۔اس نے مادہ پرستی کے ہاتھوں تنہا ہونے والوں کو بہت اجاگر کیا تھا۔کیا وہ روحانی طور پر تنہائی کا شکار ہونے والوں کو نظر انداز نہیں کر رہی تھی؟ می یانگ جو نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔اس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔''سویانگ ایک خارجی کردار لگتی ہے۔وہ انسانی رشتوں' واقعات اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے ایک خاص فاصلہ رکھتی ہے اور اسی انداز میں وہ اردگرد کی ہر شے پر نظر ڈالتی ہے۔''

میں نے می یانگ سے پوچھا کہ کیا وہ ہوئی چنگ کے بارے میں یا اس کے سویانگ کے ساتھ تعلق کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔میں ان کے باہمی تعلق کے متعلق واقعتاً جاننا چاہتی تھی۔

''سویانگ نے مجھے کبھی اپنے بوائے فرینڈ کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔لیکن اگر میں اس سے واقفیت ظاہر بھی کروں تو اس کا تمہیں کیا فائدہ؟'' می یانگ جو نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔بات یہ ہے کہ میں بری طرح پریشان ہوں۔اور ہاں' کیا آپ نے کہا تھا کہ وہ اس کے متعلق جانتی ہے............''

''میں شرطیہ کہہ سکتی ہو کہ اسے علم ہے۔وہ اور سویانگ ہمیشہ اکٹھے ہوتے ہیں۔میرا اس سے ملنا جلنا ذرا کم ہی ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے'اس کے لہجے میں خاصی تلخی تھی۔

''میں سمجھ گئی تمہاری بات'' میں نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہا۔میں گفتگو کا اختتام کرنا چاہتی تھی لیکن می یانگ جو نے فوراً ہی کہنا شروع کر دیا۔'' سویانگ ہائی سکول کی کوئی خود پسند یا بد دماغ لڑکی تو ہے نہیں کہ آدمی اس کے اردگرد کے لوگوں سے ملنا جلنا زیادہ پسند کرے؟ جب ملنا ہے تو اسی سے کیوں نہ ملا جائے۔'' ایک لمحے کے وقفے کے بعد اس نے کہا'' وہ کوئی بیوقوف نہیں جو اپنے دوستوں کی وجہ سے عجیب وغریب نظر آنے لگے۔وہ لوگوں کا تجزیہ کرنے کی زبردست ماہر ہے۔''

میں اس سے متفق تھی۔اس نے خاصی کھری کھری باتیں کی تھیں اور وہ کہیں بھی غلط نہیں تھی۔میں ہوئی چنگ سے اگر مل بھی لوں تو اس سے کیا کہوں گی؟

سویانگ دو دن گھر سے باہر رہنے کے بعد واپس لوٹی تو ابو کی گونجدار آواز سارے گھر میں پھیلتی محسوس ہوئی۔اس کی وجہ سے گھر میں اکثر ہنگامے کی سی کیفیت رہتی تھی۔ابو شدید غصے کے عالم میں' اس کے منتظر تھے اور وہسکی پیے جا رہے تھے۔سویانگ لوٹی تو غالباً گیارہ بجے

تھے۔شراب کی بوٗ اس کے جسم میں بسی لگتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ چپ چاپ ابو کے سامنے کھڑی رہی اور ابوٗ گھر کا سربراہ ہونے کے ناطےٗ اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کے درپے تھے۔اس کی خاموشی نے ابو کا پارہ اور بھی چڑھا دیا۔

''اگر تم کسی کی بات سن ہی نہیں سکتیں تو تم جانور ہوٗ جانور۔تم خود کو اشرف المخلوق سمجھتی ہوٗ لائق اور عقلمند جانتی ہو خود کوٗ بے کار لڑکی؟''

''اشرف المخلوق؟ آپ مذاق کر رہے ہیں؟'' سویانگ یہ کہہ کر گویا اپنی ہی تحقیر کر رہی تھی لیکن اس کے رویئے میں گستاخی بدرجہ تم موجود تھی۔

بالآخرٗ گرم مزاج ابو غصے کی شدت میں اٹھے اور پوری طاقت سے اس سٹول کو الٹ دیا جس سے سویانگ سہارا لئے کھڑی تھی۔نتیجتاً سویانگ بھی چاروں شانے چت فرش پر جا گری۔ پھر ابو نے لڑھکتے سٹول کو روکنے کے لئے ٹانگ آگے بڑھائی جو اس کے بجائے سویانگ کو جا لگی۔ میں بے بس کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔

یہ حادثہ انجانے میں ہوا تھا لیکن جب ہو ہی گیا تو ابو اور زیادہ شدت سے چیخنے لگے۔ ''اگر تم نے آئندہ ایسی خباثت کی تو پھر گھر میں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر تم نے یہ جرأت کی تو میں تمہاری یہ نازک ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا''

غالباً نشے کی زیادتی کی وجہ سے سویانگ کی طبیعت بہت بوجھل تھی۔شاید اسے بخار بھی تھا۔ میں نے اسے زمین سے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے ہی الجھ پڑی۔ وہ مجھے دور دھکیلنا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اسے اوپری منزل تک لے گئی۔اوپر پہنچتے ہی اس نے میرے ہاتھ جھٹکے اور سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

فوراً ہی موسیقی شروع ہوگئی۔شروع میں ڈرم کی تیز آواز آئیٗ بالکل ویسی ہی جیسے ہائی آ ک کے تہہ خانے سے آتی تھی۔ پھر مجھے موزارٹ کا مرثیہ سنائی دینے لگا۔ یہ ریکارڈ بار بار بجتا رہا۔میری نیند اڑ گئی۔ میں اوپری منزل کے باتھ روم کی طرف جانا چاہ رہی تھی لیکن دیکھا تو میں نچلی منزل پر پہنچی ہوئی تھی۔ حد تھی غیر حاضر دماغی کی بھی!

سویانگ کے کمرے کا دروازہ اگلی صبح بہت دیر تک نہیں کھلا۔ گیارہ بج گئے تو میں نے دروازے پر دستک دی مگر جواب ندارد۔ میں نے دو تین دفعہ چیخ کر سویانگ کو آوازیں دیں کہ وہ ناشتہ کر لے۔ بالآخر بہت ہی دھیمی آواز میں اس نے ناشتہ کرنے سے انکار کر دیا۔دوپہر کے

وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اتفاقاً فون میں نے ہی اٹھایا۔ دوسری جانب کیا نگ آ ک تھی۔ میں نے سویا نگ کو بلانے کے بجائے' خود ہی اس سے سلام دعا شروع کر دی۔

''کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا؟''

''نہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ پرسوں اپنی نوٹ بک کیفے میں بھول گئی تھی۔ ممکن ہے وہ اسے تلاش کر رہی ہو۔''

''پرسوں تم لوگ ڈسکو گئے تھے۔''

''اس نے تمہیں بتایا تھا کہ ہم ڈسکو گئے تھے؟'' کیا نگ آ ک کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں حیرت سے پتھرا گئی۔ اس وقت کمرے میں سکوت طاری لگتا تھا۔ میں نے سویا نگ کی طبیعت کی خرابی کا بتا کر ٹیلی فون بند کر دیا۔ ایک بار پھر میں سویا نگ کیلئے ناشتہ لے کر اس کے کمرے کے دروازے پر گئی اور دستک دینے لگی۔

''کیا تم ٹیلی فون سننا بھی نہیں چاہتیں۔'' بالآخر دروازہ کھل گیا۔ میں نے دروازے میں پاؤں اڑا کر اسے ایک طرف کیا اور زبردستی کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں نے اسے کیا نگ آ ک کے ٹیلی فون کا بتایا اور ٹرے اس کے سامنے فرش پر رکھ دی۔

''باجی' تم میری پرائیویٹ نرس بننے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟'' سویا نگ بگڑے لہجے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں خمار آلود ہونے کے باوجود' اس کے چہرے پر تناؤ تھا۔

''تم سویا نگ آ ک سے ملنے گئی تھیں؟'' اس نے قطعی غیر متوقع طور پر سوال کر ڈالا'' تم نے ایسا کیوں کیا؟'' گھبراہٹ میں مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے کافی اس کی طرف بڑھا دی۔ کچھ سوچ کر میں نے کہا؟ ''مجھے کچھ پتہ نہیں کہ تمہارے ذہن میں کیا کھلبلی مچی ہوئی ہے۔''

''کیا یہ سب باتیں کیا نگ آ ک کو پتہ ہونی چاہئیں؟'' اس نے کپ خاصی بدتمیزی سے فرش پر رکھا اور غصے میں بولی۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔'' وہ زیادہ تر تمہارے ساتھ ہی رہتی ہے تو تم دونوں میں کچھ نہ کچھ یکسانیت بھی ہوگی۔ مجھے پتہ ہے کہ رات رات بھر گھر سے باہر رہنا' نوجوانوں کو بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن کیا تم شائستہ انداز میں گھر والوں کو مطلع نہیں کر سکتیں کہ تم گھر سے باہر رہو گی ؟ ہم ذہنی طور پر بری طرح پریشان ہیں' جب سے تم نے سکول چھوڑا ہے۔ تمہیں یہ بات سمجھنی چاہئے کہ ابو آگ بگولا کیوں ہوتے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ میں اپنی تلخ کلامی کو محسوس کرتی' سویا نگ اٹھ کھڑی ہوئی اور اردگرد کوئی

چیز تلاش کرنے لگی۔ وہ میری بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے انتہائی چڑ چڑے لہجے میں کہا۔'
'تم ڈسکو جاتی رہیں۔ لگا تار دوراتیں؟''

''تو' میں کہیں بھی گئی۔ کیا غلطی کی میں نے۔'' وہ اتنی بری طرح چلائی' جیسے وہ اسی موقع کی منتظر تھی۔ پھر اس نے سٹیریو کے اوپر پڑا ہوا ریکارڈ اٹھایا اور اسے ڈیسک پر بار بار مارنا شروع کردیا۔ اس کے کالے ٹکڑے فرش پر بکھرتے چلے گئے۔ میں بت بنی کھڑی دیکھتی رہی۔

سویا نگ کی آنکھوں میں گویا چنگاریاں تھیں۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بال نوچنا شروع کردیئے۔ اچانک ہی میری نظر اس کے ہاتھ پر بندھی پٹی پر جا پڑی۔ اس میں سے گہرا سرخ خون بھی کسی پھول کی پتیوں کی طرح نظر آرہا تھا۔ میں اس کا ہاتھ دیکھنے آگے بڑھی۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں ٹھونس لئے۔

''تمہارا ہاتھ زخمی ہے۔''

سویا نگ کی خاموشی میں بھی اس کی سرکشی موجود تھی۔ وہ چپ رہی۔

''تم اس قسم کی حرکتیں کیوں کرتی ہو؟'' میرے لہجے میں کپکپاہٹ آگئی۔

سویا نگ گدے پر جا گری اور رضائی میں اپنا منہ چھپالیا۔ ''میں خود کو کسی جزیرے کی طرح محسوس کرتی ہوں۔ جہاں صرف میں ہوتی ہوں اور لہریں میرے اوپر سے گزر رہی ہوتی ہیں۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ایک بے ترتیب ڈھیر کی صورت' زرد اور ویران صورت' بے جان ہاتھ پاؤں۔ وہ کسی اجڑی ہوئی عورت کی طرح لگ رہی تھی۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں لیکن یوں لگا جیسے میری زبان میں بولنے کی طاقت ہی نہ ہو۔ اپنے دل کی انتہائی گہرائی میں مجھے اس کی تنہائی کا شدید احساس ہوا اور میرا دل بری طرح دکھنے لگا۔ لیکن میں زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتی تھی۔ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی' اپنے بچے کی طرح' اسے بہلاتی۔ اگلے دن کہیں باہر سیر کرانے کے لئے کہتی' فلم دیکھنے اور کچھ چیزیں کھانے پینے کی تجویز رکھتی۔ ذہنی کیفیت کو بہتر بنانے کے لئے اس کو گھماتی پھراتی۔ سویا نگ نے نقاہت آمیز انداز مین نیلگوں آسمانی چادر' اپنے پیروں سے کھینچی اور اپنے سر تک ڈھانپ لی۔ مجھے اس پر بھی خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔

ہم کبھی شہر اکٹھے نہیں جا سکے۔ مجھے موردِ الزام بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اگلے دن اتفاقاً میری ایک سہیلی یو آنگ سک کا ٹیلی فون آگیا۔ یہ میری وہ ہم جماعت تھی جس نے گریجوایٹ

سکول میں داخلے کے لئے میری خاصی ہمت بندھائی تھی۔ان دنوں وہ ہمارے میوزک سکول کے آفس میں کام کر رہی تھی۔اس نے کہا کہ کیوں نہ ہم انسٹرومینٹل ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین سے ملیں۔موقع موجود تھا' اس دن وہ اپنی سالگرہ منا رہے تھے۔میں اس پروفیسر سے کبھی نہیں پڑھی تھی۔لیکن چونکہ کافی عرصے سے میرا اپنا سکول سے تعلق کٹا ہوا تھا۔مجھے اپنے مادرِ علمی سے تعلق بحال کرنے کا یہ اچھا موقع لگا۔پھر بھی پروفیسر سے ملاقات میں' میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی مگر یوآ تنگ سک جو سالگرہ میں مدعو تھی' نے راستہ نکال ہی لیا۔''یہ کیوں نہ کہا جائے کہ تم میرے پاس آئی تھیں اور پھر ہم دونوں اکٹھے ہی یہاں آ گئے۔''

ہم نے شن چیان میں گیارہ بجے ملنے کا فیصلہ کیا۔یہاں یونیورسٹی کے بالمقابل ایک کیفے تھا' پروفیسر کے گھر کے بالکل قریب۔پروفیسر کے گھر سے فارغ ہونے کے بعد میرا پروگرام سویا نگ کے ساتھ مل بیٹھنے کا تھا۔میں نے ماں جی سے کہلایا تھا کہ وہ سویا نگ کو میرے فون کا انتظار کرنے کا کہہ دیں۔خیال یہ تھا کہ ہم دونوں پہلے اکٹھے لنچ کریں گی اور پھر تھوڑی سی گپ شپ۔ماں جی سبزی بنا رہی تھیں اور انہوں نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی۔تاہم سویا نگ کے کمرے میں جانے کی خواہش انہیں بھی تھی اور یہ ایک مناسب بہانہ تھا۔ابو نے جب سویا نگ کے تھپڑ مارا تھا تو ماں جی اپنے کمرے میں تھیں۔دراصل سویا نگ کے سکول چھوڑ دینے کے بعد سے وہ سویا نگ سے خاصی پہلوتہی کرنے لگی تھیں۔انہیں ڈر یہ تھا کہ کہیں سویا نگ ان کی ذہانت فطانت کو بھی پرانی نسل کی بے معنی کامن سنس کے ساتھ غلط ملط نہ کر دے۔اپنی بیٹی کو سمجھنے کی کوشش کی نسبت' یہ خوف انکے ذہن پر زیادہ حاوی تھا۔

''اگر آج دوپہر کو مجھے وقت ملا تو۔'' میں نے ماں جی کو بتایا۔'' میں سویا نگ کے ساتھ کوئی فلم دیکھوں گی۔'' میں نے انہیں سویا نگ کی کلائی کی چوٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔مجھے اس کی وجہ سے خاصا شاک پہنچا تھا اور میں کسی اور کو یہ بات بتانا نہیں چاہتی تھی۔میں اس واقعے کو ہی بھول جانا چاہتی تھی۔

میں گیارہ بجے سے ذرا پہلے گھر سے نکلی اور عین وقت پر کیفے پہنچ گئی۔یہ کیفے یونیورسٹی کے بالکل سامنے' بس سٹاپ سے ذرا ہی آگے تھا۔یونیورسٹی کے داخلی گیٹ کے سامنے پولیس کے اہلکار قطار اندر قطار کھڑے تھے۔منہ کے سامنے لوہے کی ڈھالوں کی وجہ سے' ان کی شکلیں دیکھی نہیں جا سکتی تھیں۔یوں لگا جیسے کوئی فوج دشمن کے انتظار میں کھڑی ہے۔شہر بھر کی

یونیورسٹیوں کے سامنے یہ منظر روزمرہ کا معمول تھا کیونکہ طلبہ کے احتجاجی مظاہرے رکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

میں کیفے میں چلی گئی۔ سیٹ پر بیٹھنے ہی والی تھی کہ اچانک ہنگامہ سا محسوس ہوا۔ میں سمجھی' سڑک کے سامنے کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ ریڈیو یا ٹی وی پر کوئی شور ہو رہا ہے۔ لیکن فوراً ہی ویٹرلیس نے میرے سامنے بارلے ٹی کا گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

''اور بھی زیادہ آنسو گیس۔ میں تو اس سے تنگ آ چکی ہوں۔''

میں نے سڑک کی طرف نگاہ دوڑائی۔ طلبہ کا خاصا بڑا ہجوم' ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کیمپس کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ ان کے نکلنے کا انداز شہد کی مکھیوں کا سا تھا۔ بعض لڑکے پولیس پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ بعض نے چہروں پر ماسک چڑھا رکھے تھے۔ انکے ہاتھوں میں روشن مشعلیں اور کاک ٹیل کی خالی بوتلیں تھیں۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے' دفع ہو جاؤ۔'' یہ جنگی نعرہ کسی طالبعلم نے لگایا تھا جو پھر گونجتا ہی رہا۔ نوجوانوں کا ایک گھنا جنگل تھا یا شاید غصے اور نفرت کی شدید لہر۔ پتھر' مشعلیں اور کاک ٹیل کی خالی بوتلیں فضا میں لہراتی ہوئی پولیس والوں کی طرف جانے لگیں اور پھر سڑک پر ہر جانب سرخی مائل سیاہ شعلے پھیلنے لگے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے' دفع ہو جاؤ!''

آنسو گیس کے کنستر پھٹنے لگے۔ دھوئیں کی دبیز تہہ فضا میں اس طرح پھیلی کہ وہ لہر نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ تاہم غصیلی آوازیں اور پر جوش نعرے ابھی تک فضا میں گونج رہے تھے۔ بعض پتھر کیفے کی دیواروں پر بھی آ کر گرے۔ طلبہ کہیں سے ایک خاصا بڑا بورڈ لے آئے۔ انہوں نے اسے سڑک کے درمیان میں رکھا اور آگ لگا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس آگ کی چنگاریاں میرے بدن پر آ کر گر رہی ہیں۔ میرا چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا۔ میں نے رومال سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ یہ صرف آنسو گیس کا اثر ہی نہیں تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے' نوجوان' اپنے نظریات کی خاطر' اپنی جان ہتھیلی پر رکھے پھر رہے تھے۔ ان کی بے چینی اور پریشانی مجھے بے کل کر رہی تھی۔

آخر ان نوجوانوں کو احتجاج کیوں کرنا پڑ رہا ہے؟ کوئی جرم نہ کرنے کے باوجود' ان نوجوانوں نے دن کی روشنی میں اپنے چہرے کیوں چھپا رکھے ہیں؟ انہیں ایک بے حس دنیا کی

جانب آگ پھینکنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آ گئی؟ کیا وہ آہنی دیواروں کے پیچھے بیٹھی حکومت کے در پر.......... اپنے نازک ہاتھوں کے ٹوٹ پھوٹ جانے تک۔ یونہی دستک دیتے رہیں گے؟ ابھی تو ان کی زندگی میں بہار آنی شروع ہوئی ہے اور وہ اپنی جوانی کا لطف اٹھانے کے بجائے اپنا ہی خون بہا رہے ہیں۔ سویا نگ کا ہاتھ' ریکارڈ کے ریزہ ریزہ ٹکڑے' چادر پر بکھرے خون کے دھبے۔ یہ سب چیزیں میرے ذہن کے تصوراتی پردے پر خون بکھیرتی محسوس ہوئیں اور اسی لئے میری آنکھوں میں خونیں آنسوؤں کا سیلاب امڈا چلا آ رہا تھا۔

پروفیسر کے گھر جانے کی مجھے یقیناً خوشی ہوئی ۔ پروفیسر نہ صرف مجھے پہچان گئے بلکہ انہوں نے گریجوایشن تقریب کے موقع پر ایک بہت مشکل دھن کو کامیابی سے ترتیب دینے پر پرجوش طریقے سے میری تعریف بھی کی۔ غرض انہوں نے میری خاصی حوصلہ افزائی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے گریجوایٹ سکول میں داخلے کے لئے بھرپور محنت کرنا چاہئے ۔ میں عملاً پیانونوسٹ بنوں یا نہ بنوں مگر مجھے موسیقی سے قطع تعلق نہیں کرنا چاہئے سچ تو یہ ہے کہ میں نے جز وقتی پڑھانے کے متعلق سوچا تھا اور اگر مجھے کسی بھی مادہ پرست کی طرح' وہاں مناسب عزت اور احترام مل جاتا تو میں بے پناہ مطمئن اور آسودہ ہوتی۔ پروفیسر سے ملنے کے بعد مجھے اپنی بیہودہ سوچ پر خاصی شرم آئی اور ایک بار پھر' موسیقی کا جذبہ میرے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔

پروفیسر کے گھر سے ہم دو بجے نکلے۔ یوآ نگ سک کو میں نے یونیورسٹی کے گیٹ کے پاس چھوڑا اور پھر کیفے گا ناری کا رخ کیا۔ کالج کے زمانے میں' میں یہاں اکثر آیا کرتی تھی۔ میں اپنی روایتی جگہ پر جا بیٹھی ۔ یہ جگہ دوسری منزل پر ایک کھڑکی کے ساتھ تھی۔ کھڑکی کے باہر ایک بلند قامت درخت' آج بھی ہمیشہ کی طرح اپنا سایہ بکھیر رہا تھا۔ کھڑکی کے نیلگوں فریم' جو مجھے کسی بحری جہاز کے کیبن کی یاد دلاتے تھے' اب بھی اسی طرح موجود تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ٹیلیفون کر کے سویا نگ کو یہاں بلالوں۔ میں اسے اپنی زندگی کے بیسویں سال کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ کیا خوبصورت اور خوابناک وقت تھا! اپنی زندگی کے بدترین لمحے' سردیوں کی ایک سرد رات ۔۔ صرف ایک شخص کی کراہیت آمیز حرکت کے سبب' میری زندگی میں بھی آئے تھے' میری زندگی کی بہار میں دکھوں کی خزاں بھی آئی تھی۔ میں اپنے یہ محسوسات سویا نگ سے شیئر کرنا چاہتی تھی کسی شاعر نے کہا تھا: زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا

ناقدری اور اہانت کا احساس ہی زندگی کو جنم دیتا ہے۔

لیکن میرے فون کرنے تک' سویا نگ گھر سے نکل چکی تھی میں نے ماں جی سے پوچھا کہ آیا انہوں نے سویا نگ کو میرا پیغام دیا بھی تھا۔ان کے جواب میں اتنی درشتی تھی جیسے انہیں کوئی جواب ملا ہی نہیں تھا۔''سویا نگ کسی کی بات پر آج کل کان کہاں دھرتی ہے؟'' ان کے لہجے کی ہچکچاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے اس سے بات ضرور کی ہو گی۔ میں نے سویا نگ کی ذہنی حالت کے بارے میں پوچھا۔ مجھے تو وہ اچھی بھلی لگی۔ دادی کی چرچ کی سہلیاں آ گئی تھیں وہ ان کے ساتھ بیٹھ گئی اور چاول کی دو پلیٹیں کھا گئی۔ مجھے اس کا رویہ بھلا لگا اور میں نے اسے کچھ جیب خرچ بھی دے دیا۔

مجھے یہ توقع نہیں تھی ۔ ماں جی تو اس سارے منظر سے اتنی ہی حیرت زدہ ہوئی ہوں گی۔ اپنی کلائی کو بری طرح زخمی کر لینے والی لڑکی کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ اگلے ہی دن مناجات کے گیت گانے لگے گی اور چاول کی دو بھری ہوئی پلیٹیں چٹ کر جائے گی! لیکن لگتا ہے وہ کئی وقت سے بھوکی رہی ہوگی اور اگر ایسا نہیں تھا تو کہیں اس کے موڈ میں پائی جانے والی انتہائی تبدیلیاں اس کی شدید پژمردگی اور آزردگی کی علامت تو نہیں؟ سویا نگ اتنے شدید خطرے سے دوچار تھی کہ میں محض اتفاقات پر تکیہ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے ہوئی چنگ سے ملنے کا دوبارہ فیصلہ کیا۔سویا نگ کسی ایسی لڑکی کی طرح تھی جو پہاڑ کی بلند چوٹی کے عین کنارے پر کھڑی ہو اور تنکوں کا سہارا لینے کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہ ہو۔اگر سویا نگ سے ان دنوں' سب سے زیادہ ملنے والا شخص ہوئی چنگ تھا تو شاید وہی' سویا نگ کو اس صورت حال سے نکالنے میں' مدد بھی دے سکتا تھا۔

مجھے'اس کے سکول سے' اس کا فون نمبر لینے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔اگلی صبح نو بجے کے قریب میں نے اسے فون کیا۔شاید میں فون زیادہ ہی جلدی کر بیٹھی تھی۔اس فون کے لئے مجھے خاصی جرات سے کام لینا پڑا' نہ جانے اس کا کیا ردعمل ہو لیکن میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کئے بغیر' ہمت ہارنا نہیں چاہتی تھی۔کسی نوجوان عورت کی اونچی اور شفاف آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں نے ہوئی چنگ کی بابت پوچھا تو اس نے میرے بارے میں استفسار کر ڈالا۔ میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میں سویا نگ کے گھر سے بول رہی ہوں۔

سویا نگ؟ اس کے پوچھنے کے انداز سے علم ہوا کہ وہ یہ نام پہلی بار سن رہی تھی۔

''بڑے بھائی!'' اس نے زور سے آواز دی۔

تو اس کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے میں نے ذرا مطمئن ہوتے ہوئے سوچا۔

ہوئی چنگ فون پر آیا تو میں نے اس سے زحمت کی معذرت چاہی اور اسے بتایا کہ میں سویا نگ کی بڑی بہن ہوں۔ ''بڑی بہن؟'' اس کی تیز اور استفہامیہ آواز آئی۔

میں نے سویا نگ سے ہی اس کے بارے میں سنا تھا اور اسے کہا تھا کہ کسی وقت اسے مدعو کرے تا کہ ہم اس سے مل سکیں۔ میں نے بات شروع کی۔ پھر میں مطلب کی بات پر آ گئی۔ ''کوئی خاص بات تو نہیں تاہم میں سویا نگ کے معاملے میں مشورہ لینا چاہتی ہوں۔''

میرے اندازے کے عین مطابق' ہوئی چنگ پر کچھ لمحے کے لئے سکوت طاری ہو گیا۔ شاید وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں اسکی جگہ ہوتی تو میں بھی خاصی مشتبہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال اسکی بے چینی دور کرنے کی غرض سے میں نے اسے کہا کہ میں سویا نگ کی سہیلیوں می یا نگ جو اور کیا نگ آ ک سے بھی کچھ عرصہ پہلے مل چکی ہوں میں نے مزید وضاحت کی کہ اس کے دوستوں کو ہی اس کے سکول چھوڑنے کی وجوہات کا پتہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے' حقیقت تک پہنچنے کے لئے ان دوستوں سے ملنے کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔ بالآخر' ایک ناگہانی بوجھ سمجھتے ہوئے' اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' وقت بتا دو۔''

اسی دن' گیارہ بجے کا وقت طے ہو گیا۔ می یا نگ جو اور کیا نگ آ ک سے بھی میری ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر اس دفعہ میں خاصی نروس تھی اور گھر سے نکلنے سے پہلے تک میں انتہائی غیر یقینی کیفیت کی شکار تھی۔ خوش قسمتی سے' رات کو خاصی دیر سے آنے کی وجہ سے' سویا نگ ابھی تک اپنے کمرے ہی میں تھی۔ سویا نگ کی ڈائری میں موجود ہوئی چنگ کے تحریری خاکے کی وجہ سے میرے ذہن میں اسکی ایک تصویر ابھر آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اسے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ کوانگ وہامن کے اس کیفے میں جہاں ہماری ملاقات ہونا تھی' میں بروقت پہنچ گئی۔ دروازے کے سامنے ایک میز منتخب کر کے' ابھی میں بیٹھی ہی تھی کہ ہوئی چنگ اندر داخل ہوا۔ وہ اپنے لباس اور تراش خراش سے کوئی نوجوان آئس سکیٹر لگ رہا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے اپنی آنکھیں مچکا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی دور کی نظر کمزور ہے۔ میں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر' اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ اشارہ دیکھتے ہی میری طرف آ گیا۔

''تم نے مجھے پہچانا کیسے؟'' سوال کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے ویٹرس کو بلا لیا۔ اسے بری طرح پیاس لگی ہوئی تھی۔ اس لئے اس

نے اپنے لئے سوڈے کی بوتل کا آرڈر دیا۔ میں نے ادرک کی چائے منگوالی۔ ویٹریس کو جاتے جاتے روک کر اس نے کہا۔ ''میرے سوڈے میں کچھ برف ڈال لانا۔''

ویٹرس سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک اکھڑ پن سا تھا۔ شاید وہ فطرتاً یونہی بولتا ہوگا۔ میں چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ ہوئی چنگ بھی خاصا بے چین لگ رہا تھا لیکن اس نے لایعنی گفتگو کرنے سے پرہیز کیا۔ وہ یقیناً یہ کہہ سکتا تھا کہ سویا نگ سے میری کوئی مشابہت نظر نہیں آتی' مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔اس سے کچھ اگلوانا یا منوانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ میں نے بات یوں شروع کی کہ میرے فون پر اسے حیرت تو ہوئی ہوگی لیکن اس نے بھی کچھ نہ کچھ اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔

سویا نگ نے گھر والوں کی بتائے بغیر' اچانک ہی سکول چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کے بعد سے ہم اس کے رویئے سے خاصے پریشان تھے۔ میری اس سے ملاقات بھی اسی سلسلے میں تھی تاکہ میں اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرسکوں۔ ہوئی چنگ نے مفلر اپنی گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا اور برف کا ٹکڑا منہ میں ڈالے چبا رہا تھا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ میں سویا نگ کو اچھی طرح نہیں جانتا۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''تمہاری جان پہچان کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔'' میں نے جان بوجھ کر حیرت ظاہر کی۔

میں اگر اسے تین سال سے جانتا ہوتا تو بھی یہی صورت حال ہوتی۔'' اس نے آہستگی سے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ایک مختصر سے وقفے کے بعد ہوئی چنگ نے بتایا کہ اسے لگتا ہے کہ سویا نگ انتہا پسند ہوگئی ہے۔ صبر کا مادہ اس میں ہے ہی نہیں اور ہر چیز کے بارے میں اس کی سوچ منفی ہوتی ہے۔ وہ بعض اوقات سراپا احتجاج لگتی ہے کیونکہ وہ احتجاجی مظاہرے کرنے والے طلبہ سے کہیں زیادہ ریڈیکل ہے۔

مجھے یہ بات خاصی دلچسپ لگی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔

ہوئی چنگ نے ایک مثال دی: ایک دن وہ کسی کیفے میں ملے۔ سویا نگ سگریٹ پی رہی تھی۔ ایک ویٹر اس کے پاس آیا اور اسے سگریٹ پینے سے منع کرنے لگا۔ کیفے کا مالک ایک عورت کو تمبا کونوشی دیکھ کر برداشت نہیں کرسکا تھا اور اس نے ویٹر کو ہمارے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ سویا نگ کو سگریٹ نوشی نہ کرنے کو کہے۔ سویا نگ نے مالک کو بلا بھیجا۔ وہ اس مسئلے پر کچھ دیر الجھتے رہے۔ تھک ہار کر سویا نگ نے سگریٹ بجھا دی۔ چائے کا بل ہم پہلے ہی ادا کر چکے تھے

سو،ہم چائے پیتے ہی وہاں سے اٹھ گئے۔ باہر نکلتے ہی سویا نگ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور سگریٹ پینے لگی۔ ذرا سوچیں! عین سڑک کے کنارے کسی بوڑھی عورت کی طرح بیٹھے ہوئے سگریٹ نوشی کرنا کیسا لگتا ہے!

اس پر، ان دونوں کے درمیان کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی۔ سویا نگ کا کہنا تھا کہ ہوئی چنگ نے خاموش رہ کر دراصل کیفے کے مالک کا ساتھ دیا تھا۔ اگر وہ اپنے ساتھی کی حمایت حاصل نہیں کرسکتی تو ایک غیر شخص کو بھلا کیسے سمجھا سکتی ہے۔

''تو پھر؟''

ہوئی چنگ نے غیر ارادی طور پر میری جانب دیکھا' جیسے پوچھ رہا ہو کہ میں اور کیا جاننا چاہتی ہوں۔

''میں نے اس کی بڑی منت سماجت کی کہ وہ برلب سڑک سگریٹ نہ پیئے لیکن وہ بھلا سنتی ہے کسی کی۔ سامنے سے گزرتے ہوئے لوگ ہمیں گھورتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں اس کی ضد ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر میں نے ہی ہار مان لی۔''

ہوئی چنگ نے سگریٹ نکالی۔ میرا بھی سگریٹ نوشی کا جی چاہا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد میں نے سگریٹ سلگائی۔ دو تین کش لیتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے خفت سے بچنے کے لئے دیوار پر نظریں گاڑ دیں۔ ہوئی چنگ سمجھا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہی۔ وہ پھر سویا نگ کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنے لگا۔ سویا نگ خود کو حقوق نسواں کی علم بردار تصور کرتی ہے لیکن یہ کوریا ہے' کنفیوشس کا سماج۔ ان دنوں عورتوں نے نسواتی آزادی کے لئے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ وہ مردوں کو ہر چیز کے لئے موردالزام ٹھہراتی ہیں۔ جیسے ان کے سب سے بڑے دشمن مرد ہی ہیں لیکن حقیقتاً ہر شے کی ابتدا اور اختتام میں مرد اور عورت کی یکجائی نظر آتی ہے۔ یہ تھا ہوئی چنگ کا نظریہ۔

''دنیا کو چلانے کے لئے نسلی ہم آہنگی کے بجائے مرد اور عورت کی باہمی یک جہتی ضروری ہے۔'' اس کی بات جاری تھی۔ ''میں نے جب یہ بات سویا نگ کو بتائی تو اس نے فوراً کہا کہ یہ سب مردوں کی بہانے بازی ہے۔ عورتوں کو اپنے نیچے لگائے رکھنے کی۔ ماتحتی؟ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ سویا نگ کے بارے میں ہوئی چنگ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک دفعہ وہ ضرورت سے زیادہ پی گئی اور چانگ نو میں عین سرراہ لیٹنے لگی تھی۔ وہ خاصی سوجھ بوجھ کی مالک ہے لیکن

بعض اوقات اس کی حرکات برداشت کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اسے پاگل پن ہی کہا جاسکتا ہے۔''

پاگل پن؟ یہ لفظ میرے ذہن میں گونجا تو میرے ذہن کے پردے پر' گذشتہ دنوں سویا نگ کے ریکارڈ کو ریزہ ریزہ کرنے کا منظر ابھر آیا۔ ہوئی چنگ' غالبًا اپنے خیالات میں گم' نظریں میز پر گاڑے بیٹھا تھا۔ وہ سویا نگ کی شخصیت کی بارے میں بہت کچھ جانتا تھا مگر اس کے دفاع کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔ اس طرح سویا نگ بھی ہوئی چنگ کی شخصی خصوصیات سمجھ نہیں پائی تھی۔

سب سے پہلے میں نے ہوئی چنگ کے اس بیان پر' اسے آڑے ہاتھوں لیا کہ سویا نگ عورتوں کی آزادی کی زبردست حامی تھی۔ دنیا صنعتی ارتقاء کے دور سے بہت آگے جاچکی ہے۔ یہ دور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ہے۔ کسی مشہور گانے کے بول بھی ہیں۔ دنیا ایک ہورہی ہے۔ عورت کو سگریٹ پینی چاہیئے یا نہیں' اسے موضوع بحث بنانا' آج کے دور میں انتہائی دقیانوسی لگتا ہے اگر ہوئی چنگ عورتوں کو بھی آزاد اور خودمختار سمجھتا ہے تو وہ ایسی لایعنی بات کیوں کرتا ہے؟

اور ویٹریا کیفے کے مالک کے آگے خاموش رہنا' دراصل کس کی طرف داری کرنا تھا؟ اگر ہوئی چنگ مجھے بتادیتا کہ وہ پرانے خیالات کا قائل ہے تو میں اس سے مزید کچھ بھی نہ کہتی لیکن سویا نگ بہر حال کہیں بھی غلط نہیں تھی۔ ایک بار پھر میں نے ہوئی چنگ پر حملہ کیا۔ معاشرے نے عورتوں پر بہت سی غیر انسانی پابندیاں ٹھونسی ہوئی ہیں اور اس طرح کی باتیں۔۔ مرد اور عورت مل کر دنیا کو چلاتے ہیں۔۔ محض میٹھی باتیں ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ ہوئی چنگ مجھے بولتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ادھ جلے سگریٹ کو توڑ مروڑ دیا اور پھر اپنی ڈرنک لینے لگا۔ ''شروع میں تمہیں دیکھا تو میں سمجھا کہ تم سویا نگ سے مختلف ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔'' لیکن تمہاری باتوں میں' اپنی بہن سے' خاصی مشابہت نظر آتی ہے۔'' ہوئی چنگ کے بارے میں کچھ اور جاننے کے لئے میں نے اس سے یونہی پوچھنا شروع کردیا۔ اس کے کتنے بہن بھائی ہیں۔ اسے سکول میں کوئی مشکلیں تو درپیش نہیں رہیں اور کیا اس کے مضامین اس کے میلان طبع کے مطابق تھے' وغیرہ وغیرہ۔ وہ تین بھائی اور ایک بہن تھے۔ ہمارے خاندان کے بالکل برعکس ہوئی۔ چنگ دوسرے نمبر پر تھا۔

''جہاں تک سکول کا تعلق ہے' میں کالج اس لئے جاتا ہوں کہ پڑھنا میری مجبوری ہے

سو گریجوایشن تو ہر حال میں کرنا ہے۔'' بڑے واضح مقاصد تھے اس کے سامنے۔ میں نے پوچھا کہ گریجوایشن کے بعد' وہ کیا کرنا چاہے گا۔ اس نے کہا کہ تعلیم کے آغاز میں اس کا خیال تھا کہ وہ پروفیسر بنے گا اور بس۔ لیکن اب وہ اپنی تعلیم کا کوئی واضح پیداواری اطلاق چاہتا تھا۔ اس نے بڑی متانت سے کہا۔ ''پروفیسر بن جانا کوئی خاص بات نہیں۔ پروفیسر بے کار علم اکٹھا کرتے ہیں اور اس کے بارے میں صرف باتیں کرنے کا معاوضہ لیتے رہتے ہیں۔'' پھر ہوئی چنگ نے بتایا کہ وہ موسم گرما میں تائیوان پڑھنے گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ایک حیرت انگیز کہانی بھی سنائی۔ وہ تائیوان سے واپسی پر کچھ خوشبویات لایا تھا' جن کی مدد سے اس نے ایک مخصوص طبی مرہم تیار کر ڈالا تھا۔ اس نے یہ دوائی ایک نامور کمپنی کو پیش کی اور اس کے سربراہ سے بھی جا کر ملا۔ کمپنی کے سربراہ کا ردعمل خاصا حوصلہ افزا تھا اور جلد ہی اس پراڈکٹ کے متعلق مثبت فیصلے کی توقع تھی۔

اس عمر میں اپنی ذہانت اور صلاحیت کے متعلق سوچنے کا کیا فائدہ؟ اصل چیز جدوجہد ہے۔ ہوئی چنگ کی شخصیت کا یہ رخ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ غالباً اسے حقیقت پسندی کا نظریہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ بے پناہ سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا مگر فطرتاً سنگ دل اور کٹھور تھا۔ خاصا دلچسپ کردار تھا۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔ اس کی ہمت کے متعلق سوچتے سوچتے' سویا نگ میرے ذہن میں در آئی اور میں افسردہ ہوگئی۔

لوگ اپنے اپنے راستوں کی نشاندہی کرتے جا رہے ہیں۔ سویا نگ آخر کب تک یونہی بھٹکتی رہے گی۔ ابو نے ایک بار کہا تھا کہ مقابلے میں ایک دفعہ کی ناکامی آدمی کو بار بار اسی تجربے سے دوچار کرتی ہے۔ میں نے ان کی اس بات کو چیلنج کیا تھا لیکن اس حقیقت کو جاننے سے پہلے ہی میں بھی پرانی نسل میں شامل ہو چکی تھی۔ ہم کوئی گھنٹہ بھر بات کرتے رہے۔ میں نے ہوئی چنگ کو لنچ کی پیش کش کی لیکن وہ معذرت کر کے سکول جانے کے لئے اٹھ گیا۔ کہہ تو وہ یہ رہا تھا کہ اس نے ناشتہ دیر سے کیا تھا لیکن درحقیقت وہ میرے ساتھ مزید وقت گزارنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اس سے کوئی چبھتا ہوا سوال نہیں کیا مثلاً میں نے نہیں پوچھا کہ وہ سویا نگ کو کیسا سمجھتا ہے اور نہ ہی میں نے کسی دادی کی طرح اسے سویا نگ کے ساتھ اچھے برتاؤ کی نصیحت کی۔ اتنا میں نے ضرور کہا کہ وہ اس ملاقات کے متعلق سویا نگ کو نہ بتائے کیونکہ وہ فوراً

ہی سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اس کی بھی ایک چھوٹی بہن تھی اور غالباً وہ میری ذہنی کیفیت محسوس کر سکتا تھا۔ ہوئی چنگ سے یہ پوچھنا ممکن نہیں تھا کہ اس دن وہ پہلی دفعہ کس سے ملا تھا اور کس کھیل میں اس نے اور سویا نگ نے شیئر کیا تھا۔ خیر پھر کسی روز سہی' شاید اس طرح کی ذاتی باتیں کرنا زیادہ آسان ہو۔ بہر حال' میرے خیال میں سویا نگ کا ہوئی چنگ سے میل جول کسی نقصان کا باعث ہرگز نہیں تھا۔ ہوئی چنگ نے مجھے بتایا کہ اس روز سکول سے فارغ ہونے کے بعد' وہ سویا نگ سے ملے گا اور اس شام سویا نگ معمول سے کہیں زیادہ جلدی گھر آ گئی۔ ماں جی نے مجھے چاؤ کو گھر بلانے کا کہا تھا اور اس وقت وہ اپنے ہونے والے داماد کی خاطر داری کے لئے کچن میں مصروف تھیں۔ اتفاق کی بات ہے' میں سویا نگ کو چاؤ سے ملوانا چاہتی تھی اور وہ ہمارے ڈنر سے فارغ ہونے تک گھر آ گئی تھی۔

وہ خاصی خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے چاؤ سے سلام دعا کی۔ ہمارے چائے پینے کے دوران' اس نے کچن میں ہی ماں جی کے ساتھ کھانا کھایا۔ کچن کی صفائی میں ماں جی کا ہاتھ بٹایا اور پھر وہ دونوں کی چائے لئے ٹی وی لاؤنج میں آ گئی اور ابو اور چاؤ کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ شام بڑی پرسکون اور خوش آمیز گزری۔ ہفتے بھر میں ہماری شادی ہونے جا رہی تھی۔

چاؤ' شادی کے بعد' مستقبل کے لئے اپنے منصوبوں پر بات کرتے رہے۔ انہوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کیا تھا مگر بینک کے کام سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ شادی کے بعد' وہ سوچ رہے تھے کہ روزانہ آدھا گھنٹہ اپنی بیوی سے پیانو سیکھا کریں گے۔ وہ فرنچ پڑھنے کے بارے میں بھی سنجیدہ تھے۔ یہ شروع سے ہی ان کی آرزو رہی تھی۔ اس بین الاقوامی دور میں ایک غیر ملکی زبان میں مہارت ہونا' ایک عظیم سرمائے کی طرح ہوتا۔ صرف غیر ملکی فلمیں دیکھنا اور انہیں سمجھ لینا ہی اس کا فائدہ نہیں اور بھی بہت فائدے تھے اس کے۔

''تمہارا مضمون بہت شاندار ہے بس ذرا محنت کر ڈالو۔'' انہوں نے سویا نگ کی حوصلہ افزائی کی۔ پڑھائی کے تذکرے پر میں کچھ پریشان ہو گئی۔ چاؤ کو ابھی تک سویا نگ کے متعلق کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں انہیں کچھ بتانے سے پہلے اپنے خیالات مجتمع کرنا چاہتی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ کئی مواقع آئے اور میں انہیں بتا نہ سکی۔ اب شادی سر پر آ گئی تھی تو اپنے گھر کے مسائل کا اظہار مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

سویا نگ صورت حال کی نزاکت سمجھ گئی اور اس نے انتہائی چابک دستی سے موضوع کا

رخ بدل دیا۔ مطالعے کا شوق تو بہر حال اسے تھا' اس نے ایک نئی بحث چھیڑ دی ۔ وہ جنیاتی انجینئر نگ کرنا چاہتی تھی جو جدید ٹیکنالوجی میں سرفہرست تھی ۔ ایک صحرا کو سرسبز کھیت بنا ڈالنا یا آنتوں کے بیکٹیریا کے ذریعے ہارمونز کی پیداواری افزائش کو ممکن کر ڈالنا۔ کتنا بڑا معجزہ ہوگا' اگر ہم ایک ایسا پودا بنانے میں کامیاب ہو جائیں جو زمینی سطح پر تو جو کی طرح ہو اور زیر زمین کسی دال کی طرح یا سرخ جو کے ایسے پودے کی افزائش ممکن بنالیں جس میں کسی کھاد کی ضرورت ہی نہ ہو۔ پوری دنیا سے غذائی بحران کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل جائے گا۔

لیکن ان عملی مسائل کو حل کرنے کے علاوہ' اس کے کچھ وحشیانہ خواب بھی تھے۔ وہ شاہ بلوط کے درخت پر کیکر کے پھول' بغیر انکی جڑوں کے اگانا چاہتی تھی کیونکہ وہ پہاڑوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کا خیال تھا۔ شاید اس طرح ان کے پھولوں کی شکل شمع دان جیسی نکل آئے۔ وہ تو ہر موسم میں' ہر پودے پر کوئی نیا پھول کھلتا دیکھنا چاہتی تھی ۔ مختلف جنیاتی وجود باہم ملا کر نئی جنیاتی تشکیل کی خواہاں تھی۔ ایک چیز کی خاطر' کسی دوسری چیز کو قربان کر ڈالنا خاصا دہشت انگیز تصور تھا۔ بہرحال وہ اس تصور سے خوف زدہ تھی کہ بالآخر ہم آئیڈیل سپر مین پیدا کرنے کی جانب بڑھیں گے۔ کامیابی کے بعد پوری قوت سے ان آدمیوں کی پیداوار شروع ہو جائے گی۔ ہم چوہے کی طرح کا جانور تیار کرنے میں تو کامیاب ہو ہی چکے ہیں۔ اس میں انسان اور چوہے دونوں کا خون موجود ہے لیکن یہ تو پوری انسانی فطرت کا بیڑہ غرق کرنے کے مترادف ہوگا۔ سویا نگ کو جب اس جدید ٹیکنالوجی کی عملی خرافات اور غلطیوں کا احساس ہوا تو اس نے گفتگو کا رخ آہستگی سے عمرانی علوم کی جانب کر دیا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ لوگ طویل زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ اپنی بیماریوں کا علاج چاہتے ہیں لیکن انہیں حوصلے کے ساتھ' موت کا سامنا کرنا بھی آنا چاہئے لیکن سائنس میری بات سے قطعی متفق نہیں۔ مجھے انسانیت کا یہ بہت بدنما پہلو نظر آتا ہے۔ زیادہ ریڈیکل انداز میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ لوگوں کو علم ہونا چاہئے کہ وہ خود کو کس طرح موت سے ہم کنار کر سکتے ہیں۔'' اپنے ذہن کے ورق پلٹتے ہوئے' سویا نگ کی آنکھوں میں کسی ہونہار طالب علم کی سی جگمگاہٹ تھی۔ وہ ایک بالکل ہی مختلف شخصیت لگ رہی تھی۔ ابو جو تین دن پہلے اسے کک مار کر گرا چکے تھے۔ حیرت سے پتھر بنے اسے دیکھ رہے تھے۔ چاؤ نے اپنا بیئر کا گلاس اپنی ہونے والی سالی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ایک نوجوان طالبہ کے عمیق سائنسی مطالعے اور دلچسپی کو

گویا خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ پھر سویا نگ نے پھلوں کی ٹرے' جسے ماں جی نے بڑے دلکش انداز میں سجایا تھا' سلیقے سے چاؤ اور ہم سب کے سامنے لا کر رکھی۔ ماں جی خوش ہو گئیں۔

''میرا خیال تھا کہ تم سمجھ نہیں سکتیں لیکن تم نے تو کمال کر دیا۔'' ماں جی بولیں۔

''اچھا! آخر بیٹی کس کی ہوں!'' سویا نگ نے فی الفور جواب دیا۔ ابو' جو ماں جی سے بے پناہ محبت کرتے تھے' یہ جواب بن کر خوش ہو گئے۔

سویا نگ اگلے چار دن تک گھر میں ہی رہی۔ کام کاج میں ماں جی کی مدد بھی کرتی تھی مگر عموماً وہ اپنے کمرے تک ہی محدود رہی۔ وہاں وہ مطالعے میں مصروف ہوتی یا موسیقی سنتی رہتی۔ پچھلے دنوں کی نسبت وہ خاصی پرسکون اور نارمل لگ رہی تھی۔ اس میں ایک ٹھہراؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں بازار سے شاپنگ کر کے آتی تو اس کے کمرے کا رخ کرتی۔ اس کے لئے خریدی ہوئی کوئی چیز اسے دے دیتی۔ اپنی خریدی اشیاء اسے دکھانے لگتی۔ یہ سب اس سے ملنے اور بات کرنے کا محض بہانہ ہوتا۔ ایک دن میں کچھ سلیپرز اور کپڑے خرید کر لائی تو میں نے کمرے میں سویا نگ کو خواتین کا ایک رسالہ پڑھنے میں منہمک پایا۔

''کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا سو یہ رسالہ تمہارے کمرے سے اٹھا لائی۔'' اس نے رسالے سے نگاہ اٹھائے بغیر مجھے بتایا۔ میں اس کے قریب گئی اور مضمون کی سرخی پر نظر ڈالی۔ ''دنیا کی یونیورسٹیاں'' یہ رسالے کا تصویری حصّہ تھا اور سرخی کے نیچے ہاتھوں میں کتابیں تھامے کیمپس سے نکلتے ہوئے طلبہ کا ایک منظر تھا۔ پس منظر میں ایک پتھریلی کلاسیکی عمارت نظر آ رہی تھی۔ کچھ جوڑے فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں خود سے پوچھ رہی تھی کہ کہیں سویا نگ کسی تبدیلی کی زد میں تو نہیں۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ ''مجھے اپنی پرانی سہیلی کی چھوٹی بہن سرراہ مل گئی۔ اگلے سال گریجوایشن کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جا رہی ہے۔ اس کا مضمون بھی فرانسیسی ہے۔ اسی لئے مجھے تمہارا خیال آ گیا۔'' پتہ نہیں کیوں' میں فرفر بولتی چلی گئی۔ ''تم نے سکول اس لئے چھوڑا کہ تم اپنی قدروں کے بارے میں الجھاؤ کا شکار تھیں لیکن زندگی کوئی ایسی چیز نہیں کہ جسے کاٹا چھانٹا' خشک کر لیا' پھلوں کی طرح۔ سوالوں کا تو کوئی اختتام ہے ہی نہیں اور ہاں تمہارے سکول جانے یا نہ جانے سے سکول یا کسی اور چیز پر اثر نہیں ہوگا' وہ تو ہمیشہ اسی طرح رہیں گے۔ ایک سال ہونے کو آیا' تم بات کو سنجیدگی سے ہی نہیں لے رہی تھیں۔ اب بتاؤ داخلے کے متعلق کیا خیال ہے؟ تمہیں جلد ہی احساس ہو جائے گا کہ سکول کی

زندگی اتنی بری بھی نہیں۔ اگر یہ بہت خوشنما نہ بھی ہوئی تو بھی مجھے یقین ہے تم جو کچھ کرنا چاہتی ہو، اپنی گریجوایشن کے بعد بآسانی کرسکوگی۔ چاہو تو نوکری کر لینا، چاہو تو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلی جانا۔ تم اگر ہپی بھی بننا چاہتی ہو تو تمہیں پہلے گریجوایشن کرنا ہوگی۔'' میری طویل اور بے تکان تقریر کے جواب میں، سویا نگ خود تحقیری انداز میں بڑبڑائی۔ ''میرا اندازہ ہے کہ مسئلہ میرے اندر ہی ہے۔''

کیا یہ اس کا جواب تھا؟ میں نے خود سے پوچھا۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آیا یہ اس کے سکول جانے سے انکار کا طریقہ تھا یا وہ استہزائیہ خود کلامی کر رہی تھی۔ ''اگر تمہیں علم ہے کہ مسئلہ تمہارے اندر ہی ہے تو کیا اسے حل کرنے کی یہی ایک وجہ کافی نہیں۔'' مزاح کی اس بھونڈی کوشش کے باوجود سویا نگ بدکی نہیں۔ ''میرا مطلب ہے کہ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ مسئلہ میرے اندر ہے۔'' سویا نگ کے پھٹ پڑنے کا خطرہ دور ہوتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے بارے میں بتانے لگی۔ میں نے پڑھائی میں زیادہ دلچسپی اس لئے نہیں لی کہ میں پیانو میں مہارت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اگر میں دوبارہ کالج میں داخلہ لے لوں تو میں ہر طرح کا علم حاصل کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دوں گی۔ لائبریری جاؤں گی۔ ذرا تصور تو کرو دنیا کے کتنے دلکش اور عجیب وغریب پہلو نگاہوں کے سامنے آئیں گے، ان کتابوں کے مطالعے سے۔ افسوس، ہم ساری کتابیں پڑھ ہی نہیں سکتے۔ وقت ہی کم ہوتا ہے۔ ہم دکھوں میں گھرے ہوئے ہوں تو ہر چیز تکلیف دہ لگتی ہے اگر ہم اپنی آنکھیں کھول کر اس وسیع وعریض دنیا کو دیکھیں تو اردگرد ایک لامحدود دنیا نظر آتی ہے۔۔ ایک لامحدود حقیقت! کیا تم اس دنیا کو جاننے کی خواہاں نہیں؟'' سویا نگ میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے گھٹنے اوپر کی طرف اکٹھے کئے اور ان پر اپنے دونوں بازوؤں کا دائرہ بنالیا۔ وہ ایک لمحے کسی بت کی مانند نظر آئی۔ پھر اس نے انتہائی سادگی سے کہا۔ ''غالباً میں دوبارہ پڑھائی شروع کردوں گی۔ میں بہت شکستہ ہوگئی ہوں۔'' میں نے بڑی مشکل سے اپنی خوشی کے تاثر کو چھپایا اور اسے سلیپرز اور کپڑے دکھانے لگی۔ میں نے یہ چیزیں اٹاوان سے خریدی تھیں۔ سویا نگ نے ایک سوٹ خاص طور سے پسند کیا۔ وہ خلانوردوں کے سستے سوٹ سے خاصا ملتا جلتا تھا۔ میں نے وہ سوٹ اسے دینا چاہا مگر اس نے ملائمت سے انکار کردیا۔ اگلے دن، میں نے وہی سوٹ مگر سیاہ رنگ کا، خریدا اور تحفتاً اسے دے دیا۔ اتفاقاً دکاندار کے پاس کوئی اور رنگ بچا ہی نہیں تھا مگر شکر ہے کہ

سویا نگ کو وہ اچھا لگا۔ اس کا خیال تھا' یہ کسی مجاہد کی وردی کی طرح لگتا ہے۔

میری منگنی ہوئی تو شادی کا تصور کسی ہیولے کی طرح تھا۔ زندگی یا ماحول میں تبدیلی کا کوئی خیال تک ذہن میں نہیں آیا تھا لیکن شادی سے دو دن پہلے چاؤ کے گھر سے بری کا سامان آیا تو ایک دم نئی حقیقتیں سامنے نظر آنے لگیں۔ شام کا وقت تھا۔ ایک شخص چہرے پہ نقاب ڈالے' اپنی کمر پر بری کا صندوق اٹھائے آن پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ اور نیلے رنگ کے باریک ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا ایک شمع دان تھا۔ ہر قدم آگے بڑھاتے ہوئے وہ نیگ مانگ رہا تھا۔ اچھا خاصا اودھم مچ رہا تھا۔ داخلی دروازے کے پاس میرے تین کزنز نے اسے بری کے سامان سمیت اٹھالیا اور زبردستی اندر لے گئے۔ وہاں ایک چھوٹی سی کشتی کی شکل کی ایک میز پڑی تھی۔ انہوں نے بری کا صندوق اس کے اندر رکھ دیا۔ پھر ماں جی کو بلا کر کہا گیا کہ وہ بغیر دیکھے صندوق میں سے کسی بھی رنگ کا کپڑا اٹھائیں۔ انہوں نے چاؤ کی طرف دیکھا۔ ''آپ جو بھی اٹھائیں گی' وہی ٹھیک ہوگا۔'' چاؤ نے صندوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن اندر موجود سرخ اور نیلے کپڑے کے بارے میں اپنی ترجیح ظاہر نہیں کی۔ ماں جی نے سرخ رنگ کا کپڑا اٹھالیا۔ اس سے یہ مفہوم نکلا کہ ہمارے ہاں پہلی بیٹی ہوگی۔ مجھے اس بات پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔ میں بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو بھلا کیوں ترجیح دوں۔ چاؤ کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چار لڑکوں میں دوسرے نمبر پر ہیں اور ہمارے لئے بس دو لڑکیاں بہت رہیں گی۔ بری لانے والے کو نیگ ایک سفید لفافے میں بند کر کے دیا گیا۔ اس نے رسم کے مطابق' وہ رقم واپس کرنا چاہی لیکن ابو نے انتہائی خوش مزاجی سے اسے رقم لوٹانے سے منع کر دیا۔ ''جب میری شادی ہوئی تھی تو میری ساس نے بری میں سے سکرٹ نکال لیا تھا۔ وہ تو اسی وقت رونے دھونے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں قابو کیا۔ میرے ذہن میں بیٹیوں کے معاملے میں کوئی بغض یا نفرت تھی ہی نہیں۔ پھر ہوا یوں کہ انہیں بہلانے کے لئے مجھے انہیں ڈرنک پیش کرنا پڑی۔'' ابو نے گویا شگفتہ لہجے میں چاؤ کو بتانے کی کوشش کی کہ اس میں مایوسی کا کوئی پہلو نہیں۔ روایتی لباس اور اس پر قیمتی جیکٹ' خوشبو میں بسی ہوئی' زیب تن کئے ابوّ' مجھے ہمیشہ سے کہیں زیادہ باوقار نظر آئے۔ بری کے صندوق کی نقاب کشائی سے پہلے کسی کو بھی سویا نگ کی غیر حاضری کا علم نہیں تھا۔ ہائی یا نگ سمیت سبھی عورتیں

بری کی چیزیں بغور دیکھ رہی تھیں۔ غیر شادی شدہ لڑکیاں خصوصی لطف لے رہی تھیں۔

ظاہر ہے ایک دن انہیں بھی اسی طرح پیا کے گھر رخصت ہو کر جانا ہوگا۔ ہائی یا نگ بڑھ چڑھ کر دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ کپڑوں کے نام پوچھنا تو الگ رہا' وہ ایک ایک رسم اور اس کے ہر انداز کو یاد رکھنے کی کوشش میں تھی۔ سویا نگ غالباً اس وقت گھر سے چلی گئی ہوگی' جب میں بیوٹی پارلر گئی ہوئی تھی۔ وہ گھریلو ہنگاموں سے دور رہنا پسند کرتی تھی۔ آدھی رات کے لگ بھگ ماں جی کی بہنیں اور چاؤ کے گھر والے' اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میں بھی اوپری منزل پہ جا کر' کاہلی کی کیفیت میں' ایک بجے تک بیٹھی رہی۔ میرا کمرہ روز کی نسبت کہیں زیادہ دلکش نظر آ رہا تھا۔ نرم و ملائم' آرام دہ بستر' اورنج شیڈ کا نائٹ لیمپ' باخ کے ریکارڈز' کوریائی سارنگی اور شکستہ کھڑکی کو چھپائے ہوئے سبز پردے یہ آرام دہ کمرہ میری پسندیدہ جگہ تھا' یہاں آ کر' میں پوری دنیا سے خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ یہ بالکل ماں کی آغوش کی طرح تھا' جہاں میں اپنا سارا دکھ درد بھول جایا کرتی تھی۔ زندگی کا ایک انتہائی تکلیف دہ وقفہ' اسی کمرے کی پناہ میں گزرا تھا۔

سویا نگ رات بھر گھر سے غائب رہی۔ کچھ دن مسلسل گھر میں رہنے سے شاید وہ اکتاہٹ کا شکار ہوگئی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ لیکن اگلی صبح میں اس کے کمرے میں جانے کی خواہش پر قابو نہ پا سکی۔ اس کا کمرہ پہلے سے کہیں زیادہ قریب لگا۔ اس نے اپنی ڈائری میز کی نچلی دراز میں رکھ دی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ میری چالاکی سمجھ گئی ہے' لیکن میں نے خود کو سمجھایا کہ شادی کے بعد' یہ موقع کبھی نہیں ملے گا۔ بغیر تاریخ کے کچھ اور اندراجات موجود تھے۔

مجھے پتہ نہیں' میں کیا چاہتی ہوں اور ایسی کوئی خاص چیز ہے بھی نہیں جس کی مجھے خواہش ہو۔ بے کیف اور بے معنی عید کارڈ' پھول کی طرح کھلتی ہوئی اطلسی شمع' چیک دار اونی سکارف میں بازاروں میں گھومتے پھرتے' دکانوں میں جھانکتی ہوں' چیزوں پر میری نظر پڑتی ہے' میں انہیں دیکھنا اور ٹٹولنا شروع کر دیتی ہوں' جیسے یہ بھی میری ذمہ داری ہے اور نتیجہ زیادہ شدت سے اپنی روح کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔

غالباً میں شاعری کرنا چاہتی ہوں لیکن میرے آوارہ اور منتشر خیالات میرے قابو میں نہیں آپاتے' بے ربط ہوتے ہیں۔ کوئی تسلسل ہی نہیں بنتا۔ میں شمعوں کو گھورتی رہوں یا

اندھیروں میں کھو جاؤں' بات نہیں بنتی لیکن میرے اندر ایک اور میں ہے جو مجھے گھورتی رہتی ہے اور پھر یہ کہتے ہوئے بغاوت پر اتر آتی ہے۔

'' بے معنی' بے طاقت۔''

غالباً' یہ اندراج اس دن کا ہے جب ابو نے سویا نگ کو لات مار کر گرایا تھا۔بعض فقرے تو صاف پڑھے بھی نہیں جا رہے تھے اور بعض جگہوں پر پین کاغذ میں گھسا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے اس بے ربطگی اور دن رات کے ڈرم کی آواز میں گہری مماثلت نظر آتی ۔واضح فقرے' جو میری سمجھ میں آئے' شاعری کے بارے میں تھے ۔میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ سویا نگ شاعری کرنا چاہتی ہے۔اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں یقیناً اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔ میں دراصل ان دوراتوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی' جو اس نے مسلسل باہر گزاری تھیں۔اگلے اندراج سے مجھے واقعات کا کچھ اندازہ ہو۔

چانگ نو کسی ایکویریم کی طرح لگتا ہے مگر آدمی عادت سے مجبور ہے اور چانگ نو کی اپنی حدود ہیں۔نوجوان لڑکے لڑکیاں خوب بن ٹھن کر یہاں آتے ہیں اور ہنگامہ آرائی سے بھرپور' ریستورانوں میں وقت گزارتے ہوئے ہیجانی کیفیات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔میں بھی ظاہری طور پر بڑے جوش وجذبے کا مظاہرہ کرتی ہوں۔کل میں سی سے ٹکرا گئی۔ میں گھنے بالوں کی وجہ سے اسے پہچان نہیں سکی۔بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو وگ تھی۔میں نے اسکی وگ اتارنے کے لئے اچھا خاصا وقت ضائع کیا۔نہیں یہ بات نہیں بلکہ ہم اپنی شکستگی اور ناآسودگی کو شیئر کر رہے تھے۔ابتدا میں تو وہ اپنی کم مائیگی کا رونا روتا رہا پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

''سکول چھوڑنے کے بعد سے کیا کرتی پھر رہی ہو؟ کیا چانگ نو میں ہی اٹکی ہوئی ہو؟''

تمہارے پاس تو احتجاجی سرگرمیاں ہیں' میں بھلا کیا کر سکتی تھی؟ پھر میں اپنے آپ پر ہی ہنس پڑی ۔کچھ دیر بعد اس نے کہا:'' تم یہ حرکت اس لئے کر رہی ہو کہ میں انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہوں۔یہی بات ہے نا؟'' میں نہ تو کوئی فاحشہ ہوں اور نہ ہی کنواری مریم۔تمہیں میں نے اپنے بازوؤں میں اس لئے پکڑ رکھا ہے کہ میں خود پر واجب الاداتم لوگوں کے قرض کا کچھ نہ کچھ حصہ واپس کردوں لیکن یہ بھی ایک لایعنی دفاع تھا۔پھر ہم آدم اور حوا کی شکل اختیار کر گئے' لیکن برہنہ ہونے کے باوجود ایک نادیدہ دیوار ہم دونوں کے درمیان حائل تھی۔

یہاں سویا نگ نے ایک لائن چھوڑ دی تھی۔اس کے بعد اگلا اندراج اس نے سبز سیاہی

سے کیا تھا: جسم' جو میری روح کے دکھوں کو وجود بخشتا ہے' میرے لئے ایک ایسا دریا ہے' جسے میں لاکھ کوشش کے باوجود عبور نہیں کر سکتی۔ انتہائی ناکارہ اور بے معنی یہ چیز' جس نے بالآخر مجھے گلا سڑا کر رکھ دیا ہے' مجھ پر ایسا بوجھ ہے' جو مجھے دریا عبور کرنے نہیں دیتا۔ میں ان طفل تسلیوں' فریب نظری اور دھوکے بازیوں کو مسترد کرتی ہوں جو لوگوں کے ذہنوں پر سوار رہتے ہیں اور وہ تحفتاً یہ سب مجھے بھی دینا چاہتے ہیں۔

آج ہر چیز میرے دردسر میں اضافہ کر رہی ہے' مجھے بیمار کئے جا رہی ہے۔ عجیب بات ہے۔ جلتی موم بتیوں کی مہک بھی مجھے بری لگ رہی ہے اور یہ سب کچھ اس جسم کی وجہ سے ہے جو اڑ نہیں سکتا۔ کبھی میرے بھی پر تھے مگر اس وقت میں اپنے جسم کو نہیں پہچانتی تھی۔

سویا نگ نے یہ سب کچھ ان چار دنوں میں لکھا تھا' جب وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اپنی کلائی زخمی کر لینے کے بعد' اگلے دن وہ کتنی مسرور اور مطمئن نظر آئی تھی۔ وہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ اس میں تبدیلی آ رہی ہے۔ لیکن اب پھر میرے ذہن پر سیاہ بادلوں کا جمگھٹا سا لگ رہا تھا۔ پچھلی رات وہ گھر سے باہر رہی ہے' کہیں کوئی وحشت انگیز واقعہ نہ ہو گیا ہو۔ میں بری طرح پریشان ہو گئی۔ اس دن بھی ہم ڈنر سے فارغ ہو گئے تھے اور سویا نگ کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایسے خوشی کے موقع پر سویا نگ کا گھر سے باہر رہنا ماں جی کو بری طرح چبھا ہو گا لیکن شادی سر پر ہونے کی وجہ سے انہوں نے سویا نگ کا تذکرہ نہیں کیا۔ چھ بجے کے قریب میں کینفے لکڑ گھوڑا گئی تا کہ کیا نگ آک سے سویا نگ کے بارے میں معلوم کر سکوں۔ اس نے جواب دیا کہ وہ ابھی تک سویا نگ کی راہ تک رہی ہے۔ وہ اپنی نوٹ بک لینے واپس ہی نہیں آئی۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ سویا نگ نے نوٹ بک کے بارے میں' مجھ سے تو دریافت نہیں کیا۔ ظاہر ہے کیا نگ آک سویا نگ کی گزشتہ رات کی مصروفیات سے بالکل بے خبر تھی۔ ماں جی باراتیوں کی خاطر تواضع کے انتظامات' میرے ہنی مون کے پروگرام اور اسی طرح کے دوسرے معاملات پر مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ میں ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔ ان کی کوئی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بار بار میری نگاہ اپنی کلائی کی گھڑی پر جا پڑتی۔ تقریباً نو بجے' میں کچھ دیر کے لئے اوپری منزل پر چلی گئی اور پھر چپکے سے گھر سے باہر نکل آئی۔

ہمیشہ کی طرح' اس دن بھی چانگ نو میں لڑکے لڑکیوں کا بے ہنگم ہجوم تھا۔ بازار میں ہر

طرف کھڑے یا بیٹھے یہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایک انڈر پاس سے باہر نکلتے ہوئے ایک دوبار تو میں بری طرح ٹکراتے ہوئے بچی۔ کوئی روسٹ کے مزے لے رہا تھا تو کوئی آلو کے میٹھے سٹکس چبا رہا تھا۔ بعض لوگ ٹافیوں اور آئس کریم کی مٹھاس، خوشبو اور ٹھنڈک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں ایک تنگ سے بازار میں گھس گئی اور دونوں جانب موجود دکانوں میں تانک جھانک کرتی چلتی رہی۔ گزرتے گزرتے ایک ہیر ہال آ گیا۔ خاصا دلکش دروازہ تھا اس کا اور اس کے ساتھ ہی دیوار پر ڈائیونگ کا ساز و سامان آویزاں تھا۔ میں نے تھوڑی سی حیرت سے، کھڑکی کے ذریعے اندر جھانکنے کی کوشش کی تو ایک ویٹر باہر آ گیا اور مجھے اندر جانے کیلئے کہنے لگا۔ اس نے بتایا کہ ہال کا مالک کورل ایکویٹک کلب کا صدر بھی ہے اور اگر مجھے سکوبا ڈائیونگ میں دلچسپی ہے تو وہ میری مدد کر سکے گا۔ میں مسکراتی ہوئی آگے چل دی۔

سویا نگ اس ڈائیونگ گیئر سے یقیناً محظوظ ہوتی۔ وہ تو فطرتاً شاید سمندر ہی کی کوئی بلا تھی۔ جن دنوں وہ سکول میں داخل ہوئی تھی۔ ہم سب گھر والے، مشرقی ساحل پر تفریح کرنے گئے تھے۔ سمندر کی بپھرتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر سویا نگ نے کہا تھا: سمندر کی جوانی تو سدا بہار ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ کاش وہ کسی بحری سکول میں جا کر سمندری تعلیم حاصل کر سکتی۔ بالخصوص زیر آب زندگی کا علم۔ ایسے بہت سے خواب تھے سویا نگ کی خواہشات کے، جن کی وہ تعبیر چاہتی تھی۔ کیا پانچ سال اتنے طویل ہوتے ہیں کہ اس دوران سارے خواب ختم ہو جائیں؟

میں بلا مقصد تنگ بازار میں مٹر گشت کرتی کراتی، بالآخر بوشن باغ کے احاطے کے قریب جا پہنچی۔ لمحے بھر کو مجھے لگا جیسے کوئی شخص نشے میں چور، مدہم روشنی میں، بے سدھ پڑا ہے۔ میں اسے نظر انداز کرتی کچھ اور قدم آگے بڑھی۔ ایک باڑ کے سہارے، دو لڑکیاں کھڑی کوئی خوبصورت گانا گا رہی تھیں۔ چانگ نو میں، رات کے پچھلے پہر، ایک باغ کی باڑ سے ٹیک لگا کر گانا! ہے نا کتنی عجیب بات! ان کے معصوم چہرے، ان کے سکول گرلز ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں ان کی حوصلہ افزائی کروں۔ ان کے پاس جا کر، میں نے ان کے گانے کی تعریف کی۔ ایک لڑکی نے، جس کے لمبے بال تھے، بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''ہمیں یہاں گانا اچھا لگتا ہے۔ ہم گا ہی وہاں سکتے ہیں، جہاں اسطرح کا ماحول ہو، ایک طرح کی مستی ہم پر چھا جاتی ہے اور ہم اپنے دکھوں کو بھول جاتے ہیں۔ یہ بات بڑی اچھی ہے

کہ یہاں بس ہم لڑکیاں ہی ہیں۔'' میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ صرف گانے کی خاطر ہی یہاں نہیں آئیں۔ جب بہت سے بچے کہیں اکٹھے ہو جائیں تو جنگل میں منگل ہونے لگتا ہے۔ لطف کی بات اپنی جگہ' اس کے ساتھ ایک اطمینان یہ بھی تھا کہ صرف وہی کنفیوژن اور منتشر خیالی کا شکار نہیں۔ چانگ نو کا چکر لگانے کے بعد' میں سم تھنگ کی طرف لوٹ آئی۔ سویانگ کی ڈائری میں مذکور بلیو برڈ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ ان دونوں جگہوں میں سے کہیں بھی مجھے سویانگ کے ملنے کی توقع نہیں تھی۔ بس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کے قریب ہی کہیں پھر رہی ہوں۔

میں سم تھنگ میں داخل ہونے ہی لگی تھی کہ ناگہاں میری نگاہ آئیوری رنگ کے سوٹ پہنے ایک نوجوان پر جا پڑی۔ یہ ہارنو تھا۔ وہ خاصی بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا' جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کے گلے کی چین میں دھاتی ہاتھی لٹکا نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے پاس چلی گئی۔ ''ہلو! یہ کیسی چین ہے؟ کسی نے تمہیں افریقی قبائل کا سردار تو نہیں بنا دیا؟

''لگتا ہے فیشل کرانے کسی بیوٹی پارلر جا رہی ہیں آپ؟ ا''س نے اپنے چہرے پر ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے گویا اپنی بات میں زور پیدا کیا۔ میں ہنس پڑی۔

''کسی کا انتظار کر رہے ہو؟'' میں نے عام سے انداز میں پوچھا۔

''آپ نے پچپس کو تو نہیں دیکھا۔ مجھے ایک جگہ جانا ہے' کچھ کاروباری سلسلہ ہے مگر اس کے لئے پیسے چاہئیں۔'' وہ انتہائی بے صبری کے عالم میں دوبارہ بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

''کتنے پیسے چاہئیں؟'' میں نے ملنساری سے پوچھا۔

''پانچ ہزار۔'' اس نے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے پانچ ہزار کا نوٹ پرس سے نکالا اور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہارنو نے رقم جیب میں رکھی اور جانے ہی والا تھا کہ ایک اور جانا پہچانا چہرہ سامنے آ گیا۔ یہ پچپس تھا۔

''ایک منٹ سنو' ہارنو نے پچپس کو بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ وہ مجھے سلام کرنے جا رہا تھا۔ وہ اسے چند قدم دور لے گیا۔ کچھ دیر اس سے کانا پھوسی کی۔ پچپس اپنا سر ہلاتا رہا۔ پھر ہارنو پچپس کو چھوڑ کر چانگ نو کے چوراہے کی طرف چل دیا۔

''لگتا ہے' آج کوئی خاص کام کرنے جا رہے ہو تم لوگ۔۔۔ اتنے بن ٹھن کر۔'' میری نگاہ

اس کے چمکدار قرمزی پل اوور پر تھی۔ پچپس نے اپنی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہیں پتہ ہے' آج جمعہ کا دن ہے۔ہمیں کافی سکیموں پر کام کرنا ہے۔اگر ہارنو نے کامیابی سے یہ کام سرانجام دے دیا تو ہمارے پاس اتنی رقم آ جائے گی کہ ہم آج رات عیش کر سکیں۔ اگر اس نے کسی کے لئے نوعمر لڑکی ڈھونڈ نکالی تو اسے ایک لاکھ وون مل جائیں گے۔''

ٹائٹ کپڑے پہنے لڑکیوں کا ایک گروپ ہمارے پاس سے گزرا۔ انہیں اوپر سے نیچے دیکھنے کے بعد' پچپس نے اپنی ناک پھلائی اور دوبارہ چوراہے کی طرف دیکھنے لگا۔ ہارنو اسی طرف کہیں گیا تھا۔ میں ان کی حرکات پر خاص متجسس ہوگئی۔ میں نے پچپس سے وضاحت چاہی تو وہ بلا جھجک بتانے لگا۔ ''کوئی بوڑھا کاروباری شخص سم تھنگ کے مالک کے پاس آیا اور اسے ایک نوعمر لڑکی سے ملانے کے عوض اچھی خاصی رقم کی پیش کش کی۔ سم تھنگ کے مالک نے یہ ڈیوٹی ہارنو کو سونپ دی۔ اب وہ کسی لڑکی کی تگ ودو میں ہے' تاکہ اس رقم کا مناسب حصہ اسے بھی مل جائے۔ پچپس کے لہجے میں حقیقت جھلک رہی تھی۔ ایسی لڑکیاں یہاں موجود ہوتی ہیں' صرف انہیں ڈھونڈ نکالنا ہوتا ہے۔ ہماری بھی عیش' اس کی بھی عیش۔ اچھا ہے نا؟ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہارنو کوئی لڑکی پھنسانے کے لئے میری رقم استعمال کر رہا تھا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور پچپس رفو چکر ہوگیا۔ میں نے نظر دوڑائی تو وہ کچھ دور کھڑا ایک گھنگھریالے بالوں والی لڑکی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ٹھیلے سے غالباً آلو کے سنکس خرید رہی تھی۔ پچپس نے اسے انتہائی اپنائیت سے ایک گھنٹے بعد' وہیں ملنے کے لئے کہا۔ لڑکی نے اسے بغور دیکھا اور احمقانہ انداز میں ہنس پڑی۔ غالباً اس نے پچپس کی خباثت آمیز بات کا برا نہیں مانا تھا میری نگاہ لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائی۔ میں نے چہرے پر درشتی پیدا کی اور آرام سے منفی اشارہ کر دیا۔

کچھ پیاس اور کچھ تھکاوٹ کے ہاتھوں میں سم تھنگ کے اندر چلی ہی گئی۔ گراؤنڈ فلور نوعمر لڑکے لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ موسیقی کا بے ہنگم شور ماحول میں شراب کی بو کے ساتھ بری طرح رچا بسا تھا۔ چنانچہ میں اوپر چلی گئی۔ ڈسک جوکی کے بوتھ سے نکلتی ہوئی سبز روشنی زینوں پر پڑ رہی تھی۔ جوکی نے کچھوے کی سفید کھال کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ ایک روبوٹ کی طرح بار بار اوپر نیچے آ جا رہا تھا۔

ریکارڈ روم سے ریکارڈ لانا' مشین میں لگانا' ٹیلیفون سننا یہ سب اس کے کام تھے اور اسکی ہر حرکت مجھے میکانکی بلکہ غیر انسانی لگ رہی تھی۔ دوسری منزل تک پہنچتے پہنچتے میری نگاہیں اسی

پر جمی رہیں۔ یہاں رش نسبتاً کم تھا۔ سفید کرسیاں بکھری ہوئی' طمانیت کا احساس دے رہی تھیں۔ یہاں کا ماحول خاصاً مختلف تھا۔ کچھ نوجوان سفید پوش ایک جانب بیٹھے مصروف گفتگو تھے۔ دوسری جانب ایک ادھیڑ عمر شخص' انتہائی نفیس لباس پہنے' بار کی جانب پشت کئے بیٹھا تھا۔

میں ایک ایسی میز پر بیٹھی جہاں سے میری نظر ڈسک جوکی پر پڑتی رہے۔ اس کی ہر جنبش پر تصنع اور جانی بوجھی لگ رہی تھی۔ اس کا سر نوّے ڈگری تک مڑ جاتا تھا' جیسے جسم سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ بار بار وہ یہی سادہ سی حرکات دھرا رہا تھا۔ اس کا بے تاثر اور بے جان چہرہ دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ وہ مچھلیوں کے کسی تالاب میں تیرتا ہوا مشینی آدمی لگ رہا تھا۔ عجیب نرالی شے تھا وہ بھی!

میں نے بیئر کا آرڈر دیا اور پھر ڈسک جوکی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اچانک مجھے ہارنو کے آئیوری رنگ کے سوٹ کی جھلک نظر آئی۔ وہ اوپر آ رہا تھا۔ اوپر آتے ہی وہ اس ادھیڑ عمر آدمی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں آپس میں کچھ دیر کھسر پسر کرتے رہے۔ اس کے بعد ادھیڑ عمر شخص نے جیب سے بٹوہ نکالا اور اس میں سے کچھ رقم' اس نے ہارنو کو دی۔ ہارنو چلا گیا۔ اس شخص نے اپنا بیئر کا گلاس ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی جلدی جلدی بیئر کے لمبے گھونٹ بھرے اور اٹھنے کے لئے تیار ہوگئی۔ ڈسک جوکی کے بوتھ میں گھڑی تقریباً گیارہ بجا رہی تھی ۔ جانا تو اس وقت سیدھا گھر چاہئے تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنے سامنے طے پاتے معمے کا انجام دیکھنے کی فکر لگ گئی تھی۔ میں نیچے آئی تو ہارنو نگاہوں سے غائب ہو چکا تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی کار پارکنگ کی طرف چلا گیا اور جلد ہی کریم کلر کی ہنڈائی میں واپس آتا نظر آیا۔ اس نے کار چوراہے کے ایک کھلے کونے میں کھڑی کرلی۔ اس اثنا میں ہارنو ایک عمارت سے نکل کر اس کی جانب آتا دکھائی دیا۔ اس نے کار کو اشارہ کیا اور کار اس کی جانب آہستگی سے بڑھنے لگی۔ ہارنو اپنے پیچھے کھڑی ہوئی ایک عورت کی طرف مڑا اور پھر کار کی ڈرائیور سائڈ کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اپنی نگاہیں عورت پر مرکوز کردیں۔ وہ ابھی تک' ایک ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالے' عمارت کے داخلی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ غالباً وہ ہنڈائی کی جانب متوجہ تھی' جہاں دو آدمی سرگوشی میں محو تھے۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹ کر رہ گئیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ چھوٹے بالوں والی لڑکی' اپنی جیکٹ' خوشنما وضع قطع کے ساتھ خوبصورت اور سمجھدار لگنے کے باوجود' بلاشبہ سویا نگ ہی تھی۔ ہارنو اسے گاڑی کی طرف لے جانے کیلئے مڑا تو میں

حیرت کے مارے پتھرائی ہوئی کھڑی تھی۔

ہارنو نے دروازہ کھولا۔ سویا نگ نے بدحواسی میں' اپنے بال پیچھے کی طرف پھینکے اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں ہانپتے کانپتے کار کی جانب لپکی' ہارنو کو ایک طرف کیا اور سویا نگ کا بازو پکڑ لیا۔ ''کیا کر رہی ہو؟ باہر نکلو' جلدی کرو۔''

سویا نگ نے میری طرف دیکھا اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میری لرزتی آواز کے باوجود' اسے میری اچانک آمد کی حقیقت ذرا بھی متاثر نہیں کر سکی۔

''میں نے کہا نا: باہر آؤ۔ فوراً پاگل کہیں کی۔'' میں نے اسے اتنی سختی سے کھینچا کہ اس کی جیکٹ ادھڑنے لگی۔

''دروازہ بند کردو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' سویا نگ چیخی' پھر اس آدمی سے بولی۔ ''چلیں۔''

کار حرکت کرنے لگی لیکن میں نے دروازہ نہیں چھوڑا۔ ہارنو نے مجھے روکنے کی کوشش کی میں نے اپنا پرس اس کے منہ پر دے مارا۔ ''باسٹرڈ۔''

راہ گیر' کار کے گرد اکھٹے ہونے لگے۔

''میں نے کہا تو ہے' میری جان چھوڑ دو۔ بیوقوف۔'' سویا نگ بری طرح چلائی۔ پھر وہ کار سے نکل آئی۔ مجھے اور ہارنو کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے' وہ مین بازار کی طرف بھاگنے لگی۔ میں نے کار کا دروازہ زور سے بند کیا اور سویا نگ کے پیچھے بھاگنے لگی۔ لوگوں سے ٹکراتی' ہانپتی کانپتی' وہ کسی زخمی پرندے کی طرح اڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہی لگا جیسے وہ انسانی سمندر کے بھنور میں بری طرح پھنس گئی ہے۔ اس کی جیکٹ کسی ٹوٹے ہوئے پر کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ میں مین بازار تک پہنچ ہی پائی تھی کہ ایک آدمی سے ٹکرا گئی۔ معذرتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں دوبارہ بھاگنے لگی لیکن پرندہ اڑ چکا تھا' میری پہنچ سے دور۔ میں اسے پکڑ نہیں سکی تھی۔

انسانی سمندر کو چیرتی پھاڑتی' میں چائنا ٹاؤن کی سڑکوں پر دیوانہ وار بھاگتی پھری جیسے میں اپنے حواس کھو بیٹھی ہوں مگر بیکار' کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں دفن ہو جاتی۔

ایک ویڈیو آرکیڈ کے سامنے میری ہمت ٹوٹ گئی۔ رات خاصی بیت گئی تھی۔ بازاروں کی رونقیں مدہم ہوتی جا رہی تھیں۔ ویڈیو کھیلیں مثلاً: بروس لی کی واپسی' اینیمل فارم' ویت نام کی پہلی جنگ اور نہ جانے کیا کیا' میری نظر کے سامنے آئیں لیکن میں ہچکچاہٹ کے مارے رکی نہیں' حالانکہ سکرینوں پر جھلملاتے مناظر' ویڈیو کی مخصوص ساؤنڈ اور ان کے پیچیدہ کنٹرول' ہمیشہ

مجھے اپنی طرف کھینچ لیا کرتے تھے۔ ایک سکرین کے آگے یونہی ٹھہر گئی' غائب دماغی کی سی کیفیت تھی۔ ٹارزن شاخ درشاخ اچھلتا اور چھلانگیں لگاتا جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ یہ شاید سب سے آسان کھیل تھا۔ لیکن ٹارزن کو کنٹرول کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اگرچہ میری نگاہیں سکرین پر جمی ہوئی تھیں' یونہی بٹن پر ہاتھ چلنے لگا مگر کہیں نہ کہیں رفتار کی عدم مطابقت' اس کی چھلانگ میں گڑبڑ کردیتی اور وہ شاخ سے زمین پر آپڑتا۔ کھیل اسی طرح ختم ہوجاتا تھا۔ میرے برابر میں کھڑا ہوا لڑکا اینمل فارم کھیل رہا تھا اور وہ کھیل میں اتنا محو تھا کہ اسے اردگرد کا ہوش ہی نہیں تھا۔ میں اسی عالم میں ٹارزن کو زمین پر گرنے سے بچانے کیلئے تن من دھن کی بازی لگائے بیٹھی تھی۔ ہزار کا نوٹ مشین کی نظر کرنے کے بعد' مجھے کچھ ہوش آیا۔ میں نے تلملا کر مشین سے اپنی جان چھڑائی۔ پانچ سال ایک بینک میں کام کرنے کے باوجود' کمپیوٹر کے معاملے میں' میں انتہائی نااہل تھی۔

اکثر دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ سڑک پر اکادکا آدمی ہی نظر آرہا تھا۔ بازار میں ریڑھیاں لگانے والے کبھی کے غائب ہوچکے تھے۔ دوسری منزل کا کرکٹ گراؤنڈ البتہ ابھی روشن تھا اور وہاں سے بیٹ اور گیند کے باہم ٹکرانے کی آوازیں سڑک تک آتی محسوس ہورہی تھیں۔ ادھر ادھر سے چند ایک لوگوں کے جتھے نکلتے ہوئے اور اپنے گھروں کی راہ لیتے نظر آرہے تھے۔ ویڈیو آرکیڈ سے نکلتے ہی' نزدیک کھڑے ہوئے ایک ٹرک سے مجھے بہت ناگوار بو آئی۔

ٹرک میں کئی ڈرم پڑے ہوئے تھے۔ دونوجوان' اس پر ایک ڈرم رکھ رہے تھے۔ غالباً ریستوران بند ہونے سے پہلے' وہ ان کا کچرا سمیٹ کر ٹرک میں بھر رہے تھے۔

میں تیزی سے ٹرک کے پاس سے گزر گئی۔ چند قدم آگے کوئی آدھی درجن نوجوان ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے' زور شور سے گانا گارہے تھے۔ ہر ایک اپنا اپنا بازو لہرا رہا تھا۔

''جب میں چھوٹا تھا تو ساری محبتیں اور شفقتیں میرے لئے تھیں۔ لیکن اب غم روزگار ہے اور میں ہوں۔''

دونوجوان ایک عمارت کے نیچے بیٹھے خالی نظروں سے' سڑک پر بکھرے کوڑا کرکٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ نہ انہیں کسی کا انتظار ہے اور نہ ہی گھر لوٹنے کا کوئی ارادہ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سویا نگ کی طرح ان کے گھروں میں بھی' ان کے لئے کوئی پرسکون گوشہ موجود نہ ہو۔ مین بازار میں پہنچنے سے پہلے ہی میں ایک اور سڑک پر مڑگئی۔ سویا نگ کی

تلاش تو اب ناممکن ہی ہوگئی تھی لیکن میں گھر نہیں جانا چاہتی تھی حالانکہ اگلے روز میری شادی ہونے جارہی تھی۔ سویا نگ کو کار میں بیٹھتے دیکھ کر مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے جس ستون کا سہارا میں لئے ہوئے تھی' وہ گرادیا گیا ہے۔ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح' تیز ہوا کاش مجھے اڑا کر کہیں دور لے جا کر پھینک دیتی۔ شاید میں خود کو خالی خالی محسوس کر رہی تھی۔ میں اپنی زندگی کے ایک حادثے کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے شادی کر رہی تھی اور شادی سے صرف ایک رات پہلے میں لوگوں کی توقعات کے جال کو توڑ پھوڑ ڈالنا چاہتی تھی۔ تاریک اور پرسکوت عمارتوں سے بھری سڑک پر سے گزر کر' میں ایک اور بغلی گلی میں گھس گئی۔ کوانگ گیو کی طرف جانے والے راستے پر واقع ایک ڈسکو کا قرمزی نیون سائن' دائرے کی شکل میں گھومتا نظر آرہا تھا۔ ذرا آگے روشنی کے عین نیچے منی سکرٹ پہنے چندلڑکیاں پروانوں کی طرح اکٹھی نظر آرہی تھیں۔ ایک سنسان اور اندھیری گلی سے گزرنے کے فوراً بعد' یہ منظر کسی مختلف دنیا کا لگا میں ڈسکو کی طرف قدم بڑھانے لگی تو اندر سے موسیقی کا شور سنائی دیتا محسوس ہوا۔ اندر داخل ہوئی تو اندھیرے سے ابھرتا ہوا میوزک میرے کانوں کے پردوں کو کاٹنے لگا۔

ڈانس فلور بھرا ہوا تھا۔ دونوجوان رقاصائیں' چہروں پر میک اپ تھوپے ایک دائرے میں رقص کررہی تھیں۔ ان کے سوئٹر بدن سے اس بری طرح چپکے ہوئے تھے جیسے جسم کا ہی حصہ ہوں۔

کوئی میز خالی نہیں تھی۔ حبس کے مارے میں چکرانے لگی سوفوراً ہی میں داخلی دروازے کے قریب رکھے صوفے میں دھنس گئی۔ اکثریت کالج کے نوجوانوں کی نظر آرہی تھی۔ وہ رقص میں اس بری طرح محو تھے جیسے اپنے بدن کا سارا درد' ساری تلچھٹ باہر نکال پھینکنا چاہتے ہوں۔ ڈسکو کی تیز اور رنگین روشنیوں میں ان کے چہروں پر موجود تھکن درماندگی اور بے چینی صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ ایک لڑکا آنکھیں بند کئے موسیقی کے شور میں اپنی آواز اس شدت سے ملانے کی کوشش میں تھا کہ اس کا پورا بدن بری طرح لرز رہا تھا۔ ڈسک جوکی نے ہلکے سروں والی موسیقی کا ریکارڈ لگا دیا۔ میں بیئر کے ساتھ کچھ سنیکس لے رہی تھی کہ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک شخص میرے پاس آیا اور مجھ سے رقص کرنے کی فرمائش کرنے لگا۔

میں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میں کسی کی منتظر ہوں۔ میں یہاں کسی خاص مقصد کے تحت تو آئی نہیں تھی لیکن رقص کرنا میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا اور وہ بھی خصوصاً کسی اجنبی کے ساتھ۔ میں نے چاروں جانب نگاہیں دوڑائیں۔ مجھے ایک جوان آدمی کونے میں تنہا بیٹھا نظر

آیا۔اس کے لمبے لمبے بال تھے مگر اس کی شرٹ کے بڑے کالر سے مجھے یوں لگا جیسے وہ پرانے زمانے کا کوئی ملاح ہو۔ سوڈے کا ایک گلاس میز پر اس کے سامنے پڑا تھا۔ وہ لوگوں کو ڈانس کرتے دیکھتا' بوریت محسوس کرتا اور سوڈے کے گھونٹ لینے شروع کر دیتا۔ وہ یہی عمل دھرائے جا رہا تھا۔ میں کچھ متجسس ہوگئی۔ ہم دونوں ہی بغیر ساتھی کے تھے۔ عمر میں بھی وہ مجھ سے چھوٹا لگ رہا تھا۔اس وجہ سے بھی میں نے حوصلہ پایا اور اس کے پاس جا پہنچی۔

''برا تو نہیں مانو گے' اگر میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' بغیر رکھ رکھاؤ کے' میرے براہ راست انداز نے خود مجھے بھی حیران کر دیا۔ جوان آدمی جو خالی نظروں سے رقاصاؤں کو دیکھ رہا تھا' حیرت کے مارے انکار نہ کر سکا۔ میں اپنی بیئر اٹھا لائی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بیئر چلے گی؟'' میں نے پوچھا۔اس نے میرا بغور جائزہ لیا اور ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مان گیا۔ میں نے اپنا خالی گلاس اس کی طرف بڑھا کر اس میں بیئر انڈیل دی۔ ''میں بھی اکیلی تھی۔ کرنے کو کچھ تھا نہیں اس لئے سوچا کسی سے گپ شپ ہی ہو جائے۔ میں تمہاری عمر کا اندازہ لگاؤں؟ بیس ہوگی؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔''میں بائیس سال کا ہوں۔''

''میں ستائیس سال کی ہوں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے ایکبار پھر میرا جائزہ لیا۔

''میرا خیال تھا کہ تم پچیس کے لگ بھگ ہو۔''

میں نے فوراً ہی پوچھ لیا۔''تم یہاں کب آئے تھے؟''

''میں دس بجے کے قریب گھر سے کھسکا تھا۔ میری ماں سمجھ رہی ہوگی کہ میں خراٹے کی نیند لے رہا ہوں۔''

''تم گھر سے بتائے بغیر کیوں نکل آئے؟''

اس دفعہ اس سے جواب نہ بن پڑا تو اس نے الٹا سوال کر دیا۔''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کچھ بھی نہیں میں اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جی چاہا کہ تم سے باتیں کروں اور بس۔'' نوجوان کی بے چینی کچھ کم نظر آنے لگی۔اس نے بتایا کہ وہ کسی لڑکی سے دوستی کی غرض سے یہاں آیا ہے۔ عمر میں کچھ بڑا ہونے کے باوجود وہ قبل از وقت ذہنی ارتقاء کے اعتبار سے سویا نگ سے ملتا جلتا لگتا تھا۔عورتوں کے بارے میں اس کا براہ راست انداز گفتگو مجھے دلچسپ لگا۔

''کس طرح کی عورتیں پسند ہیں تمہیں' کسی کی طرف اشارہ تو کرو؟''

نوجوان رقاصاؤں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میرون رنگ کا سویٹر پہنے ایک لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ شوخی اس کے چہرے پر ناچ رہی تھی۔ درمیانہ قد اور چھوٹے بال تھے۔ رقص کرتے ہوئے اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھتے تھے۔ مجھے وہ خاصی شرمیلی لگی۔ ایسی لڑکیوں سے دوستی خاصی کٹھن ہوتی ہے۔ میں نے آہستگی سے سر ہلایا۔ ''کیا تم ایسی جگہوں پر کسی لڑکی سے دوستی کر سکتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ کلبوں میں میرے لئے بہتر مواقع ہوں گے کیونکہ وہاں مختلف سرگرمیوں میں باہمی میل جول کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔'' میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

پھر وہ اچانک ہی بول پڑا۔ ''نہیں' یہ بھی ایک طرح کا دردسر ہی ہوگا۔''

کوئی ایک بجا ہوگا۔ بیئر کی بوتل ختم ہوتے ہی ہم لوگ وہاں سے اٹھ گئے۔ گلی بالکل سنسان اور تاریک تھی۔ صرف ڈسکو کے نیون سائن کی مدہم روشنی ادھر ادھر پڑ رہی تھی۔ گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر جابجا سڑک پر پڑے نظر آ رہے تھے۔ خزاں کی تیز ہوا چلی تو درختوں کے پتے اور کاغذوں کے ٹکڑے ہوا کے ساتھ اڑنے لگے۔ نوجوان اپنے پیروں میں آنے والے خالی ڈبوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا چلنے لگا۔ اس پوری گلی میں ہم دونوں کے طویل سایوں کے سوا اور کوئی وجود متحرک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''تم چانگ نو میں اکثر آتے رہتے ہو؟'' میری آواز معمول سے کہیں زیادہ اونچی تھی۔ ٹن کا ایک ڈبہ ٹھوکر سے کھڑکھڑا رہا تھا۔

''جب میں تنہائی محسوس کرتا ہوں۔''

لیکن ہر دفعہ ڈسکو میں آنے کا کوئی مزا نہیں' یا ہے؟

''اتنا زیادہ بھی نہیں۔ عموماً میں اکیلا ہی ہوتا ہوں۔ پرسکون ذہنی کیفیت میں موسیقی زیادہ اچھی لگتی ہے۔'' اس نے ایک ردی اخبار میں اپنا پیر الجھا لیا تھا۔ میں نے اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کے بارے میں استفسار کیا۔ میرا خیال تھا وہ گھر میں سب سے چھوٹا ہوگا مگر اس کا ایک اور چھوٹا بھائی بھی تھا۔ میرا بڑا بھائی فوج میں چلا گیا' وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔ میں اکثر اسے خط لکھتا رہتا ہوں وہ گھر آتا ہے تو میری اس کی خوب بنتی ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری شادی ہونے جا رہی ہے اور میرے احساسات بھی اپنے گھر والوں کے لئے ایسے ہی ہیں۔''

سڑک عبور کرتے ہوئے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی اپنے کندھے پر ایتھلیٹ بیگ اٹھائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہم سے آگے نکل گیا۔ میں نے اسے ڈسکو میں دیکھا تھا۔ وہ غالباً پیشہ ور ڈانسر تھا اور اپنے گھر کی سمت رواں دواں تھا۔ نوجوان بھی اسے پہچان گیا۔

''تم تو خوش ہوگے۔'' اس نے مذاق میں ڈانسر کو مخاطب کیا۔

''وہ کیوں؟'' ڈانسر نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''کیوں کہ تم ہر رات رقص کر سکتے ہو۔''

ہم چانگ نو کے تیسرے بلاک کی سمت بے سوچے سمجھے چل رہے تھے۔ مرکری ٹیوب کی بیضوی روشنی کے نیچے بکھری ہوئی گندگی اور کوڑے کے ڈھیر سے یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کبھی کسی انسان کے قدم آئے ہی نہیں۔ کسی وقت کوئی کار تیزی سے گزر جاتی تھی ورنہ دور دور تک کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی جانب سے اچانک نرم و سرد ہوا کا جھونکا آیا۔

''جمعدار بننا بھی خاصا کٹھن اور دقت طلب کام ہوتا ہوگا؟'' نوجوان نے پلاسٹک کے ٹوٹے ہوئے ڈبے کو زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں' بہت ہی گندا۔''

نوجوان اپنے گاؤں چوآنگ جو کی باتیں کرنے لگا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے لیکن ضابطوں کا مارا ہوا' بالائی طبقے کے لوگ ہمیں ہمیشہ صحیح اور غلط کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارا علم محدود ہے اور ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہے اور چیزوں کو جاننے کی خواہش ایسی غلط بات بھی نہیں۔ ''کیا کرنا چاہتے ہو؟ کچھ تو کرنا ہی ہوگا نا۔''

''میں اس بارے میں بالکل نہیں سوچتا۔ پیسہ کمانے کا مجھے کوئی شوق نہیں اور میرا کوئی خاص مقصد بھی نہیں۔'' اچانک وہ ایک وال پوسٹر کے سامنے رک گیا۔ یہ ایک ڈرامے ''شہد کا ذائقہ'' کا اشتہار تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا اڑتا ہوا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ ایک کیبرے کا اشتہار تھا۔ نوجوان نے مجھ سے وہ اشتہار لے لیا اور پڑھنے لگا۔ اس کا تجسس جائز تھا۔ سیون بلڈنگ کے نیچے ریڑھیوں پر قائم سنیکس سٹال کینوس کے پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ ''کچھ دیر کو بیٹھا نہ جائے؟'' نوجوان نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ہم ایک درمیانے سٹال کے سامنے پڑے بنچ پر بیٹھ گئے۔ کسی دوسرے سٹال کا مالک' وہاں سے اپنی ریڑھی لے جانے کے لئے اپنی چیزیں اکٹھی کر رہا تھا۔

ایک اور سٹال پر ایک دھت شرابی اس سٹال کے مالک سے الجھا ہوا تھا۔اس کی باتیں تو ہماری سمجھ سے خاصی اونچی تھیں تاہم کہیں کہیں گالیاں ضرور سمجھ آ رہی تھیں۔نوجوان اپنے ہاتھ میں موجود شراب کا ٹن تیزی سے چڑھا گیا۔''اس قسم کی چیزیں مجھے سمجھ نہیں آ تیں۔میرے خیال میں میرے اعصاب کمزور ہیں۔لیکن ان چیزوں اور مناظر سے جان بھی نہیں چھڑائی جاسکتی۔''

نوجوان نے اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ نشے میں دھت شخص کو نظر انداز کرنا چاہتا ہو۔پھر اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔''عام حالات میں تم یہاں خوب سیر تفریح کرتی ہوگی؟''

''اتنا موقع مجھے کبھی نہیں ملا لیکن کیا تم تھک نہیں گئے؟''میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

ڈھائی بج چکے تھے۔میں نے ڈرنک لینا چھوڑ دی۔عجیب سی تھکاوٹ کا احساس تھا مگر وہ نوجوان ہر طرح کی تھکاوٹ سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

''ایک دفعہ میں نے لگا تار تین راتوں تک آنکھ نہیں جھپکائی تھی۔صرف تجربے کے لئے۔''

اس وقت تک اس کی قمیض پر یونیورسٹی سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے بیج پر میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ مجھے فوراً یاد آ گیا کہ میں نے کالج میں داخلے کے وقت کلب کی رکنیت کے بارے میں نوٹس بورڈ پر پڑھا تھا۔ذہن میں یہ تصور آتے ہی' کالج کے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

میں نے گوشت کا ایک بڑا بھنا ہوا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ لیا تاکہ کھانے میں آسانی رہے اور باقی پلیٹ نوجوان کی طرف سرکا دی۔''گھر میں تم اپنا وقت کس طرح گزارتے ہو؟''

''مجھے ریڈیو سننا پسند ہے۔ٹیلی ویژن میں نہیں دیکھتا' لیکن ریڈیو کا اپنا لطف ہے۔میں کرداروں کو ان کی آوازوں سے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں اور جو کچھ بھی ایک دن میں ان پر گزرتی ہے اس کے ذریعے کئی دن بعد ہونے والے واقعات کا اندازہ لگاتا ہوں۔بعض چیزیں بڑی خوابناک ہوتی ہیں' مثلاً: یہ گزرتے لمحے آج کی رات میرے ذہن میں بعض اچھی یادیں چھوڑ جائیں گے۔''

وہ خاصی منفرد قسم کا لڑکا تھا۔اس لڑکے کی طرح --- جو بچوں کی کہانی میں -- دنیا کے معاملات کو ایک کھڑکی سے دیکھتا ہے۔اپنی عجیب غریب دنیا میں موجود وہ نامعلوم خوابوں کے خواب دیکھتا ہے۔عام طلبہ سے بالکل مختلف وہ ایک ایسی دنیا کا باسی ہے جو علم و آگہی اور نظریات کی آرائشوں سے پاک ہے۔صبح کی روشنی پھیلنے تک ہم سڑکوں اور گلیوں میں یونہی

آوارہ پھرتے رہے۔ ویڈیو کیفے میں بیٹھ کر کنگ فو کی فلم دیکھی۔ خلائی راکٹ کی شکل کے دارالموسیقی میں بیٹھ کر کافی پینے کا لطف لیا۔ کھمبوں کی روشنی میں سڑک کے کنارے لوگوں کو بے فکری سے سوتے دیکھا۔ بہت سے نوجوانوں کو ڈسکو سے نکل کر ریڑھیوں پر بنے سٹالوں پر دہی بڑے اور مرغ چھولے قسم کی چیزیں کھاتے دیکھا۔ یہ سارے منظر میری آنکھوں سے اس طرح گزرے جیسے پہلے کبھی میں نے دیکھے ہی نہیں تھے۔ بعض لوگوں نے انڈر پاس کی فٹ پاتھوں پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ ہم لڑکوں کے ایک گروپ کے پاس سے گزرے جو پوکر کھیل رہا تھا۔ میں نے رک کر باقاعدہ ان سے پوچھا کہ وہ گھر کیوں نہیں چلے جاتے۔

''بس کا کرایہ ہی نہیں ہے۔'' کسی نے کہا۔''آؤ بیٹھو ہمارے ساتھ۔'' اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ہم انڈر پاس سے باہر نکلے۔ گھر جانے کے لئے مجھے کسی بس کا انتظار تھا۔ سڑکیں ابھی پوری طرح ملگجے اندھیرے سے باہر نہیں نکلی تھیں۔ چوہے گندگی کے ڈھیروں سے اچھلتے کودتے کھلے گٹروں کی طرف بھاگتے نظر آرہے تھے۔ ایک بس ہمارے پیچھے آکر رکی۔ لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک ہجوم ہاتھوں میں سکول بیگ تھامے بس سے اترا۔ چنگو بھی پڑھنے کے لئے کبھی کبھار گھر سے نکلا کرتا تھا۔ یہ احساس گویا خود کو خواب سے بیدار کرنا تھا۔ ممکن ہے کچھ سال بعد وہ بھی انڈر پاس میں بیٹھا اپنے دوستوں کے ساتھ پوکر کھیلتا نظر آئے۔ دور ایک جمعدار سڑک کی صفائی میں مصروف نظر آیا۔ دس سال بعد شاید سویا نگ بھی کسی بھنگن کی طرح اپنے بچوں اور اپنے گھر کی صفائی ستھرائی میں لگی ہوگی۔ ریڈیائی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے نوجوان کی جانب دیکھا تو وہ ٹرانسسٹر ریڈیو اپنے کانوں سے لگائے نظر آیا۔ فوراً ہی ریڈیو سے پانچ بجنے کا اعلان ہوا اور اس کے بعد موسیقی بجنے لگی۔''ان کی ابتدائی موسیقی مجھ میں ایک نئی توانائی پیدا کر دیتی ہے۔'' موسیقی کی طرح اسکا چہرہ بھی جگمگا رہا تھا۔ میرے ذہن پر بھی کوئی بوجھ نہیں تھا۔

اچانک ہی میری آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ میرا نرم گرم بیڈ مجھے آواز دے رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔''رات بھر میرا ساتھ دینے کا شکریہ۔''

''کاش تم جیسے کچھ اور لوگ بھی ہوتے۔ کیا ہم دوبارہ بھی مل سکتے ہیں؟''

میں نے جواب نہیں دیا۔ ہم دوبارہ نہیں مل سکیں گے۔ اس رات کی معصومیت کا خزانہ ہمیں اپنے خوابوں کی زینت بنانا ہوگا۔ میری خاموشی کا مطلب سمجھ کر نوجوان نے اپنا ریڈیو

جیب میں رکھ لیا۔ ایک ٹیکسی قریب آئی تو میں نے ہاتھ لہرا کر اسے خداحافظ کہا اور ٹیکسی کی طرف لپکی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تنہائی جھلکتی دیکھی لیکن میں ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ٹیکسی چل پڑی۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ نوجوان آدمی کا خاکہ اس کا بے خواب چہرہ اور پس منظر میں ایک اداس صبح میری بند آنکھوں میں بھی گھسے جا رہے تھے۔ اب یہ سب میرے گزرے لمحات کا حصّہ تھے۔ اپنی زندگی کے راستوں میں آگے بڑھتے ہوئے کیا تمہاری معصومیت طاقتور ثابت ہوگی یا کمزور۔۔ میں نے خاموشی سے اس سے پوچھا۔

''پیٹر چاؤ اور پی می یانگ ! کیا تم دونوں یہ شادی بلا جبر وکراہ' اپنی آزادانہ عرضی سے کر رہے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''کیا تم تمام زندگی اپنی شادی کے بندھن کو پیار اور عزت دو گے؟''

''کیا تم خدا کے ودیعت کردہ بیٹوں اور بیٹیوں کو قبول کرو گے اور کیا تم ان کی پرورش اور تعلیم حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور چرچ کے قوانین کے مطابق کرو گے؟''

''جی ہاں؟''

''خدائے بزرگ و برتر چرچ کے سامنے کئے گئے باہمی رضا مندی کے اقرار کو مضبوط اور مستحکم فرمائے اور اپنی بے پناہ رحمتوں سے تمہیں نوازے۔تمہیں اس نے اکٹھا کیا ہے اور خدا نہ کرے جو کوئی تم میں تفریق پیدا کرے۔'' قربان گاہ پر چھ موم بتیاں روشن تھیں۔ پادری کے سامنے قول واقرار کرتے ہوئے ماحول میں خوبصورت پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو میرے ذہن کو عجیب سا سکون دے رہی تھی ۔ شادی کا یہ منظر خاصا خوبصورت اور خوش انگیز تھا۔ میں تو لامذہب تھی مگر یہ ساری رسوم میرے شوہر کے مذہب کے مطابق چرچ میں ادا کی گئیں۔ میں کبھی خدا کے نام کی عادی نہیں ہو سکی تھی۔ میں اس کے بجائے قائم بالذات کے لامحدود نظریئے' کائنات کے قوانین اور نظام کی قائل تھی۔ اس لئے میں نے اپنے اسی تخّیل کو سامنے رکھ کر حلف اٹھایا: میں اس سے محبت کروں گی اور زندگی کے ہر دکھ سکھ تکلیف اور راحت میں اس کا ساتھ دوں گی۔ پھر پادری نے ہمیں ایک دوسرے کو شادی کی انگوٹھی پہنانے کی رسم

ادا کی۔ یہ واقعی انتہائی مقدس اقرار تھا۔ محبتوں' دکھوں' تنہائیوں اور ذمہ داریوں کا مقدس معاہدہ' ایک نئے گھرانے کو جنم دینے کا معاہدہ۔ پھر ہم میزبان کی دعوت میں شریک ہوئے۔ یہ جسم وروح کے باہمی ناطے کا دنیا کے سامنے ایک رسمی اعلان تھا۔

شادی میں شریک مہمانوں نے ہمیں مبارک باد اور دعاؤں سے نوازا۔

ہر معاملہ بخیر وخوبی انجام پایا۔ میں نے لوگوں کو کہتے سنا کہ ہم دونوں کی جوڑی آسمانوں میں بنائی گئی تھی۔ شادی کی رسوم ختم ہوتے ہی ہم نے شادی کے جوڑے اتار کر' دوبارہ جینز پہن لی۔ پھولوں کے ہار البتہ اپنے پاس ہی رکھے اور ایک وین میں سوار ہو گئے۔ چاؤ کو اچھی طرح یاد تھا کہ مجھے ٹرک کی سواری بہت پسند ہے مگر انہوں نے وین کا انتظام اس لئے کیا کہ ان کی دلہن کا ہنی مون کا سفر آرام دہ اور خوشگوار ہو۔ ہم نے تیزی سے مشرقی سمندر کی طرف ڈرائیو کرنا شروع کیا۔ ایک جگہ ہم نے زرد لائن عبور کر لی اور سو کلومیٹر کی رفتار سے' ایک خبطی ڈرائیور کے پاس سے گزر گئے۔ پولیس والوں نے ہم سے آگے ایک کار کو روکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمارا جوش اور زیادہ ہو گیا۔ سیول سے نکلتے ہوئے بھی' ہم سرخ بتی کراس کر آئے تھے لیکن خوش قسمتی اس دن ہمارے ساتھ تھی۔ اس لئے کسی بھی جگہ خلاف ورزی کے چکر میں ہمیں روکا نہیں گیا۔ بلا کسی تردد یا پریشانی کے ہوا کے دوش پر اڑتے' بالآخر ہم فیروزی رنگ کے صاف شفاف سمندر کے سامنے موجود تھے۔ سوراک پہاڑی کے دامن میں واقع ایک ہوٹل کے سامنے ہم جا کر رکے تو شام کا ملگجا اندھیرا افق پر چھا رہا تھا۔ میرے کہنے پر' ہم دونوں نے ڈنر کے بعد مہاتما بدھ کی گھاٹی تک کوئی گھنٹہ بھر کی چہل قدمی کی۔ ہاتھوں میں ٹارچ لائیٹس ہونے کے باوجود' میں پھسلواں پہاڑی پر کئی دفعہ گرتے گرتے بچی۔ "ہم صبح کے وقت یہاں آتے تو اتنی مشکل نہ ہوتی۔" چاؤ نے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ایک عظیم الشان اور بلند وبالا چوٹی کے عین نیچے خانقاہ کا خاکہ مجھے کسی پر اسرار عورت کا ہیولہ سا لگا۔ میں ہوا کی مدہم موسیقی اور کوریائی جراب کی شکل میں اوپر کو اٹھتی ہوئی' خانقاہ کی چھت کی سحر انگیزی میں گویا مدہوش ہو کر رہ گئی۔

ایک نوجوان بھکشو نے ہمیں رات خانقاہ ہی میں گزارنے کا مشورہ دیا۔ وہ وہاں اکیلا تھا۔ اسے غالباً یہ اچھا لگا کہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا خانقاہ کی زیارت کو آیا ہے۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری شب بسری کا انتظام پہلے ہی ہو چکا۔ ویسے بھی ہم سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ خانقاہ میں ہمیں یہ پیش کش بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم ہمیں اس کا افسوس ضرور

ہوا۔ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ ''تم ہی تو میرا گھر ہو ڈارلنگ۔''میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔''مسافر تو کہیں بھی رہائش کرسکتا ہے مگر میں ہمیشہ گھر واپس آؤں گی۔'' چاؤ نے اپنے بازو میرے شانوں پر رکھے اور مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ہنی مون ہنسی خوشی چل رہا تھا' کہ چوتھے روز بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ابتدا میں تو ہمیں بارش میں سفر کرنا بھی رومانی لگا۔لیکن بارش اتنی تیز تھی کہ اس نے وین کی کھڑکیوں تک کو بری طرح گیلا کر دیا۔سمندر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا' ہم کسی جگہ رک کر گھوم پھر بھی نہیں سکتے تھے۔چنانچہ وین میں ہی لنچ کرنے کے بعد ہم نے سیم کاک کی سمت ڈرائیو کرنا شروع کیا۔وہاں سے سہ پہر کے قریب ہم سیول کے لئے روانہ ہو گئے۔راستے میں ایک جگہ ہم کچھ دیر آرام کے لئے رکے۔وہاں چاؤ نے' سب سے پہلے' اخبار خریدا۔سیول سے روانگی کے بعد سے' ایک ان کہے معاہدے کے تحت' ہم نے نہ کوئی اخبار دیکھا تھا اور نہ ہی ریڈیو کی نشریات سنی تھیں۔انہوں نے اخبار سامنے رکھا تو ایک تصویر پر نظر پڑی۔کیمپس کی عمارت گویا دھوئیں کے پردے میں چھپی ہوئی تھی۔''پولیس نے طلبہ کے مظاہرے کو آنسو گیس اور پانی کے فائر کے ذریعے ختم کر دیا۔'' یہ خاصی بڑی سرخی تھی۔نیچے لکھا تھا کہ ستر طلبہ زخمی ہیں جبکہ دو کی حالت انتہائی نازک ہے۔ایک اور تصویر میں چند طلبہ کو عمارت کی چھت پر کھڑے نعرے لگاتے بھی دکھایا گیا تھا۔مقامی خبروں کے صفحے پر یہ سرخی نگاہ کے سامنے آئی۔''نعرے' عمارت پر قبضہ' آنسو گیس: کالج کیمپس میں تین دن۔اور اس کے نیچے طلبہ کے مظاہروں کے آنکھوں دیکھے مظاہرے کی تفصیلات تھیں۔اس سے پتہ چلتا تھا کہ معاملات زیادہ ہی خراب ہو گئے ہیں۔چاؤ کا موڈ آف ہو گیا تھا۔بائیں سکول اور دس ہزار سے زیادہ طلبہ۔سیول میں تو جہنم کی سی صورت ہو گئی ہو گی۔وہ بڑبڑائے۔اپنے ہنی مون کی محویت ٹوٹنے کے ساتھ ہی میں نے آہستگی سے سارا اخبار دیکھ ڈالا۔پتہ یہ چلا کہ جس روز ہم سیول سے روانہ ہوئے تھے' تمام ملک کے بائیں بازو کے طلبہ ایک جلوس نکالنے کیلئے بین الاقوامی یونیورسٹی میں اکھٹے ہوئے تھے۔ان کا نعرہ تھا۔غیر ملکی اثر ورسوخ اور آمریت کیخلاف جدوجہد میں طلبہ متحد ہیں۔میں نے مضمون پڑھ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔جوانی کا یہ زمانہ واقعی انتہا پسندی کا زمانہ ہوتا ہے۔میں نے سوچا۔سویا نگ جونگ تو کی بھری پری سڑک پر ایسے بھاگ رہی تھی جیسے پاگل ہو گئی ہو' سرگرم طلبہ چہروں پر ماسک چڑھائے' نعرے لگاتے' صدر ریگن اور وزیراعظم ناکاسونی کے پتلے جلاتے پھر رہے ہیں' پولیس کیمپس کی عمارت کا قبضہ خالی کرا رہی ہے' لڑکے سفید جھنڈے

اٹھائے' ہتھیار پھینک کر' باہر آ رہے ہیں۔خودکشی کرنے کی کوشش نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔گدوں اور ٹائروں کو آ گ لگانے کا واقعہ بھی تفصیل سے درج تھا۔میں نے آ گ کے شعلوں اور انہیں خوفناک لہروں کی طرح ہرطرف پھیلتے' اپنے ذہن کے پردے پر رقصاں دیکھا۔میں نے چاؤ کی سگریٹ کی بو محسوس کی۔ان کے چہرے پر بھی فکر کے اثرات نمایاں تھے۔''طلبہ حد سے زیادہ انقلابی ہوتے جارہے ہیں۔ میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہورہاہوں۔''انہوں نے کہا۔اگر حکومت ذرا نرمی سے کام لیتی تو اتنے لوگ زخمی نہ ہوئے ہوتے۔میں نے ایک ماہر عمرانیات کا سروے پڑھا تھا۔اس کا خیال تھا کہ جب حکومتیں انسانی زندگی کو ارزاں سمجھنے لگتی ہیں تو پورا سماج اسی انداز میں متحرک ہوجاتا ہے۔چاؤ نے بھی انتظامیہ کے اداروں کو مطعون کیا مگر وہ طلبہ کے انقلابی رویوں سے بھی خوش نہیں تھے۔موجودہ افسوسناک صورت حال یقیناً انتظامیہ کی پیدا کردہ تھی لیکن بقول انکے' بزرگ نسل اس کی ذمہ داری ان جوانوں پر بھی ڈالتی ہے جو ابھی سے انتہا پسندانہ نظریات کا شکار ہو کر' انقلابی بننے کی کوشش میں ہیں۔حالانکہ ابھی انہیں بہت کچھ پڑھنا اور سیکھنا ہے۔پھر انہوں نے سیول میں امریکی ثقافتی مرکز پر طلبہ کے گزشتہ سال کے قبضے کا ذکر کیا۔طلبہ نے وہاں تین دن کے لئے بھوک ہڑتال کی تھی۔جب ہڑتالی طلبہ میں سے بعض کا نقاہت کے مارے براحال ہوگیا تو انہوں نے امریکیوں سے ہی کسی میٹھی چیز کی فرمائش کر ڈالی۔کتنا احمقانہ خیال ہے! جنگ سے تباہ حال یتیموں کی طرح' انہیں خود کو چاکلیٹ سے بہلانا پڑا۔چاؤ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔''وہ اپنے انقلابی رویوں کی حمایت میں بے شک کوئی بھی نظریات اپنائیں' انہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ انہیں اس عمر میں ایسی حرکات نہیں کرنی چاہئیں۔'' اگرچہ مجھے چاؤ سے اتفاق تھا' تاہم میں نے موجودہ نظام کو چیلنج کرنے میں' انکی انتھک کوشش اور لگن کی تعریف کی اور کسی حد تک ان کا دفاع بھی کیا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ پرانی نسل صرف الزام تراشی کرتی رہتی ہے۔پرانی نسل کی مصلحت اندیشی اور سمجھوتہ بازی کی وجہ سے نئی نسل ان پر اعتماد نہیں کرتی۔وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے' انہیں ہی کرنا ہے۔ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ہی صحیح سوچ پر ہوں۔لیکن اگر وہ احتجاج نہ کریں تو اور کون کرے۔وہ تو جوان ہیں' گرم خون کے مالک ہیں' اس لئے ان کی سوچ انقلابی ہے اور ہاں' ان میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنی جانیں قربان کر دینے کا جذبہ اور حوصلہ بھی ہے۔تو کیا انہیں اپنے مقصد کے لئے آ گ میں بھی جل مرنا چاہئے؟ کیا انکی زندگی کا

یہی مقصد رہ گیا ہے؟

ہم جیسے متوسط طبقے کے لوگوں کا کیا مقصد ہے؟ کسی محکمے کا سربراہ یا منتظم بن جانا؟ بچے پیدا کرنا اور انہیں اپنا نام دینا؟ میری طرح عیش وآرام کے عادی اور موجودہ نظام کو تسلیم کر لینے والے پرانی نسل کے لوگ اس قابل نہیں کہ طلبہ سے زندگی کے مقاصد پر گفتگو کرسکیں۔''

اپنی آواز کو اونچا ہوتے دیکھ کر' میں خود بھی حیرت زدہ رہ گئی۔ چاؤ نے مزید رائے زنی نہیں کی۔ ابھی ہمارا ہنی مون جاری تھا' عین ممکن ہے وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے جذبات کا پاس رکھتے ہوئے خاموش ہوگئے ہوں۔ میں نے بہر حال انکی خاموشی کا مطلب نیم رضامندی لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے خیالات کا احترام کر رہے ہیں۔ اس احساس نے میرے دل میں چاؤ کی عزت اور دو چند کر دی۔

''ڈارلنگ تم ان خوبیوں کے مالک ہو' جو محبت کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔ ہم گھر پہنچے تو نو بج چکے تھے۔ ہمارے گھر میں گھستے ہی بارش بھی رک گئی۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کہیں بارش صرف ہمارے ہی تعاقب میں تو نہیں تھی۔ بہرحال سارا علاقہ جل تھل نظر آ رہا تھا۔ ماں جی ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ہماری واپسی اصل میں اگلے روز ہونا تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانا گرم کیا اور سوپ بنایا۔ کھانے کی میز پر ماں جی اور ابو ہمارے سفر کے بارے میں سوال جواب کرتے رہے۔ باتوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی' ماں جی نے ہمیں شادی کے تحفے دیکھنے کو کہا۔

تحفوں کا ایک انبار تھا' جو ٹی وی لاؤنج کے ایک گوشے میں سجا دیا گیا تھا۔ میں اپنی غیر موجودگی کے باعث اپنے ان مہمانوں کا اور ان کے تحفوں کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکی تھی۔ تحفے دیکھ دیکھ کر مجھے اپنے پرانے ساتھی اور سہیلیاں یاد آتے رہے۔ کچھ سکول کے زمانے کے تھے اور کچھ بینک میں میرے ساتھ کام کرنے والے۔ کالج کی میری عزیز ترین سہیلی ہائیون سن نے میرے پیانو کیلئے ایک خوبصورت غلاف بن کر تحفتاً دیا تھا۔ غلاف کی سفید لیس اور اس پر رنگین نقاشی کے حسن نے مجھے مبہوت کر ڈالا۔ ایک اور تحفہ' جس نے مجھے حیرت زدہ کیا' سویانگ کی جانب سے تھا؛ مجھے اس کے کسی تحفے کی سرے سے توقع ہی نہیں تھی۔ یہ تحفہ وان گاخ کی پینٹنگز کی کتاب کا تھا۔ کتاب عام کتابوں کے سائز سے چار گنا بڑی تھی؛ جلد کے اندرونی حصے پر میرے لئے انتساب کچھ اس طرح تھا: پرامن زندگی کے لئے نیک خواہشات۔ سویانگ۔ یہ

فقرہ سرخ روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ ''سرخ سیاہی کیوں؟'' ماں جی نے میرے شانوں کے اوپر سے انتساب دیکھتے ہوئے کہا۔اسے پتہ ہے کہ یہ بدقسمتی کا نشان ہے۔'' کتاب میں وان گاگ کی ابتدائی زمانے سے آخری دور تک' منتخب تصاویر' اپنی مخصوص بے لوچ اور شکستہ لائنوں کے ساتھ' پس منظر میں بھنور کے دائروں میں اڑتے بے قرار خزاں رسیدہ پتوں کا کینوس پر عجیب طرح پھیلاؤ' معنویت کے نئے نئے رخ بے نقاب کرر ہا تھا۔ میں بعض ایسی پینٹنگز دیکھ کر خاصی بے چینی کا شکار ہوتی رہی جن میں لکیروں کا اتار چڑھاؤ' مجھے اپنے ہی ماحول اور خود اپنی دیکھی بھالی صورتوں سے خاصا مماثل لگا۔ایک تصویر میں فن کار کے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔رات کے وقت کیفے میں بھی ایسی ہی تصویر تھی' چھت پر لٹکے شکستہ اور بے نور فانوس شکستگی اور اداسی کی ایسی علامت نظر آئے کہ میں بری طرح ڈسٹرب ہوگئی۔سرخ فرش پر پڑے بادامی رنگ کے ایک بیڈ فریم کی تصویر............جس کا عنوان تھا' میری روح کا مسکن...... بے ساختہ سو یا نگ کی سوچوں کو میرے ذہن کی سکرین پر لے آئی۔شاید یہ ونسنٹ کا وہی بیڈ چیمبر تھا' جس کا ذکر سو یا نگ نے اپنی ڈائری میں کیا تھا۔ پھر میری نظر وان گاگ کے اپنے ہی پورٹریٹ پر پڑی' جس میں اس کے کان پر پٹی بندھی تھی اور وہ پائپ پی رہا تھا۔ ''یہ وہی مصور ہے نا جس نے اپنا کان کاٹ لیا تھا؟'' چاؤ نے پوچھا۔ میں نے کتاب بند کردی۔سو یا نگ ان دنوں گھر سے باہر جاتی رہی ہے؟ مجھے یہ خوف محسوس ہوا کہ کہیں وہ حالیہ مظاہروں میں ملوث نہ ہوگئی ہو۔ماں جی چاؤ کی وجہ سے ہچکچانے لگیں۔لیکن میں ہنی مون کے دوران چاؤ کو سو یا نگ کے بارے میں مختصراً بتا چکی تھی' اس لئے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ''کیا وہ آج بھی گئی تھی۔'' میں نے دوبارہ پوچھنے کوشش کی۔ ''کل وہ گئی تھی' غالباً کسی سہیلی کے پاس۔صبح ہی واپس آ گئی تھی۔'' ماں جی نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ''آج وہ مجھے فلم دکھانے لے گئی تھی۔پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا۔'' میں یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئی۔یہ بات میرے وہم وگمان میں آ ہی نہیں سکتی تھی کہ سو یا نگ ماں جی کے ساتھ فلم دیکھنے جائے۔سن فلاور ایک خاصی پرانی فلم تھی۔میں نے یہ فلم دیکھی ہوئی تھی۔ماں جی نے چاؤ کی طرف دیکھتے ہوئے' ایک شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ سو یا نگ پوری فلم کے دوران بلک بلک کر روتی رہی۔ ''وہ رو رہی تھی؟'' میں تقریباً چیخ پڑی۔ مجھے صوفیہ لارین پر فلمایا ہوا وہ منظر یاد آ گیا۔جب وہ روس میں کسی ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک پلازہ کے پاس' اپنے شوہر کی تصویر ہاتھوں میں لئے' ادھر

ادھر پھر رہی تھی۔اس کا شوہر کسی جنگ میں غائب ہوگیا تھا۔شادی کے بعد' وہ جس گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہی تھی۔اس کے ایک کمرے میں' بستر پر لیٹے ہوئے'اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا امڈتا سیلاب اور سر کے نیچے رکھے تکیوں میں اس کا انجذاب' اور اٹلی سے اپنے شوہر کی واپسی کے بعد اس کا اپنے بچے کا دکھانا اور اسے یہ کہنا: سمجھ رہے ہونا............یا نہیں سمجھے اور اسی طرح کے اور کئی مناظر میری نگاہوں میں تیرنے لگے۔میری اپنی آواز بھی بھرا گئی۔فلم کی کہانی بے غرض محبت کرنے والوں اور تقدیر کی سنگدلی کے گرد گھومتی تھی۔یقین نہیں آ رہا تھا کہ سویا نگ اس قسم کی کہانی دیکھتے ہوئے جذباتی ہوگئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ماں جی بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہی تھیں۔کہانی ایسی بھی نہیں تھی کہ رو رو کر برا حال کر لیا جائے مگر اس نے رونے کی حد کر دی۔

چاؤ اور میں اوپری منزل پر چلے گئے۔تاریکی کی وجہ سے ماحول انتہائی ہیبت ناک اور پر سکوت لگ رہا تھا۔دادی اماں کسی مناجات میں شرکت کرنے گئی ہوئی تھیں۔ہائی یا نگ کا کمرہ دو تین بجے تک روشن رہتا تھا' وہ بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔سویا نگ غالباً سو چکی تھی۔اسے شدید نزلہ ہوگیا تھا' اس لئے وہ جلد ہی سونے چلی گئی تھی۔اس کے کمرے پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔سویا نگ اگر جاگ رہی ہوتی تو میں اس کے تحفے کا شکریہ ہی ادا کر دیتی۔یہ سوچتے ہوئے میں باتھ روم چلی گئی۔وہاں میری کچھ کپڑوں پر نظر پڑی۔یہ سویا نگ کے رات کے سونے کا لباس تھا۔ان کپڑوں کی چمکدار سفید رنگت نے' کسی لٹکے ہوئے پرچم کی طرح' مجھے ایک پاکیزگی اور طہارت کا احساس دیا۔کچھ لمحے میری نگاہیں ان کپڑوں پر جمی رہیں۔پھر سویا نگ کے بے خواب ہونے کے خوف سے' میں دبے پاؤں اپنے کمرے کی سمت واپس ہوگئی۔ایک دہشت ناک خواب نے میری نیند ہوا کر کے رکھ دی۔میں ایک ان دیکھے غار میں ماری ماری پھر رہی تھی۔مجھے ابلتے ہوئے پانی کا گڑھا نظر آیا۔جس سے بے اندازہ بھاپ اٹھ رہی تھی۔اس کے ارد گرد عجیب وغریب لوگ بیٹھے' اپنے زخموں کو پیار سے سہلا رہے تھے۔میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزری جس کی چندیا پر بال ہی نہیں تھے۔مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔میں اس کے قریب گئی تو اس نے کانٹوں بھری ایک ٹہنی میرے چہرے پر دے ماری۔میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھی اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔میرا خیال تھا۔میرا چہرہ خون سے تر ہوگا لیکن مجھے کوئی چپچپاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔بہر حال نیند تو اڑ چکی تھی مگر وہ خوفناک منظر

ابھی تک میرے ذہن پر سوار تھا۔ میں کچھ دیر تک اپنے شوہر کے چہرے کے دھندلے خاکے کو تکتی رہی۔ان کے قریب پہنچ کر ان کے رخسار کو چھوا۔ میں ذرا پرسکون ہوئی تو اٹھی اور کھڑکی کے پاس چلی گئی اور اس کا پردہ ہٹا دیا۔آسمان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔کہیں کہیں ٹمٹماتے تارے ضرور تھے اور ہاں نیچے' دور کہیں کسی گاڑی کے چلنے کی مدہم آواز بھی تھی۔ میں باتھ روم کی طرف گئی تو مجھے ایک عجیب سی بو محسوس ہوئی۔شاید کسی پودے کی خوشبو تھی یا کیا لیکن مجھے چکرا دینے کے لئے بہت زیادہ تھی۔ میں نے ہال کی کھڑکی کی جانب دیکھا۔شاید باہر سے کسی پودے کی خوشبو ہوا کے ساتھ اندر آ رہی ہو مگر کھڑکی بند تھی۔ باتھ روم سے نکلتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ خون کی بو تھی جو میرے دماغ کو چکرا رہی تھی۔ میرے چہرے پر تناؤ پیدا ہو گیا اور میری آنکھیں ماحول کا بغور جائزہ لینے لگیں۔ میں قدم بقدم سویانگ کے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ''سویانگ! سویانگ!''

میں نے اس کے کمرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا مگر جواب ندارد۔ مزید کچھ آوازیں دینے کے بعد میں بھاگی ہوئی اپنے کمرے میں گئی' اپنا ہینڈ بیگ ہال میں اٹھالائی اور ہال کی روشنی میں سویانگ کے کمرے کی چابی بیگ میں سے نکالی۔اور پھر کانپتے ہاتھوں سے اس کے دروازے کا لاک کھولا۔ کمرے کی لائٹ کھولنے کے لئے میں دیوار کے ساتھ ساتھ سوئچ بورڈ تک جا رہی تھی تو مجھے خون کی مخصوص خوشبو ہر طرف پھیلی محسوس ہوئی۔ روشنی پھیلتے ہی پورے کمرے کا منظر سامنے آ گیا۔ میرے پاؤں بری طرح لڑکھڑا گئے۔ پورا فرش سرخ ہو رہا تھا۔سویانگ کے لباس پر جا بجا خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ادھ کھلے ہونٹ' پھیلی ہوئی آنکھیں' بھنچی ہوئی انگلیاں۔ مجھے لگا جیسے کوئی انقلابی دنیا کے خون آلود نقشے پر پرسکون نیند لے رہا ہے۔ میں اس عالم میں پیچھے ہٹی کہ میرے ہاتھ میرے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ میری چیخیں میرے حلق میں ہی گھٹی ہوئی تھیں۔ میں کسی چیز سے ٹکرا کر لڑکھڑائی۔ یہ سویانگ کی خون میں لتھڑی ڈائری تھی' میں نے اسے اٹھایا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی۔ ''اسے بچالو۔'' میں بری طرح چلائی اور اپنے شوہر کے سینے میں اپنا منہ چھپا کر' بری طرح بلکنے لگی۔

یہ کوئی خواب نہیں ہے۔ میں بے بال و پر' اس بانجھ زمین کا محض ایک جسم ہوں۔ میں کوئی پرندہ ہوں' نہ کوئی تتلی۔ بلکہ ایک رینگتا سانپ ہوں جو اس ناپاک دنیا کے خلاف اسکی گندگی اور

خباثتوں کے خلاف' اپنے غصے اور نفرت کے اظہار میں پھنکارتا رہتا ہے۔ پر محض واہمہ ہیں۔تصور ٹوٹ جاتا ہے اور میں اس تصور کے بغیر محض غم واندوہ میں لپٹا ایک بدصورت جسم رہ جاتی ہوں۔لڑتے بھڑتے' جھگڑالو کاروباری لوگوں کی دنیا' میرے لئے اجنبی ہے جیسے کوئی پر سوز منظر کسی بوتل میں بند ہو۔ یہ جگمگاتے نعرے کسی اور کے لئے ہیں۔ میں ایک جزیرہ ہوں۔ ایک ایسا جزیرہ' جس میں' میں خود ہی قید ہوں۔اس کے کنارے کسی اور جگہ نہیں مل پاتے۔

میرے آنسو صفحے پر گرے اور خون کے چھینٹوں سے بھرے کاغذ کو مزید بھگو گئے۔میرے پیچھے ماں جی کے رونے اور سسکیاں لینے کی آواز آرہی تھی۔ہائی یانگ' ساکت کھڑی' اپنی بہن کے بےحس وحرکت جسم کو تکے جارہی تھی۔پھر اس نے اپنی بہن کا بایاں بازو پکڑا' جس میں کوئی ربڑ بینڈ ابھی تک الجھا ہوا تھا' اور نہ جانے کیوں' وہ بری طرح بلک بلک کر رونے لگی۔"ہم نے ان بچوں کو پالنے پوسنے میں اپنی پوری زندگی گزار دی' اپنی بساط بھر سب کچھ ان کے لئے کیا اور اب یہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔" ابو اسپتال جاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔سویانگ کا سن کر' ان کا پہلا ردعمل شدید چیخ کی صورت میں تھا۔وہ بے یقینی کے عالم میں' سویانگ کے جسم کو تکے جارہے تھے اور آنسو انکی آنکھوں سے رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ابھی کل ہی چاؤ کے جوش وخروش اور جذبے کا یہ عالم تھا کہ وہ وین کو تیز بارش میں بہائے لئے جارہے تھے مگر اس وقت انتہائی بوجھل سکوت ان پر طاری تھا۔میں چاؤ اور ابو کے درمیان بیٹھی تھی اور میرا دل غم کے مارے پھٹا جارہا تھا۔کسی بے وقوف لڑکی کی طرح' تم خود کو دنیا کے پار ڈھونڈنے کی کوشش کررہی ہو۔اگر تم ذراسی مصلحت اندیشی سے کام لے لیتیں تو بلاوجہ کے دکھوں اور غموں کا تمہیں سامنا نہ کرنا پڑتا۔اپنے ہی خون سے زمین کو رنگین نہ کرنا پڑتا۔تمہیں پتہ چلتا کہ بہار کا یہ دورانیہ جوانی کوئی زنجیر نہیں بلکہ یہی تو دراصل بال و پر ہیں۔ سویانگ بے چاری آخری لمحے تک جنت کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔نہ ہی خوبصورت پودوں اور درختوں کے درمیان اس کا آشیانہ بن سکا۔۔ یہاں اسے ملا بھی تو بس کنفیوژن اور حیرت!

ہمیں پتہ بھی نہیں چلا اور صبح کی ملگجی روشنی افق سے نمودار ہو کر چار سو بکھرنے لگی۔بارش کے بعد چلنے والی' صبح کی سرد ہوا کے جھونکے میرے سینے میں پیوست ہوتے محسوس ہورہے تھے۔واپسی پر ایک پہاڑی سے اترتے ہوئے دور کہیں' درختوں کے جھنڈ کے اوپر ایک ستارہ سا جگمگاتا نظر آیا۔دن کی بیتی روشنی میں مجھے وہ کسی شیطانی روح کا ہیولہ سا لگا۔میری نگاہیں باہری خلا میں آوارہ گردی کرتی' اس کے منبع تک پہنچ ہی گئیں۔وہ ایک چرچ کا نیون سائن تھا۔

ایک یقینی ابتداء

کم چی ون

یون جا نیلگوں سمندری لہروں کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ سورج کی گرم شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ شروع میں تو وہ ٹھٹھر کر رہ گئی تھی لیکن اب پانی کی خنکی قابل برداشت لگ رہی تھی۔ پرسکون موجیں اس کے کانوں کو چھو رہی تھیں اور خنک ہوا اس کی گیلی ناک سے ٹکرا رہی تھی۔ کشتیاں اس کے قریب سے گزرتیں اور کہیں دور جا کر متلاطم پانیوں میں غائب ہو جاتیں۔ بحری جہازوں کے سائرن' بچوں کے قہقہے' انگریزی' ہسپانوی اور دوسری زبانوں کے نامانوس الفاظ سماعت کے پردے پر' خوابناک آوازوں کی طرح ہلچل مچا رہے تھے۔ ردعمل کے طور پر وہ صرف ان کی ایک جھلک دیکھتی اور بس۔ سورج کی تپش نے اسے مسحور کر رکھا تھا۔

یون جا نے خود کو پانی میں سیدھا کیا اور چنگ ال کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ ساحل سمندر پر ایک چھتری کے نیچے اپنا سر عقبی جانب کئے غالباً کچھ پی رہا تھا۔ وہ خاصی دور سمندر میں تھی اور ستائیس سالہ چنگ ال وہاں سے اسے کسی بوائے سکاؤٹ کی طرح چھوٹا سا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یون جا کو وہ گھریلو ملازم لڑکا یاد آ گیا جس کی تصویر اس نے کوریا کی جنگ کے دوران موجود چند امریکی فوجیوں کے ساتھ دیکھی تھی۔

''آج کے بعد ہی تو زندگی کی شروعات ہونا ہے۔'' یون جا نے سوچا۔ اس نے خواتین

کے کسی رسالے میں پڑھا تھا کہ کسی طلاق شدہ تنہا عورت کیلئے چاہے اس کی طلاق کا معاملہ کتنا ہی متوقع کیوں نہ رہا ہو' ناکامی کا احساس قطعی فطری ہے کیونکہ خوش باش شادی شدہ زندگی کو ہی ہر سماج میں کامیابی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مطلقہ کو اپنی طرز زندگی میں کئی تبدیلیاں لانی چاہئیں۔ رسالے کے مضمون کے مطابق روزمرہ کے معمولات سے خود کو باہر نکالنا بہت ضروری تھا مثلاً رات کو جتنی دیر سے چاہے سویا جائے' کھانے میں جس چیز کی خواہش ہو' وہ بلا تردد کھالی جائے' ہفتے کے عام دنوں میں پارٹی کا ہنگامہ کر دیا جائے' نئی سے نئی سرگرمیوں میں خود کو مصروف رکھا جائے۔ ''میرا معاملہ تھوڑا سا مختلف ہے لیکن جیسا کہ مضمون نگار کا کہنا ہے۔ مجھے دوبارہ سے شروعات کرنی چاہئے۔ لیکن کیسے؟ میری زندگی کس طرح مختلف ہونے جا رہی ہے؟'' یون جا کے ذہن میں نئی زندگی کے آغاز کا ہلکا سا خاکہ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ دن بھر پڑی سوتی رہے اور تمام رات سیر و تفریح کرتی پھرے لیکن اپنے باطن میں کوئی تبدیلی نہ لائے تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ ایک حقیقی تبدیلی کے بغیر' آنے والے شب و روز نہ صرف انتہائی اکتا دینے والے ہوں گے بلکہ باہم غلط ملط ہو کر رہ جائیں گے۔'' اس نے سوچا۔ ''دن خدا خدا کر کے ختم ہو گا تو رات آئے گی' وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح نیند کی آغوش میں ڈالنا چاہے گی مگر اس سے پہلے ہی دن کا عذاب دوبارہ نازل ہو جائے گا۔ اکیلے کھانا کتنا بے ذائقہ اور بے مزہ لگے گا۔ چیونگم چباتے ہوئے' صرف اپنی ہی آواز سنائی دے گی۔ ایسے خیالات پہلے تو کبھی اس کے ذہن میں نہیں آئے تھے۔'' وہ کل کے بعد' پھر کبھی میرے پاس نہیں آئے گا۔'' اس نے سوچا' آنے والے شب و روز لایعنی محسوس ہو رہے تھے۔

چند دن پہلے چنگ ال سویابین کی کچھ کونپلیں اور ٹوفو خرید لایا تھا اور اب سویابین سوپ بنانے میں لگا ہوا تھا۔ یون جا' پرانے صوفے پر براجمان' کچھ بننے میں لگی ہوئی تھی۔

''مسز لی! اپنی شادی کی خوشی کے سلسلے میں ساحل سمندر کی سیر کیسی رہے گی؟ ایک طرح کا ہنی مون' سمجھتی ہو نا؟''

یون جا قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ان دونوں کیلئے شادی جیسا مزاحیہ لفظ کوئی اور تھا ہی نہیں۔ چنگ ال بھی زور سے ہنس پڑا۔ کتنی معصومیت تھی اس مذاق میں!

چانگ ال کے نزدیک ''شادی'' مستقل سکونت کا پروانہ تھا' جو اسے ملنے جا رہا تھا' وہ اور یون جا رسمی طور پر پہلے ہی شادی کر چکے تھے۔ اس دن تو دراصل اسے گرین کارڈ ملنا تھا۔ ایک

عرصے سے وہ اس کارڈ کا منتظر تھا' اسی لئے وہ اس دن کو''شادی کا دن'' قرار دے رہا تھا۔

چنگ ال نے یون جا سے' پندرہ سو ڈالر ادا کر کے شادی کی تھی تا کہ وہ امریکہ کی مستقل سکونت حاصل کر سکے۔ شادی سے پہلے تک امریکی امیگریشن کے حکام اسے مناسب ویزے کے بغیر ہی کام کرنے کی تلقین کرتے رہے تھے۔

''امریکی افراط زر جیسی چیزوں کی بہت باتیں کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ سپر پاور ہیں۔ کیا ان کے پاس غیر ملکی طلبہ کا کھوج لگانے کے علاوہ' کوئی دوسرا بہتر کام نہیں؟'' چنگ ال نے یون جا سے اپنی پہلی ملاقات میں کہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بری طرح لبریز تھیں۔

اور اب تقریباً دو ماہ بعد' چنگ ال کو اپنا گرین کارڈ مل چکا تھا اور یون جا بھی اپنے پندرہ سو ڈالر لے چکی تھی' یہ رشتہ ختم ہونے جا رہا تھا۔ چنگ ال ساحل سے پانی کی لہروں کی جانب تیزی سے بھاگا۔ اس کی ہموار کانسی جلد دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے یون جا کو آواز دی لیکن وہ چنگ ال کی بات سمجھ نہیں سکی۔ شاید وہ اسے دوڑ لگانے کا چیلنج کر رہا تھا یا ممکن ہے وہ پانی کی خنکی کے بارے میں بتانا چاہ رہا ہو۔

کی ینگ کی ماں چائنا ٹاؤن کی ایک فیکٹری میں اس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ اس نے جب یون جا کو چنگ ال کے ساتھ''کاغذی شادی'' کی تجویز پیش کی تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ یہاں سٹوڈنٹ ویزے پر آیا تھا۔ اس نے وضاحت سے بتایا''میرے شوہر کے کہنے کے مطابق' اس کا بڑا بھائی سیول میں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزار رہا ہے —— لڑکے کو ملک سے چلے جانے کا کہہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا سامان بندھا پڑا ہے اور وہ کسی اور ملک جانے ہی والا ہے —— وہ سات ماہ پہلے امریکہ آیا تھا —— اس کی قسمت —— دوسرے سینکڑوں کوریائی لڑکے بھی بغیر ویزے کے یہاں کام کر رہے ہیں اور وہ پکڑے نہیں جاتے ——''

''ٹھیک ہے۔'' یون جا نے سوچا اگر میں اس سڑے بھسے' تاریک اور کھٹملوں سے بھرے اپارٹمنٹ سے جان چھڑا سکوں اور اپنی ہم نشین چینی عورت کی چوں چاں بھی کانوں میں آنا بند ہو جائے تو اس سے بہتر اور کیا بات ہو گی۔ پھر مسلسل کپڑوں کی مشینی سلائی کیلئے سیدھے انداز بیٹھا رہنا' پاؤں ہلاتے رہنا' خاصا تکلیف دہ عمل تھا۔ کمر تختہ ہو گئی تھی اور پیر اکثر سوجے رہتے تھے' اوپر سے چینی عورتوں کی نامانوس زباں' ان کی اجنبی اور نا سمجھ آنے والی باتیں۔ یون جا کیلئے امریکہ میں زندگی خاصی سخت اور نا قابل برداشت تھی۔ تھکاوٹ کے شدید احساس کے

تحت اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ عرصہ مکمل چھٹیاں منائے گی۔ کاغذی شادی سے حاصل ہونے والی رقم سے، وہ ایک روشن اور ہوا دار کمرہ حاصل کر سکتی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر، نیچے سڑک کا نظارہ بھی کر سکتی تھی۔

سؤیون جا کی خواہش پوری ہوگئی۔ مغربی کنارے پر اسے ایک سٹوڈیو اپارٹمنٹ مل گیا تھا۔ سب وے سے یہاں تک پیدل کا راستہ بمشکل بیس منٹ کا تھا اور پھر کی ینگ کی ماں نے اسے چنگ ال کی شکل میں ایک ''گاہک'' بھی دے دیا تھا۔

ملازمت چھوڑ دینے کے بعد، یون جا صبح کو اپنے بستر میں لیٹی باہر سے آتے ٹریفک کے شور سے حظ اٹھاتی رہتی۔ شام کو چنگ ال، اپنے عارضی کام سے واپس آتا تو یون جا اس کا ایک اچھی گھریلو ملازمہ کی طرح استقبال کرتی۔ وہ دن کے وقت کھانا تیار کر لیا کرتی تھی۔ سو دونوں بیٹھ کر کھانا کھاتے، یون جا کا دن دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک تو چنگ ال کے آنے سے پہلے کا اور دوسرا اس کے آنے کے بعد کا۔ کھانے کے بعد، بسا اوقات وہ کھانے پکانے کی اشیاء اور دوسرا گھریلو سامان لے آتا۔ کبھی کبھی وہ تفریحاً کھانا پکانے میں بھی لگ جاتا تاہم اس سے یون جا کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ چنگ ال تیرتا ہوا قریب آیا۔

''کیا ہمیشہ پانی میں رہنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے مذاقاً کہا۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے —— ''پینے پلانے کو کچھ بچا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ کوک ہے اور کچھ پانی ابھی لیا ہے۔''

چنگ ال نے اس تفریح کیلئے بہت سی چیزیں خرید لی تھیں۔ کورین انداز کا بھنا ہوا گوشت، کئی مخصوص کورین غذائی اشیاء، یہاں تک کہ ٹشو پیپر تک لیا تھا اس نے۔

''مسز لی! اس جگہ جھینگے بڑے شاندار ملتے ہیں۔ خوب موٹے موٹے اور تازہ تو ہوں گے ہی، دو چار میں ہی پیٹ بھر جائے گا۔ اس طرح کرتے ہیں کہ کچھ جھینگے پکڑے جائیں اور انہیں گھر لے جا کر پکایا جائے۔ جھینگے کا پلاؤ کیسا رہے گا؟ دو تھکے ماندے لوگوں کیلئے ہلکا پھلکا اور لذیذ کھانا۔ کیا خیال ہے؟''

جواب دینے کے بجائے یون جا، اس کے تربوز جیسے سر کو ہلتے دیکھے جا رہی تھی۔'' اس کا خیال ہے کہ ہم گھر جا کر، اپنا اپنا راستہ لیں —— شاید آج کا دن ختم ہونے تک، رات ساڑھے گیارہ بجے، ممکن ہے اس کا جانے کا پروگرام ہو۔ بہرحال اسے اپنا سامان لینے ایک بار گھر تو آنا

تھا۔'' لنچ کرتے ہوئے' اس نے مناسب الوداعی فقرے بھی سوچ لئے۔ ''میرا خیال ہے اب تم اپنی پڑھائی شروع کردو گے یا تم کسی ہوسٹل میں جانے کی سوچ رہے ہو؟''

یون جا کی ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ وہ چنگ ال کو گزرے دنوں کے بارے میں یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ محض ایک کھیل تھا۔ بعض اوقات اس کا جی چاہا کہ چنگ ال کے باتھ روم سے نہا کر نکلنے پر اسے تولیہ اٹھا کر دے دے لیکن پھر وہ اسے نظرانداز کر دیتی۔ وہ گزشتہ دو ماہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد' چنگ ال اسی میز پر بیٹھا کوئی کتاب یا اخبار پڑھتا رہتا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ اٹھتا اور تھوڑی ہی دور' اپنے ایک دوست کے اپارٹمنٹ میں رات گزارنے چلا جاتا۔ چنگ ال کو اس کے وکیلوں نے بتایا تھا کہ جو شخص' ملک سے اخراج کے احکامات کے بعد شادی کر لے اور مستقل سکونت کیلئے درخواست دے' امیگریشن یا شہریت دینے والے محکمے اس کے متعلق کسی بھی وقت تحقیق کر سکتے ہیں۔ چنانچہ چنگ ال اور یون جا نے حتی الامکان شادی شدہ جوڑا نظر آنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ ان دونوں کو زیادہ تر اکٹھے دیکھا جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک اس کے اپارٹمنٹ میں رہتا۔ اس کے بہت سے کپڑے' پرانے جوتے اور دوسرا ضروری سامان یہاں پر موجود تھا۔

ٹک ٹک ٹک —— یون جان بنائی کڑھائی میں مصروف ہوتی یا کوئی ریکارڈ سننے میں لگی ہوتی جبکہ چنگ ال کتاب پڑھنے یا خطوط لکھنے میں وقت کاٹ رہا ہوتا۔ دونوں چپکے چپکے' اپنی گھڑیوں پر وقت دیکھتے رہتے۔ ٹک ٹک ٹک...... ساڑھے گیارہ بجے چنگ ال اپنی گھڑی پہنتا اور جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا۔ چابیوں کے گچھے کی آواز پیدا کرتے ہوئے وہ آہستگی سے ''شب بخیر'' یا ''اچھا' میں چلا'' کے الفاظ کہتا۔ یون جا اپنی جگہ پر بدستور اپنے کام میں مصروف رہتی اور اس کا دبلا پتلا' معصوم سا چہرہ دروازے کے پیچھے غائب ہو جاتا۔

ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا' شادی کے بعد ابتدائی دنوں میں وہ کوریا کے حالات پر یا امریکہ کی زندگی کے متعلق —— امریکی امیگریشن پالیسی' بڑھتی ہوئی قیمتوں' بیروزگاری اور ایسے ہی دوسرے معاملات پر —— کھل کر گفتگو کرتے تھے۔ چنگ ال گھر سے نکلتا تو یون جا اسے دروازے پر خدا حافظ کہتی۔ خاموش شاموں کو رات میں ڈھلتے دیکھ کر اس نے اکٹھے رہنے کی تجویز بھی دی تھی۔ اس رات چنگ ال واپسی پر بیئر لیتا آیا اور انہوں نے مل کر بچوں کے گیتوں سے لے کر مقبول عام دھنوں تک —— جو بھی گانے انہیں یاد تھے —— گا ڈالے اور اتنا شور

مچایا کہ پڑوسیوں نے ان سے احتجاج تک کر ڈالا۔ کچھ دیر' انہوں نے خود کو قابو میں رکھا اور پھر بے قابو ہو گئے۔ چنگ ال یون جا کو اتنی بری طرح ہنسا رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ کسی مسخرے کی طرح نقلیں اتار رہا تھا اور الٹے سیدھے گانے گا رہا تھا۔ اسی وقت یون جا نے اس سے پوچھا کہ وہ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے وہاں سے کیوں چلا جاتا ہے اور غالباً جس دوست کے گھر وہ سوتا ہے' وہ بھی اسے پسند نہیں کرتا ہو گا اور کیا یہ مناسب نہیں کہ وہ رات بھی اس کے گھر میں ہی گزار لیا کرے۔ بڑی بہن اور چھوٹا بھائی بھی تو ایک ساتھ رہ سکتے ہیں —— کیا برائی ہوئی اس تصور میں! چنگ ال کا چہرہ ایک دم کرخت ہو گیا اور اس لمحے اسے اپنی بے ہودگی کا احساس ہوا۔ وہ دن گیا' پھر چنگ ال گھر بیئر کی بوتل نہیں لایا۔ لمبی لمبی باتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ساتھ ہی گانوں اور ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی۔

چنگ ال کے میکانکی طور طریقوں پر یون جا خاصا تلملانے لگی تھی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ میں تمہیں کاٹ کھاؤں گی' ننھے نامعقول آدمی!'' دروازے میں گھومتی چابیوں کی آواز سن کر وہ سوچتی۔ ''یہ تو بلا وجہ کی کھینچا تانی ہوئی۔ تم سوچتے ہو کہ میں تمہاری کسی بات کا برا نہ مان جاؤں' اسی لئے تم چور نظروں سے میری کیفیات کا جائزہ لیتے رہتے ہو۔ تمہیں خوف ہے کہ کہیں میں یہ شادی ختم نہ کر ڈالوں۔ یہ بات ہے نا! اگر میں کہہ دوں کہ میں مزید اس شخص کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی' تو تم کیا کرو گے؟ کہاں تلاش کرتے پھرو گے ایک اور گرین کارڈ والی غیر شادی شدہ عورت؟ کیا تم کسی دوسرے ملک میں جانا چاہو گے؟ کتنی مشکل ہو گی؟''

اپنی تجویز دینے کے اگلے دن' یون جا چنگ ال کے گھر آنے کے وقت سے ذرا پہلے' گھر سے نکل گئی۔ وہ اسے یہ سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کی واپسی کا انتظار کرتی ہے۔ وہ ایک قریبی گراؤنڈ میں چلی گئی' وہاں بہت سے ایشیائی بچے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن تھے۔ اسے یہ تشویش بھی تھی کہ کہیں چنگ ال کی واپسی کے وقت اس کا گھر پر نہ ہونا' کوئی مزید پریشانی کھڑی نہ کر دے۔ وہ گھر واپسی کا سوچ رہی تھی تا کہ چنگ ال کو بتا سکے کہ گزشتہ روز کی' اس کی تجویز محض ایک وقتی سوچ کا نتیجہ تھی اور اس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ یون جا اس کے ساتھ کسی جذباتی تعلق کی ہرگز خواہاں نہیں تھی۔ یون جا چالیس برس کی ہو رہی تھی۔ ان دونوں کی عمر میں تیرہ سال کا فرق تھا۔ تاہم عمر کے تفاوت سے زیادہ مسئلہ یہ تھا کہ یون جا کے ذہن میں شادی وغیرہ کا کوئی تصور باقی ہی نہیں رہا تھا۔

گریجوایشن کے بعد، یون جا نے جس شخص سے شادی کی تھی، اس کا کاروبار بہت ترقی کر گیا تھا اور سات سال کے عرصے میں وہ بے پناہ دولت کما چکا تھا۔ (سیول کے پوش علاقے میں ان کا گھر تھا، بڑی سی گاڑی تھی) پھر اچانک اس نے یون جا سے طلاق کی بات کر ڈالی۔

''تم یہ گھر لے لو اور طلاق پر متفق ہو جاؤ۔'' اس نے ایک دن کہا۔ یون جا کو زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ ''لیکن کیوں؟ کیا کوئی اور عورت پسند آ گئی ہے؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے شادی کے بندھن میں پھنسا نہیں رہنا چاہئے۔''

شدید ڈپریشن کے عالم میں یون جا نے وقتی علیحدگی کی تجویز دی لیکن اس کا شوہر طلاق پر مصر رہا اور ایک دن اس نے یون جا کو چھوڑ دیا۔ وہ گھر سے گیا تو اس کے پاس صرف کچھ کپڑے اور ذاتی سامان تھا۔ یون جا کئی دن تک بری طرح روتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ کوئی عورت درمیان میں آ گئی ہے۔ کئی بار اس نے خفیہ طور پر اپنے شوہر کے دفتر کی نگرانی بھی کی، تاکہ حقیقت کا پتہ چل سکے۔ ''کیا واقعی اس معاملے میں کوئی اور عورت ملوث نہیں تھی؟'' اس نے گراؤنڈ میں بیٹھے ہوئے خود سے سوال کیا۔ ''کیا اسے طلاق اس لئے چاہئے تھی کہ وہ میرے ساتھ رہتے رہتے بیزار ہو گیا تھا؟'' اس کی واحد بیٹی پیدا ہوتے ہی انکیوبیٹر میں ڈال دی گئی مگر وہ بیمار بچی جانبر نہ ہو سکی۔ ماں بننے اور پھر بچی کے چھن جانے کے تصور نے، یون جا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ''کاش وہ بھی بیمار ہو گیا ہو اور ہر چیز سے بیزاری اس کا مقدر ہو! یا ممکن ہے وہ صرف مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہو اور کہیں اور جانے کا خواہش مند ہو ـــــ جب کبھی وہ راتوں کو دیر تک باہر رہتا تھا، میں بھی اسی طرح سوچا کرتی تھی۔'' انہی دنوں، اس نے اپنے شوہر کی دوبارہ شادی کے بارے میں سنا تھا۔

''تم کوریائی ہو؟''

یون جا نے نظر اٹھائی تو اسے ایک پژمردہ بوڑھی کوریائی عورت دکھائی دی، تاہم اس کے بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک ہم وطن عورت کو دیکھ کر اسے دلی خوشی ہوئی مگر وہ حیرت زدہ یوں تھی کہ وہ بوڑھی عورت یہاں بھی کوریائی لباس پہنے ہوئے تھی اور وہ بھی ایسا ویسا نہیں بلکہ خاصا قیمتی روایتی لباس۔ یون جا کے جواب دینے سے پہلے ہی، عورت اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنے پرس میں سے قرمزی رنگ کا سگریٹ کا پیکٹ ڈھونڈ نکالا۔

''سگریٹ پینا پسند کرو گی مس؟''

''نہیں، شکریہ''

بوڑھی عورت نے سگریٹ سلگائی اور باتیں کرنے لگی۔ خاصی غصیلی فطرت کی لگتی تھی۔

''یہ شہر بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ بدقسمتی لے آئی مجھے یہاں۔ یہ تو جانوروں کا باڑہ لگتا ہے۔ کوریا میں میرا شاندار گھر تھا' خوبصورت' سجا سجایا۔ اس کا فرش چمکتا رہتا تھا مگر یہاں کوئی اپنے جوتے اتارنے کی زحمت ہی نہیں کرتا۔ فرش مٹی اور گندگی سے اٹے رہتے ہیں۔''

''آپ کوریا واپس نہیں جا سکتیں کیا؟''

''کیوں مذاق کرتی ہو؟ میرے نکھے لڑکے جان چھوڑیں گے؟ سارا دن ان کے بچوں کو کھلاتی رہتی ہوں' ان کی دیکھ بھال کرتی ہوں' جہاز نظر آتا ہے تو رونے لگتی ہوں۔۔۔۔ تمہیں بتا رہی ہوں' یہ سوچ کر رونا آتا ہے کہ اسی طرح کی خبیث چیز پر سوار ہو کر' یہاں پہنچی تھی۔''

اس کی آنکھیں بری طرح سوجی ہوئی تھیں۔ لگتا ہے رونا پیٹنا' اس کا روز کا معمول ہوگا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ یون جا کی نگاہیں بھی آسمان پر اٹھیں اور اڑتے ہوئے جہاز پر جم گئیں۔ یہ جہاز کسی قریبی ایئرپورٹ سے اڑا تھا اور انہیں اپنے سر پر تیرتا نظر آ رہا تھا۔ اس کی قرمزی اور زمرد جیسی سبز روشنیاں مسلسل جل بجھ رہی تھیں۔

''میں اس بزرگ عورت کی طرح اپنے شوہر کو کیوں یاد نہیں کرتی؟ جہاز اڑتے دیکھ کر' مجھے رونا بھی نہیں آتا۔'' یون جا نے سوچا۔ اس کا وطن اس کیلئے شرمندگی کا باعث تھا۔ اسے اس سے دور بھاگنا تھا اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔

سات بجے کے قریب یون جا واپس اپنے اپارٹمنٹ لوٹی۔ چنگ ال نے دروازہ کھولا۔

''کہیں گئی ہوئی تھیں؟'' اس نے انتہائی ملائمت سے سوال کیا جیسے کوئی بچہ اپنی ٹیچر سے پوچھ رہا ہو۔ یون جا کی ہیجانی کیفیت میں ٹھہراؤ آ گیا۔ اسے پہلے بولنا نہیں پڑا تھا۔

''میں ایک بوڑھی کوریائی عورت سے باتوں میں لگ گئی تھی۔''

''وہی' جو عموماً کوریا کے روایتی لباس میں پھرتی رہتی ہے۔ وہ بتا رہی ہوگی کہ امریکہ میں رہنا کتنا مشکل اور بے ہودہ کام ہے۔''

''تم جانتے ہو اسے؟''

''ارے! وہ بڑی ظالم عورت ہے' اسے کوئی کوریائی ملنا چاہئے' بس پیچھے پڑ جاتی ہے۔''

اس طرح ان ہلکی پھلکی باتوں نے شام کی مدعودہ خاموشی اور ذہنی تناؤ کی کیفیت کو کافی حد

تک کم کر دیا۔ چنگ ال نے ''شادی'' کے حوالے سے مذاق مذاق میں یون جا کو ساحل سمندر پر جانے کی دعوت دے ڈالی۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ اس کے امیگریشن کا کیس مکمل ہو گیا تھا۔ اب اسے اپنے وکیل کے پاس جا کر ضروری کاغذات پر دستخط کرنے تھے اور پھر اسے مستقل سکونت کا اجازت نامہ مل جاتا۔

چھ بج چکے تھے پھر بھی دن کی روشنی اور تمازت میں دوپہر کا سا رنگ تھا۔ یہ اگست کی انتہائی حبس زدہ شام تھی۔ کھڑکی کے قریب لگا ہوا پنکھا' اوپری چھت کی تمام گرمی کھینچ کر کمرے میں پھیلا رہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ چنگ ال محض مذاق کر رہا تھا' یون جا نے اپنی بنائی کا کام روک دیا۔ وہ اٹھی اور ایک پرانا ریکارڈ آن کر دیا۔ پرانے سٹیریو میں سے کسی گلوکار کی غمزدہ مگر کھڑکھڑاتی آواز بلند ہونے لگی۔

آن پہنچیں جدائی کی گھڑیاں ایک بار اور تھام لو مرا ہاتھ!

یون جا نے فوراً ہاتھ بڑھا کر سٹیریو بند کر دیا۔ ''اس طرح کے گانے طبیعت کو اور بھی بوجھل کر دیتے ہیں۔'' کچھ دن بعد چنگ ال نے اپنے کسی دوست سے کار ادھار مانگی اور گرین کارڈ ملنے کی خوشی میں' حسب وعدہ اسے ساحل سمندر لے گیا۔ یون جا نے اسے احسان مندی کے اظہار کا طریقہ جانا ''جیسے بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں آپ ڈاکٹر کو پھولوں یا وائن کا تحفہ دیتے ہیں یا جیسے گریجوایشن کے بعد' اپنے ٹیچر کو کوئی یادگار چیز' اس کے احترام کی علامت کے طور پر دیتے ہیں۔''

وہ ساحل پر کافی دیر تک رہے تا کہ واپسی میں انہیں جمعے کی شام کے رش کی وجہ سے پریشان نہ ہونا پڑے۔ شام ڈھلنے لگی تو ہوا میں خنکی مزید بڑھ گئی۔ وہ دونوں پانی سے باہر آ گئے اور سرد ریت پر بیٹھ گئے۔ خدا جانے' یہ باہر کے ماحول کا اثر تھا یا ساتھ گزارے جانے والے آخری لمحات کا' یون جا کو ایسا محسوس ہوا کہ کشیدگی کی فضا ختم ہو گئی ہے لیکن جدا ہوتے ہوئے' ممکنہ الوداعی کلمات ـــــ مجھے فون ضرور کرنا یا خیریت کے دو لفظ لکھ دینا اور حالات سے مطلع کرنا وغیرہ وغیرہ ـــــ کا کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چنگ ال ہی زیادہ تر بولتا رہا اور یون جا اس کی باتوں سے محظوظ ہوتی رہی۔ وہ اسے بتاتا رہا ـــــ نو سال کی عمر میں اسے خسرہ ہوئی تھی۔ کالج میں طبعی آرٹس سیکھنے کی کوشش کی اور بدترین گرمی کے موسم میں سیول کی سڑکوں پر' ڈرائیونگ لائسنس بنوانے کیلئے مارا مارا پھرتا رہا تا کہ امریکہ میں تعلیم کے دوران کچھ کام کر

سکے۔ پھراس نے ایک پڑھی ہوئی کتاب ''پاپلیئن'' کے بارے میں بتایا۔

''اگر تم میں پاپلیئن جیسی خواہش موجود ہے تو امریکہ میں لامحدود کا راستہ تمہارے سامنے ہے۔ کبھی تم نے یہاں کوریائی باشندوں کو مل بیٹھتے سنا ہے' وہ ہمیشہ چینیوں کی باتیں کرتے ہیں۔ چینیوں کی پہلی نسل نے سیدھی سادی مزدوری کر کے چند پیسے ہی کمائے ہوں گے' اس زمانے میں یہاں سب ویز بن رہی تھیں۔ دوسری نسل نے چھوٹی لانڈریاں یا نوڈل کی دکانیں کھولی تھیں۔ اپنا گھر خریدنا یا اپنے بچوں کو تعلیم دلانا تیسری نسل تک ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ جب میں یہ باتیں سنتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ کورین ہر کام جلد بازی میں کرنا چاہتے ہیں ـــــ میں خود بھی اسی طرح سوچتا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ساری ترقی ـــــ جس کیلئے چینیوں کی تین نسلیں گزر گئیں ـــــ چند سالوں میں کر ڈالیں۔ میں نے کوریا سے چلتے ہوئے اپنے دوستوں اور بڑے بھائی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میرے خط لکھنے کا برا نہ ماننا کیونکہ ممکن ہے' خط خریدنے کی مجھ میں سکت ہی نہ ہو۔ میرے بھائی نے ایک خاصا مہنگا پین خرید کر مجھے دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر میں امریکہ میں بھوک کے ہاتھوں تنگ ہو جاؤں تو اسے بیچ کر' ایک وقت کا کھانا کھا لوں' میری بڑی بہن نے مجھے سونے کی انگوٹھی دی تھی۔ میں نے وہ انگوٹھی انگلی میں ڈالی اور پھر مجھے امریکہ کیلئے جہاز میں سوار کرا دیا گیا۔ یہاں آنے کی خوشی اتنی تھی کہ جہاز میں مجھ سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا گیا' ایئر ہوسٹس زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔''اس آدمی نے شاید پہلے کبھی جہاز میں سفر ہی نہیں کیا۔'' یہ کم بخت انگوٹھی ـــــ میں یقیناً کوئی مسخرہ ہی لگ رہا ہوں گا!''

یون جانے پارک میں ملنے والی بوڑھی کورین عورت کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔ (آخر خیالات گھوم پھر کر اسی دادی اماں کی طرف کیوں آ دھمکتے ہیں؟) پھراس نے اپنے متعلق مختصراً بتایا۔ اسے معلوم تھا کہ کی ینگ کی ماں نے پہلے ہی اس کی شادی اور طلاق کے بارے میں چنگ ال کو بتا دیا ہو گا اور وہ اس کی تنہائیوں' ناامیدی اور اداسی سے بخوبی آگاہ ہو گا۔

اجالا ختم ہوتے ہی' سرد ہوا کچھ اور تیز ہو گئی۔ انہوں نے تیراکی کے کاسٹیوم پر ہی اپنے اپنے کپڑے پہن لئے۔ چنگ ال کی قمیض ایک طرف سے باہر رہ گئی تو وہ بولے بغیر رہ نہ سکی ''تمہاری قمیض صحیح طرح اندر نہیں ہے۔'' چنگ ال نے اپنی قمیض کو ٹھیک کر کے پینٹ میں اڑس لیا۔ وہ اس پر نگاہیں جمائے شاید اسے غصہ دلانا چاہ رہی تھی۔ ساحل پر لوگ کم رہ گئے تھے۔ اکا دکا جوڑے ریت پر لیٹے راز و نیاز میں محو تھے۔ اندھیرا چھاتے ہی مرغابیاں غول در غول ساحل

کی جانب آ کر پھرنے لگیں۔ یون جا کو ان سے خوف محسوس ہوا۔ ان کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پر، مسلسل گھومتی آنکھیں اور تیز نوکیلی چونچیں، اسے یوں لگا جیسے ان کی تیز دھار چونچیں اس کی آنکھوں میں سوراخ کر ڈالیں گی اور ممکن ہے اس کے دل کو ہی کچا چبا ڈالیں۔ اس نے نیچے سے اپنا تولیہ اٹھایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اب چلنا چاہئے۔''

قریبی پارکنگ میں، مرغابیوں کے غول اور بڑھ گئے تھے۔

''اور قریب سے دیکھنا چاہو گی؟'' چنگ ال نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اگر ہم آہستگی سے ان کے پاس سے گزریں تو یہ اڑیں گی نہیں۔ خدا کی پناہ! یہ تو لاتعداد ہیں۔'' کار آہستہ آہستہ مرغابیوں کے گرد دائرے کی شکل میں گھومنے لگی۔ چنگ ال کے کہنے کے مطابق مرغابیاں ذرا نہیں گھبرائیں اور اپنی جگہ پر کھڑی رہیں۔ یون جا کھڑکی سے ان کا نظارہ کرتی رہی۔ اب اس کا خوف دور ہو گیا تھا۔

پھر وہ ساحل کی پٹی سے پیچھے ہٹے اور ہائی وے پر آ گئے۔ ساحل دور ہوتا دکھائی دیا۔ گہرے نیلے آسمان پر سورج غروب ہونے کا منظر نظر آ رہا تھا۔ دور جاتی پہاڑیوں اور درختوں کے ہیولے کچھ دیر تک نظر آئے اور پھر غائب ہونے لگے۔ یون جا اس وقت چونکی جب چنگ ال نے ہیڈ لائٹس جلا کر اسے مخاطب کیا۔ ''تم بہت تھک گئی ہو'' چنگ نے کہا ''اپنی کمر سیٹ سے ٹکا کر، ذرا پرسکون ہونے کی کوشش کرو۔''

یون جا نے ٹیک لگا لی۔ خاموشی کے اس دورانیے میں، وہ اس کی ماہرانہ ڈرائیونگ کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر کیا کرنا ہے، یہ خیال بھی اسے سراسیمہ کر رہا تھا۔ آیا وہ اسے اندر چلنے کی دعوت دے یا ملنے کیلئے، اگلے دن کسی اور جگہ کا وقت دے تا کہ وہ اپنی چیزیں واپس لے سکے لیکن دوسرے نظریے کا مطلب تھا کہ اسے دوبارہ اس سے ملنا پڑے گا ــــ بھنور شدید طغیانی انداز کا تھا، اسی لئے وہ اپنے لئے جھنگے پکڑ کر نہیں لا سکے تھے ــــ

''میں شرط لگا سکتی ہوں کہ اس کا مجھ سے کوئی جذباتی تعلق ہے ہی نہیں۔ ایک ایسی عورت سے جو محبت اور پیسے کی پیاسی ہے۔ اس کا بھلا کیا رشتہ؟'' یون جا کو چنگ ال کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔ ''یہاں سے ڈگری لینے کے بعد، میں کچھ کتابیں لکھوں گا۔ اپنا نام روشن کروں گا اور پھر کوریا واپس چلا جاؤں گا۔ اس وقت بھی وہاں خاصے پی ایچ ڈی ہیں اور محض ایک ڈگری کے سہارے، واپس جا کر، نوکری تلاش کرنا ناممکن ہی ہو گا۔''

''اور باقی ساری زندگی۔'' یون جا نے سوچا ''مجھے ایک عام سی عورت سمجھ کر' میرے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے سنتے رہو گے۔ شاید تم کہو گے کہ ملک چھوڑنے کے خوف نے مجھے مجبور کر دیا تھا ـــــ چنانچہ میں نے ایک ایسی بوڑھی عورت سے شادی رچا لی' جو عمر میں میری ماں کے برابر تھی ـــــ یہ گلے میں کیسا درد ہو رہا ہے ـــــ اور خاص طور سے جب اس نے اکٹھے رہنے کا تصور پیش کیا اور ممکن ہے مستقبل میں جب تم کسی سے شادی کرنے لگو تو شاید تم اسے کچھ اس طرح کہو۔ ''مجھے تم سے ایک اعتراف بھی کرنا ہے' میری ایک شادی پہلے بھی ہوئی تھی ـــــ''

چنگ ال خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ سٹیرنگ پر انتہائی مشاقی سے جمے ہوئے تھے' ظاہر ہے ایک طالبعلم کے نوجوان ہاتھ تھے۔ یون جا کا جی چاہا کہ اس کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا مارے' اسے اپنے دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالے۔ کسی بھی طرح وہ چنگ ال کو اپنے انداز میں سوچنے پر مجبور کرے تاکہ مستقبل میں جب بھی وہ اس کا تذکرہ کرے' اس کے لہجے میں اس کیلئے احترام ہو۔

چنگ ال نے یون جا کی گھورتی نگاہوں کو محسوس کر لیا۔ اس نے اس پر ایک چور نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ تقریباً اس کے سیدھی جانب تھا۔ ''اس میں خوبصورتی تو ہے ہی نہیں ـــــ شاید اس کا پتلا دبلا' کمزور سا جسم' اس کے چہرے کی شادابی کو ماند کر دیتا ہو ـــــ لیکن بعض اوقات تو یہ واقعتاً حسن کی دیوی لگتی ہے۔ خصوصاً ذرا سے گرم موسم میں اس کی شہد رنگ جلد میں ایک دلکش چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی پلکیں اور زیادہ گھنی اور گہری لگنے لگتی ہیں۔'' لیکن چنگ ال نے اطمینان سے اس کے چہرے کی جانب دیکھا ہی کب تھا ''مسز لی! تمہارے کوئی بچے بھی تھے؟''

''ایک ـــــ وہ بھی مر گئی۔''

چنگ ال نے سگریٹ سلگائی۔ اس کی بے لہجہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''لگتا ہے' بڑی غیر جذباتی قسم کی عورت ہے۔ نہ کوئی تاثر' نہ دوسروں میں کوئی دلچسپی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے بچے کے چھن جانے کا کوئی غم ہی نہیں' سچ ہے' وقت بڑے بڑے زخموں کا مرہم ہے۔ میں بھی بڑے غیر جذباتی انداز میں لوگوں کو بتا رہا ہوتا ہوں کہ میں بہت چھوٹا تھا' جب میرے والد کا انتقال ہوا تھا یا میری والدہ فوت ہوئیں تو میں کالج میں تھا۔ شاید اس کے ساتھ بھی یہی

معاملہ ہے لیکن وہ تو اس کی اپنی بچی تھی؟ وہ کس طرح یہ کہہ سکتی ہے۔ ’’بس وہ مرگئی۔‘‘ کی ینگ کی ماں کے ذریعے اسے ابتداء ہی میں پتہ چل گیا تھا کہ وہ تنہا اور بے سہارا عورت ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک عام سے نام کی حامل عورت یون جا میں کچھ خاص خصوصیات بھی ہو سکتی ہیں۔ پندرہ سو ڈالر میں سے پہلی قسط دیتے ہوئے اس نے زیادہ سے زیادہ یہ سوچا ہو گا کہ فلاں فلاں عورت سے میری کاغذی شادی ہو رہی ہے' اس سے کسی بھی طرح کی توقعات رکھنا محض بے وقوفی ہی ہو گی۔ ممکن ہے اسے خیال آیا ہو کہ ایک عورت' جس نے سخت کوشی کی زندگی گزاری ہے' کی ینگ کی ماں سے ہی ملتی جلتی ہو گی۔ چھوٹے چھوٹے بال ہوں گے' گاؤدیوں کی طرح کا سیدھا سادھا لباس ہو گا۔ سفید سینڈل پہنے' چالیس سالہ عورت مغربی لباس میں یقیناً خود کو پرسکون محسوس نہیں لگتی ہو گی لیکن بس سٹاپ پر کی ینگ کے باپ نے جس عورت سے ملوایا' وہ چھوٹے مگر سیدھے بالوں والی' بغیر آستین کا لباس پہنے' ایک دبلی پتلی' نازک اندام سی عورت تھی۔ اس کی گہری پلکیں اور شہد انگیز چمکتی جلد دیکھ کر چنگ ال کو جنوب مشرقی ایشیا کی عورتیں یاد آ گئیں۔ اس کے ہاتھ میں دھوپ کی عینک تھی اور ایک بڑا سا ہینڈ بیگ اس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے اکٹھے ہی کی ینگ کی ماں کے گھر گئے' جہاں ان کی ڈنر پر دعوت تھی۔

چنگ ال کو اس پر خاصا ترس آیا۔ وہ بمشکل اس کے شانوں تک آتی تھی۔ وہ خود کو قصور وار سمجھ رہا تھا۔ لیکن یون جا بے تکان بولے جا رہی تھی۔ ’’اچھا' تو تم طالبعلم ہو؟ میں نے کل ہی ایک اپارٹمنٹ ڈھونڈا ہے۔ تین دن تک میں اس میں منتقل ہو جاؤں گی۔ تھوڑی دیر بعد تم میرے ساتھ چلنا' میں تمہیں سارا محل وقوع سمجھا دوں گی۔ ہے تو چھوٹا سا ــــــ کچن' باتھ روم' لونگ روم اور بیڈ روم سب کچھ ایک ہی جگہ ہے۔‘‘ چنگ ال کو لگا جیسے چالیس سال کے لگ بھگ یہ عورت اٹھارہ سالہ لڑکی کی سی حرکتیں کر رہی ہے۔ یہ عورت صرف پیسے کیلئے مجھ سے شادی کر رہی ہے۔ اسے شدید دکھ ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی بوڑھی طوائف سے معاملہ کر رہا ہے۔

’’تم اس شادی کے کاروباری حصے کو بھلا کر' سچ مچ کی شادی کیوں نہیں کر لیتے؟‘‘ کی ینگ کی ماں نے کھانے پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا اور جب وہ شادی کا ایک خوبصورت گیت گا رہی تھی تو چنگ ال کو محسوس ہوا کہ وہ گویا نہر کے نیچے رینگتا پھر رہا ہے۔ یون جا البتہ ہنس رہی تھی۔

ساحل سمندر اور شہر کے درمیان ٹریفک کا بے پناہ رش تھا۔ بار بار ٹریفک پھنس رہا تھا' گاڑیوں کے لمبے جلوس میں یون جا اور چنگ ال نے کئی کاروں کے پیچھے کشتیاں بندھی دیکھیں' بعض کاروں پر سائیکلیں لدی ہوئی تھیں اور بعض گاڑیوں میں پورے پورے خیمے' ساز وسامان سمیت لدے پھندے نظر آ رہے تھے۔ بند دکانوں کے قریب سے گزرتے ہوئے چنگ ال سوچ رہا تھا کہ اس نے کوریا' اپنے بھائی کو فون کرنے میں کتنے پیسے خرچ کر ڈالے۔ اس کی محنت و مشقت سے کمائے ہوئے پیسے' اس سے یہاں منگوا لئے۔ (پتہ نہیں' بھابھی کو اس کا علم ہوا ہو گا کہ نہیں) اور یہ سب کچھ مستقل سکونت کے اس کارڈ کی وجہ سے ہوا اور اب حال یہ ہے کہ وہ اگلے سمسٹر کی فیس بھی نہیں دے سکتا۔ وہ خاصا ڈپریس ہوا لیکن پھر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اب اس کے پاس گرین کارڈ ہے (اس کا سینہ پھول گیا) اور وہ بغیر کسی پریشانی کے نوکری کر سکتا ہے۔

''میں اگلے سمسٹر میں نہیں پڑھوں گا' سخت محنت کروں گا اور اس سے اگلے سمسٹر میں میرے پاس کالج کی فیس ہو گی اور مستقل سکونت کے حصول کے بعد' اس کی فیس بھی آدھی ہو جائے گی۔'' وہ دل ہی دل میں اعداد وشمار کی جمع تفریق کرنے لگا۔ وہ اپارٹمنٹ کے کرائے اور کھانے پینے میں کس حد تک بچت کر سکتا ہے؟ لیکن آدمی اپنی خوراک میں بہت زیادہ بچت نہیں کر سکتا۔ چنگ ال نے گویا خود کو یاد دہانی کرائی۔ بہت سے طلبہ اسی وجہ سے بیمار پڑ گئے تھے اور بالآخر انہیں تعلیم چھوڑ دینا پڑی۔ ''یہ عورت یون جا عیش میں ہے ـــــ نہ اسے پڑھنے کی ضرورت اور نہ ہی آگے بڑھنے کی خواہش۔ کھانا پینا ہے اور آرام سے سو جانا ہے۔''

چنگ ال کو شدید دکھ تھا کہ اس جیسا ذہین وفطین کورین' امریکہ میں بے کار وقت ضائع کر رہا ہے' گویا اسے اپنے خاندان یا اپنے وطن کی ذمہ داریوں کا سرے سے کوئی احساس ہی نہیں۔

''میں یہاں کیوں اپنا سر پٹختا پھر رہا ہوں؟ کیا یہ تعلیم عالیشان اور حیرت انگیز ہے؟ کوریا میں انگریزی پڑھتے ہوئے' اس کے ذہن میں شاید ہی کبھی امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کا خیال آیا ہو۔ ہاں' اسے لوگوں سے یہ سننا اچھا لگتا تھا کہ جناب' وہ تو امریکہ کا پڑھا ہوا ہے۔ یہ خواہش اور بھی زیادہ شرمناک تھی کہ اسے ابھی امریکہ ہی میں رہنا ہے۔'' دوسرے ملکوں سے آ کر' یہاں رہنے والے لوگ نہ جانے کس طرح سوچتے ہوں گے ـــــ کیا انہیں بھی اپنے ملک سے دور رہنے اور اپنا ملک چھوڑ دینے پر ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ امریکہ کی کرپٹ

مادی تہذیب پر خاصی سخت تنقید پڑھ چکا تھا لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس میں کرپشن ہے کہاں' اور یہی بات اسے پریشان بھی کرتی تھی۔ وہ تو صرف یہ جاننے کا خواہاں تھا کہ ایک جوان کورین کس حد تک ترقی کر سکتا ہے۔ وہ سکون اور طمانیت کے بجائے ناامیدی اور یاسیت سے پیدا شدہ غصے کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دوسروں سے علم اور اپنی شناخت کا حصول چاہتا تھا۔ لیکن یون جا نامی اس عورت کو تو بظاہر اپنے کورین تک ہونے کا احساس نہیں۔

کار اب اس جانی پہچانی سڑک پر آ گئی' جس کے دونوں جانب چھ منزلہ پرانی عمارتیں ایستادہ تھیں۔ بچے بھاگ دوڑ رہے تھے یا کنکریٹ کے راستوں پر سائیکلیں چلا رہے تھے۔ کئی بوڑھے جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوش گپیاں کرتے' چہل قدمی کر رہے تھے۔ چنگ ال نے گاڑی روکی' کولر اور دوسرا ساز و سامان گاڑی سے باہر نکالا اور اپنے کندھوں پر لاد لیا۔ پھر وہ برقی زینے کی طرف بڑھ گئے۔ یون جا کے سر پر شدید تنہائی اور فکر سوار تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی اجنبی جگہ پہنچ گئی ہے۔ وہ برقی زینے کی ایک سائیڈ سے تقریباً لگی کھڑی تھی' یہاں تک کہ وہ مطلوبہ منزل پر آن پہنچے۔ جب وہ جوان تھی تو لگتا تھا کہ ہر چیز اسی کی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ' یہ احساس فنا ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف اپنی کسمپرسی کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ جب بھی کسی سے جدا ہونے کا وقت آتا' اسے لگتا جیسے وہ اپنے محبوب سے جدا ہو رہی ہے۔ ''کیا میں لوگوں کی اتنی محتاج ہوں کہ میں نے اپنے شوہر کو خود سے جدا کر دیا؟ کوئی بھی میرے ساتھ سے بوجھل نہیں ہونا چاہتا' سو وہ مجھے چھوڑ دیتے ہیں۔ میری بچی تک میرے ساتھ نہیں رہی ـــــ مجھے تو حیرت ہو گی اگر وہ بوڑھی عورت واپس کوریا چلی گئی۔ ممکن وہ اب بھی وہیں کہیں گراؤنڈ میں بیٹھی امریکی سگریٹ اڑا رہی ہو اور راہ میں مل جانے والے ہر کوریائی کے کان مروڑ رہی ہو۔ ممکن ہے' بوڑھی ہو کر' میں بھی اسی طرح کی حرکتیں کرنے لگوں۔ اعصابی گڑبڑ ابھی سے اتنی زیادہ ہے کہ بعض اوقات پورا جسم دکھتا پھوڑا لگتا ہے۔ ـــــ خدا نہ کرے' میں بھی ایرے غیرے لوگوں کو پکڑ کر' اپنی مصیبتوں بھری کہانی سناتی پھروں۔''

یون جا نے دروازہ کھولا اور اپارٹمنٹ کی لائٹ آن کر دی۔

آج' انہیں یہ چھوٹا سا' مربع شکل کا کمرہ' ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت اور پرسکون نظر آیا۔ جانی پہچانی بو' گرمی کی شدت سے کچھ زیادہ ہی' ماحول میں بسی ہوئی تھی۔ البتہ چنگ ال کو جب اپنا سامان بندھا ہوا' صوفے پر رکھا نظر آیا تو اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ اب وہ اسے پھر سے

کھولتا اور اپنا سامان' ان کی مخصوص جگہوں پر رکھتا پھرتا۔

''خاصی چپچپاہٹ ہو رہی ہو گی' بہتر ہے کہ تم جا کر نہا لو۔'' یون جا نے کہا۔

چنگ ال جب نہا دھو کر اور تازہ دم ہو کر باہر نکلا تو یون جا دروازے اور راہداری کے پاس بکھری سمندری ریت کو صاف کر رہی تھی۔ اس نے اپنا مخصوص خوبصورت زرد لباس پہن رکھا تھا۔ کولر کو خالی کر کے اس کی صفائی بھی کر دی گئی تھی' تو لئے بھی ایک جگہ رکھے تھے۔ یون جا نے سر دھو لیا تھا اور اس کے گیلے بالوں میں مانگ کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ چنگ ال نے کچھ بولنے کی کوشش کی' پھر چپ ہو گیا اور دبے پاؤں صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ ''اس نے تو پہلے ہی اپنے بال دھو ڈالے' کپڑے بھی بدل لئے اور اب صفائیاں کرتی پھر رہی ہے۔'' اس نے سوچا۔ جلدی جلدی کام ختم کر کے' یون جا مڑی اور اس نے چنگ ال کی جانب نگاہ اٹھائی۔ چنگ ال کو یوں لگا جیسے کوئی پھول ابھی ابھی کھل اٹھا ہو۔

''میں اسے رات کے کھانے کیلئے تو کہہ ہی دوں۔'' ریت صاف کرتے ہوئے یون جا نے سوچا تھا۔ ''اس نے کار ادھار لینے کی زحمت اٹھائی اور مجھے سیر کیلئے لے گیا—— کم از کم میں اتنا تو کر ہی سکتی ہوں کہ اسے ایک اچھے سے ڈنر کی دعوت دے دوں اور اگر وہ اس وقت گیا تو کھانا کہاں سے کھائے گا؟ اس وقت تو اسے کوڑے دان میں پڑا' بچا کھچا کھانا ہی مل سکے گا—— لیکن اگر میں نے اسے کھانے کی دعوت دے دی تو شاید یہ سوچے' پتہ نہیں میری سوچ کو کیا رنگ دے ڈالے۔ جب کبھی میں نے لوگوں کو کسی شے کی قیمت ادا کی ہے۔ انہوں نے تو مجھے کبھی ڈنر کی دعوت نہیں دی۔''

''تھوڑی بہت موسیقی ہو جائے؟'' چنگ ال بڑبڑایا' پھر اٹھا اور سٹیریو کے پاس جا کر ایک ریکارڈ اس پر سیٹ کرنے لگا' فلامینکو گٹار کی ایک خوبصورت سی دھن کمرے کی فضا میں گونجنے لگی۔ یون جا نے جب کبھی سٹیریو ریکارڈ چلایا' چنگ ال نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شاید یہ کوئی نیا ریکارڈ تھا۔ ''میں اس عورت سے خوفزدہ کیوں ہوں؟ تمہارے خیال میں' وہ کوئی جادوگرنی یا اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے۔''

''اگر یہ عورت تمہیں چارہ ڈالتی تو تم بچ ہی نہیں سکتے تھے۔'' یہ بات چنگ ال کے روم میٹ نے اس سے کہی تھی' کی ینگ کے باپ سے اور نہ جانے کتنے دوسرے لوگوں سے بھی اس نے یہ بات سنی تھی۔ ''آج بھی کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔'' یون جا کے اپارٹمنٹ سے چنگ ال

کے رات گئے واپس آنے پر اس کا روم میٹ اکثر مذاقاً کہا کرتا تھا ''اگر وہ کچھ کرنے پر آ جائے تو ایک ادھیڑ عمر عورت کی راہ میں کوئی شے بھی حائل نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پکائے ہوئے مزیدار کھانوں کے بدلے تم بھی خوب اس کی خدمت کر رہے ہو گے۔''

چنگ ال کو شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک ایسی عورت سے بھاگنا چاہ رہا تھا' جس نے معمولی سی رقم کے بدلے اس کی واقعتاً مدد کی تھی' ایک ایسی عورت سے' جس کی زندگی میں وہ آن گھسا تھا۔ وہ اس کمرے میں تقریباً دو مہینے مسلسل رہتا رہا تھا۔ اب اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنا یہ وقت دوبارہ اس کے ساتھ گزارے۔ ''میں نے ان لمحات کو زیادہ خوبصورت اور لطف انگیز بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔'' اس نے خود سے سوال کیا۔ وہ اور یون جا بہت کم موسیقی کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور جب کبھی وہ کھانے کے بعد' چہل قدمی کیلئے باہر نکلا کرتے تو دونوں ہی خاصے بے چین لگتے کیونکہ ان کا مقصد' دوسروں پر محض اپنے اکٹھا رہنے کا ڈھونگ رچانا ہوتا تھا۔

یون جا اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر' کھانے کی گول میز پر جا بیٹھی۔ ''اگر تمہیں بھوک لگ رہی ہے تو کچن میں جا کر' کل کا بچا کچا کھانا کیوں نہیں اٹھا لاتے؟ کافی چیزیں مل جائیں گی۔''

یون جا کے بال خشک ہو گئے تھے۔ بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر آ پڑی تھی۔ چنگ ال کو وہ خاصی حسین لگی۔

''شاید اچار گوشت بھی ہو گا!'' یون جا کہہ رہی تھی۔

چنگ ال کے بدن میں تناؤ آ گیا۔ ڈنر کی یہ دعوت اس بات کا اشارہ ہے کہ اب اسے یہاں سے جانا ہو گا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور گزشتہ دو ماہ کے بارے میں کچھ کہنے کیلئے مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ خون گویا اس کے سر میں جمع ہونے لگا اور اس کا چہرہ بری طرح تپنے لگا۔

''تمہارا کیا جواب ہو گا اگر ـــــ میں تم سے شادی کی درخواست کروں۔'' پھر اس نے اتنی تیزی سے کھلے دروازے سے باہر چھلانگ لگائی جیسے کوئی دشمن اس کے تعاقب میں ہو۔ باہر نکلنے کی جلدی میں' ٹھوکر سے یون جا کا ایک سینڈل اڑ کر سیدھا چولہے میں جا پڑا اور پھر اس کے پیچھے دروازہ زور سے بند ہو گیا۔ یون جا' میز پر بیٹھی بیٹھی اچھل پڑی۔

''کیا کہا اس نے؟'' اس کے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں اور نہ جانے کب کا رکا ہوا پیشاب خطا ہو گیا۔ ''میں تو شادی کو مانتی ہی نہیں۔'' اس نے خود کلامی کی۔ ''جو کچھ میرے ساتھ گزر گیا' اس کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف گئی اور چابی کے

سوراخ میں سے ہال کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے چنگ ال کو بار بار لفٹ کا بٹن دباتے دیکھا۔ وہ خاصا دل شکستہ اور مایوس تھا۔ پھر وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

''لڑکا مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے —— مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔'' یون جا نے سوچا۔ اس کی سوئی ہوئی رگوں میں ایک دم خون کی گردش تیز ہو گئی جیسے پانی سے سیراب ہو کر کوئی نیم مردہ درخت پھر سے ہرا بھرا ہونے لگتا ہے۔ بھولی بسری حرارت آمیز سنسنی نے اس کی سوچ کو ایک نیا رخ دیا۔ شاید ان کا باہمی تعلق شروع ہی سے اس نکتے کی طرف گامزن تھا۔ ''جس دن اس سے پہلی ملاقات ہوئی' میں خوب بن سنور کر گئی تھی اور کیا' شادی کے بعد' کئی بار میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ واقعتاً بہت اچھا وقت گزاریں' ایک دوسرے کو اپنا سمجھیں' حالانکہ ہماری شادی سچ مچ کی شادی تو تھی ہی نہیں۔''

یون جا مڑی۔ اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ چنگ ال کا ٹرنک صوفے پر ہی پڑا ہوا تھا۔ ''لیکن ایک دن وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔'' اچانک پھر وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ اس کی نگاہیں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احاطہ کر رہی تھیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی عمر' پہلے سے طلاق کا تلخ تجربہ' اس کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقے' سوتے ہوئے کبھی کبھار بلند خراٹے لینا —— یہ سب چیزیں لمحہ بھر میں اس کے ذہن کے پردے پر منعکس ہونے لگیں۔ ''لیکن میں ان کوتاہیوں کو اپنی کمزوری نہیں بننے دوں گی۔'' اس نے خود کو یقین دلایا ''یہی تو ہمت اور حوصلے کا وقت ہے!''

لوری

کم چی ون

یہ الگ تھلگ سا مکان تھا۔ خاصا پرانا' روایتی کوریائی انداز کا تاہم اس کے ستون اب بھی بڑے کروفر سے اپنی جگہ ایستادہ تھے۔ سامنے کھلے برآمدے میں ماضی کی پروقار تعمیر آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک لمبا اور گھنا درخت گھر کے ایک حصے پر سایہ کئے کھڑا تھا۔ اپنی ضخامت اور بلندی کے اعتبار سے خارجی گیٹ بھی کم خوبصورت نہیں تھا' یہ اور بات کہ وہ گھر کی عقبی جانب بنایا گیا تھا' تاہم اس کے محرابی دروازے' درخت کی چوٹی اور مکان کی چھت سے کسی طرح بھی نیچے نظر نہیں آرہے تھے۔ گیٹ سے ایک پتھریلا زینہ مکان کی جانب نیچے کو اتر رہا تھا۔

انہی زینوں سے اتر کر' وہ عورت اپنے شوہر کی جانب بڑھنے لگی۔ اس کا شوہر مکان کے مالک میاں بیوی کے ساتھ کھڑا تھا۔ پراپرٹی ڈیلر بھی ان کے ساتھ تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلتے ہی ماحول کی حدت' ایک دم کم ہوگئی۔ جھینگروں کی موسیقی جاری تھی۔ عورت نے خاصی طمانیت محسوس کی۔ وہ اردگرد کی فضا سے لطف اندوز ہوتی آگے بڑھتی رہی۔

چلتے چلتے' اس نے اپنی آنکھیں بند کیں' پھر کھول لیں —— میں یہاں باغ میں سونی کے ساتھ کھیلا کروں گی' ہر طرف رنگا رنگ اور خوشنما پھول کھلے ہیں۔ موجودہ چھوٹے سے گھر

میں تو میری بچی کو مکئی کے پودوں کی کیاری کے قریب جا کر' اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کیلئے بھی مکان مالکن کی خوشنودی چاہئے ہوتی ہے ـــــ وہ تصور میں اپنی ننھی بچی کو اس وسیع احاطے میں کھیلتے کودتے' سیڑھیاں اترتے چڑھتے دیکھ رہی تھی ـــــ یہاں اسے کسی مکان مالکن کی جانب اجازت طلب نگاہیں نہیں پھیلانی ہوں گی۔ عورت کو دلی خوشی کا احساس ہوا۔

مکان کی قیمت نا قابل یقین حد تک کم تھی۔ گھر کی تلاش میں' ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے' شہر کے کئی ایک علاقے انہوں نے کھنگال مارے تھے' تب کہیں جا کر یہ گھر دیکھنے کو ملا تھا' اتنی بڑی جگہ' اچھا محل وقوع' اتنی قیمت میں یہ سب قطعی غیر متوقع تھا۔ جس گھر میں ان دنوں ان کی رہائش تھی' وہاں تو بس گزارا ہی ہوسکتا تھا' اور یہ مکان تو اس کے مقابلے میں کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ تین اطراف میں اونچی اونچی دیواریں اور چوتھی جانب ایک بڑا' پُرسکون تالاب اور کناروں پر لگے پودوں کی ہری بھری باڑ' مکان کی حد بندی کا کام دے رہے تھے۔

عورت نے باغیچے' بلند اور گھنے درخت اور متصل کمرے کے جگمگاتے فرش کو تعریفی نظروں سے دیکھا تو بوڑھی مالکن کا پروقار چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ''تمہیں اگر مکان پسند ہے تو تم آج ہی یہاں شفٹ ہوسکتی ہو' نوجوان خاتون!'' بوڑھی عورت نے کہا ''ہمارے بیٹے اور بہو ہمارے سر پر سوار ہیں کہ ہم فوراً ان کے پاس چلے جائیں' ہم اس گھر کی وجہ سے جا نہیں پا رہے۔ لوگ اسے مندر سمجھتے ہیں' اس لئے پھیری لگانے والے اور خوانچہ فروش تک ادھر کا رخ نہیں کرتے۔''

اتنا بڑا گھر ہے' یہاں میں با آسانی اپنے شوہر کی نظروں سے پوشیدہ بھی رہ سکتی ہوں' عورت نے سوچا۔ اب مجھے ہر وقت' ایک چھوٹے سے کمرے میں' مجبوراً اس کے سامنے نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ کام کاج کرتے ہوئے اس کی تحقیر آمیز نگاہوں کا تعاقب مجھے کتنا برا لگتا ہے' اب میں ان نگاہوں سے بچ سکوں گی۔ جہاں اس کی نظروں میں نفرت نظر آئی' میں بھاگ کر باغیچے میں آ جایا کروں گی یا عقبی برآمدے میں بیٹھ کر' دھوپ سینکوں گی اور کتابیں پڑھا کروں گی ـــــ عورت نے اپنا ہیئر پن ٹھیک کیا۔

''ہماری ایک بچی ہے تین سال کی۔ ہمیں غالباً تالاب کی جانب لکڑی کی مضبوط باڑ لگوانی پڑے گی۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے یہ مکان اس کی ملکیت میں آ چکا ہے۔

''اوہ' اس کی فکر نہ کرو۔ پڑوس میں ایک کارپینٹر ہے' وہ ان سب کاموں کو دیکھ لے گا' پچھلی خزاں میں اس نے سارے گھر کی مرمت کر ڈالی تھی۔ ذرا سی بھی لیکیج نہیں ہے کہیں بھی۔

سارا گھر صاف ستھرا اور صحیح ہے۔'' مالک کی بیوی نے کہا۔ پھر وہ پراپرٹی ڈیلر کے دفتر گئے' جو اسی سڑک کی ابتداء میں تھا۔ عورت دفتر سے باہر ہی کھڑی رہی۔

جب وہ مکان دیکھنے کیلئے اپنے گھر سے روانہ ہوئے تو تو اس کے شوہر نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بات پر اس سے الجھتا رہتا تھا۔ وہ کام سے واپس آیا تو رات کا کھانا تیار کیوں نہیں تھا؟ وہ صبح جلدی کیوں نہیں اٹھ سکی؟ عورت اپنے شوہر سے بات کرنے کا انداز ہی بھلا بیٹھی تھی اب تو وہ محض گھر کی نوکرانی بن کر رہ گئی تھی۔ یہ بھی ہوتا کہ وہ اپنے کرائے کے مکان کا دروازہ کھول کر' باغ میں پڑتی سورج کی کرنیں دیکھا کرتی اور سوچتی کہ وہ جس حالت میں ہے اسی طرح اپنی بچی کے ساتھ' یہ جگہ چھوڑ دے اور چیجو کے جزیرے یا چونگ چنگ یا چلایا کانگ ون جیسے دور دراز علاقوں میں کسی جگہ جا چھپے۔ بعض اوقات وہ محسوس کرتی کہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر چلے جائے' اپنی بیٹی کے ہمراہ کسی ندی کے کنارے بس جائے ۔اس کے پانیوں کی لہریں گننے کا تصور کتنا خوفناک اور کرب انگیز ہوگا۔ میں اپنی بچی کی زندگی تباہ کر دوں گی' ایک اچھے باپ کی شفقت اور اس کے دوستوں سے اسے محروم کر دوں گی۔ اس کی تعلیم' اس کا ماحول' اس سے چھٹ جائیں گے۔ ایسے لمحات میں وہ سونی کو زور سے آواز دیتی اور اگر وہ نظروں سے اوجھل ہوتی تو گھبرا کر اس کی تلاش شروع کر دیتی۔ جب وہ اسے گیٹ کے باہر یا پڑوسیوں کے احاطے میں کھڑی مل جاتی تو بچی کو' اپنی آغوش میں بھر لیتی۔ بچی کو اس طرح خود سے لپٹا کر' گویا وہ اپنے فاسد خیالات کی معذرت کر رہی ہوتی۔

''سونی! تمہیں پتہ ہے ممی کیا سوچ رہی تھیں؟''

بچی اس کے سینے سے اور لپٹ جاتی اور اس کے گدگدیاں کرنے لگتی۔ ماں بے ساختہ ہنس پڑتی۔ ''ممی سونی کو بہت چاہتی ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''ہاں بھئی ہاں!''

اس کا شوہر پراپرٹی ڈیلر کے دفتر سے باہر آ گیا۔ پراپرٹی ڈیلر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' کل ملاقات ہوگی میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ' ایک بار پھر اس مکان کا جائزہ لوں گا۔ کاش مکان خریدنے کا کوئی زیادہ آسان طریقہ ہوتا۔''

گھنٹے بال' گہری آنکھیں' پتلا دبلا جسم' طویل قامت' سفید رنگت' دانشورانہ چہرہ ــــ ایک انتہائی قابل گریجوایٹ ــــ اس کا شوہر واضح طور پر خوبصورت آدمی تھا۔

''اس قیمت میں' اتنا شاندار مکان پھر کبھی نہیں مل سکے گا۔'' پراپرٹی ڈیلر نے کہا ''ہم انہیں اپنی آفر کیوں نہ دے دیں؟ وہ لوگ یہاں تیس سال سے زیادہ عرصہ رہے ہیں' ہر طرح سے خوش باش ہی رہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ان کے لڑکے نے کتنی دولت کمائی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے' اس کی امارت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔''

میاں بیوی پراپرٹی ڈیلر کے دفتر سے چہل قدمی کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔

''جگہ تو اس میں بہت زیادہ ہے۔''

''ہاں! یقیناً بہت زیادہ ہے۔'' عورت نے جواب دیا ''اور باغیچے میں پانی کا نلکا بھی ہے۔ مجھے تو اس کا پانی بہت اچھا لگا۔'' اسے دکھ اس بات کا تھا کہ اس کے شوہر نے مکان کی خرید کے کاغذات پر دستخط کیوں نہیں کئے۔

''میں مکان دوبارہ دیکھنے' کل ین ہو کے ساتھ آؤں گا۔''

اگلے دن' اس کا شوہر ین ہو کے ساتھ' مکان کا دوبارہ جائزہ لینے گیا' اس کے دوست نے بتایا کہ مکان سڑک کی سطح سے نیچے بنایا گیا ہے اور اس کا خارجی دروازہ سامنے کے بجائے عقبی جانب بنا ہوا ہے۔ احاطے کی تکونی شکل کوئی اچھی علامت نہیں' اسے مربع شکل کا ہونا چاہئے تھا۔ پھر بھی اس کے خیال میں مکان خاصا خوبصورت تھا۔ پچھلے روز کی طرح ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' جھینگر گا رہے تھے اور رنگا رنگ پھول مستی میں جھوم رہے تھے۔

مکان دیکھ کر' اس کا شوہر سیدھا اپنے دفتر چلا گیا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ وہ گھر غالباً آسیب زدہ تھا۔ یہ بات اس نے اپنی بیوی کو نہیں بتائی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ رات کو تالاب کی سمت سے عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ نوجوان' غمگین آوازیں' ہلکے ہلکے سروں میں گاتی ہیں۔ ''تمہارے سر میں درد ہے' میرے سر میں درد ہے۔'' ان آوازوں میں تواتر اور تسلسل ہوتا ہے۔ یہاں رہائش پذیر کئی لوگوں نے سر درد کی شکایت کی تھی اور اس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔ موت کا آخری شکار ایک نوجوان لڑکا تھا۔ کہانی کے مطابق ایک رات اس کے سر میں اتنا شدید درد ہوا کہ وہ دیواروں میں سر مارنے لگا۔ باہر چاندنی فضا میں' چند نوجوانوں کے سائے تالاب کی غیر متحرک سطح پر کھڑے' آہستگی سے کورس کی شکل میں گا رہے تھے۔ ''تمہارے سر میں درد ہے' میرے سر میں درد ہے' تمہارے سر میں درد ہے' میرے سر میں درد ہے۔'' آوازیں صبح ہونے تک آتی رہیں اور دوپہر کے قریب لڑکا موت کی آغوش میں چلا گیا۔ لیکن یہ بہت پرانی

بات تھی۔ ممکن ہے افواہ ہی رہی ہو کیونکہ کسی کو بھی لڑکے کا نام معلوم نہیں تھا اور نہ ہی پتا تھا کہ وہ کب موت کا شکار ہوا۔ موجودہ مالکان تیس سال سے زیادہ اس مکان میں رہے تھے اور اس دوران کوئی حادثہ نہیں ہوا اور ان کا بیٹا ـــــ جو کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتا چلا جا رہا تھا ـــــ اسی گھر میں پلا بڑھا تھا اور اگر کسی لڑکے نے سر درد کی شکایت کی ہو اور اس کے بعد وہ موت کا شکار بھی ہو گیا ہو تو اس کی وجہ گردن توڑ بخار یا ایسی ہی کوئی اور بیماری بھی ہو سکتی ہے' اس وقت تک سائنس اور ٹیکنالوجی نے اتنی زیادہ ترقی نہیں کی تھی' اس لئے اس کا پتہ نہیں چلا۔ کسی بھوت پریت یا شیطانی روح کا بہرحال اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

پیدا ہونے کے بعد' لوگوں کو موت کا سامنا تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ وجہ اس کی کچھ بھی بنے' وہ اپنی مقررہ عمر گزار کر مریں یا عین جوانی ہی میں داغ مفارقت دے جائیں' موت بہرحال ایک حقیقت ہے۔ اس کا شوہر دل ہی دل میں خود کو قائل کر رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ پڑھا لکھا اور خاصا دانشور آدمی تھا۔ فرض کریں وہ مکان آسیب زدہ ہے بھی تو شیطانی روح ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی کیونکہ وہ یہ گھر اپنے پادری بھائی کی پس انداز رقم سے خرید رہے تھے۔ وہ انتہائی نیک اور پرہیز گار انسان تھا اور اب اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔

اہم بات یہ تھی کہ وہ جلد از جلد اس گھر میں منتقل ہوں۔ موجودہ رہائشی کمرہ بہت تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ وہ گھر کے دروازے پر اپنی نیم پلیٹ لگانے میں مزید دیر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آنے والی چھٹیوں میں وہ اپنے گیٹ کے محراب پر قومی پرچم بھی لہرائے۔

جب وہ مکان میں داخل ہوئے تو گیٹ پر اس کے شوہر کی بڑی سی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ تالاب کے گرد جنگلا بن چکا تھا۔ تالاب کا پانی گدلا تھا مگر اس سے منعکس ہونے والا قدرتی منظر حقیقت سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ عورت بڑی خوش اور مطمئن تھی۔ وہ سونی کے ساتھ پھولوں کی کیاریوں کے گرد ٹہلتی' پڑوس کے بچوں کو بڑے پیار سے بلاتی اور سونی کے ساتھ کھیلنے کو کہتی یا وہ باغیچے میں کمبل بچھاتی' گھنے درخت کے عین نیچے ـــــ اور اس پر بیٹھ جاتی۔ اسے یہ سب کچھ بہت دلفریب اور خوش کن لگ رہا تھا۔

اگر وہ موڈ میں ہوتی تو اردگرد موجود پھل توڑتی' ان کی چاٹ بناتی اور بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر کھلاتی۔ ہوا کے چلنے سے جب درختوں کے پتے ہلتے اور آپس میں ٹکراتے تو ان کی گونج کو سننے لگتی۔ اسے یہ آزادی کی آواز لگتی۔ جب بچے گھروں کو لوٹتے تو وہ انہیں نلکے کے پاس

بٹھاتی ' ان کے منہ ہاتھ اور پاؤں دھلاتی اور پھر انہیں ان کے گھروں کی جانب روانہ کر دیتی لیکن بعض دنوں میں وہ خالی الذہن اور اداس بھی ہو جاتی تھی۔ وہ سونی کو بچا کھچا کھلا دیتی اور اپنا کھانا گول کر جاتی' بچی اگر گندی ہو جاتی تو اسے نظر انداز کر دیتی۔

وہ دکھی ہو یا خوش باش' اس گھنے درخت کے نیچے ہر صورت بیٹھا کرتی۔ قدرت نے اسے گریز کا ایک بہت اچھا طریقہ عطا کیا تھا۔ کسی بھی دکھ یا پریشانی میں' اپنی ماں یا دوستوں کے متعلق سوچنے کے بجائے وہ ہمیشہ جنگلوں' کھیتوں اور پہاڑوں کی خواہش کرتی' وہ جہاں کہیں بھی رہی' قدرت اس کا دکھ درد بانٹنے کیلئے ہر جگہ موجود تھی —— بادل کا کوئی ٹکڑا' ہری بھری گھاس کا قطعہ یا کوئی درخت۔

لیکچررز' پروفیسر' کالج کے دوست اسے یاد نہیں رہے تھے لیکن کیمپس میں کسی مخصوص جگہ لہلہاتے اور جھومتے خوبصورت پھول یا صبح کے طلوع اور سورج غروب ہونے کے وقت' سورج کی شعاعوں کا آسمان کے ایک گوشے پر پھیلا ہونا —— اس کی ذہنی کیفت سے مطابقت کے سبب' آج بھی اس کی یادداشت میں' ہمیشہ کی طرح' تروتازہ تھے۔

پیاری ماں' پیاری بہن' آؤ دریا کے کنارے چل کر رہیں۔

جہاں سنہری ریت' احاطے میں ہر طرف چمک رہی ہو۔

چرواہوں کا یہ گیت —— گیٹ کے پیچھے —— اکثر سنائی دیتا۔

یہ وہ لوری تھی جو عورت اپنی بچی سونی کو سلانے کیلئے سنایا کرتی تھی۔ جب بچی اپنی ماں کے سینے سے لگ کر سو جاتی تو وہ اسے آرام سے بستر پر لٹاتی اور باہر باڑ کی طرف جا کر' پڑوسی کی لڑکی کو آواز دیتی۔ پڑوس کا گھر' اس گھر کی نسبت اونچا تھا۔ چنانچہ وہاں سے گھر کا پورا منظر آنکھوں میں رہ سکتا تھا۔ تاہم پڑوسی لڑکی اپنے گھر سے یہاں آ جاتی اور وہ اسے گھر میں چھوڑ کر ضروری اشیاء خریدنے مارکیٹ یا کتابوں کی قریبی دکان پر چلی جاتی۔ کتابوں کی دکان پر جانا بھی' اسے کسی سرسبز درخت کے نیچے بیٹھنے کی طرح' اچھا لگتا تھا۔ وہ کتابوں میں خوب گھستی' انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتی لیکن بعض اوقات پیسوں کی کمی کی وجہ سے اسے کتاب خریدے بغیر ہی لوٹنا پڑتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ گھر واپس آ کر' وہ کچن میں مصروف ہوتی اور ایک دم اس کے ذہن میں کوئی کتاب آ جاتی' جس کی اس نے کتابوں کی دکان میں ورق گردانی کی تھی اور وہ سوچتی کہ اگلی دفعہ وہ کتاب ضرور خرید لائے گی۔ ایک کتاب پڑھتی تو ایک اور کتاب پڑھنے کو

اس کا دل چاہنے لگتا۔ یہ بات صحیح ہے' وہ سوچتی کہ کتابیں ایک بالکل ہی نئی دنیا سامنے کھول کر رکھ دیتی ہیں۔

کتابوں کی دکانوں میں جانے کی عادت اسے اس گھر میں آ کر پڑی تھی۔ جب وہ کرائے کے گھر میں رہا کرتی تھی تو عموماً چاول چولہے پر چڑھانے کے بعد' وہ اردگرد پڑا ہوا اخبار کا کوئی ٹکڑا دیکھنے لگتی یا کسی کتاب یا رسالے کے صفحے ــــــ جو لفافے کی شکل میں اس کے ہاتھ لگتے ــــــ پڑھنا شروع کر دیتی۔ کبھی کبھی پڑھی ہوئی کتابوں میں موجود لوگوں کی آوازیں اسے سنائی دیتیں' اس میں ایک نئی توانائی پھونک دیتیں لیکن اسے بے چینی بھی محسوس ہوتی لیکن کیوں؟ یہ اسے علم نہیں تھا۔

اس کا شوہر حد درجہ سرد مزاج ہو گیا تھا۔ وہ ہنسنا بھول گئی تھی اور زیادہ تر خاموش رہنے لگی تھی۔ وہ اگر کچھ کہتی بھی تو اس کا شوہر اس کی بات سننا گوارا نہ کرتا۔ شوہر کی مخصوص خاموشی اسے حد درجہ اذیت دیتی۔ اکثر اوقات وہ اس کے آگ بگولا ہونے کی وجہ تک سے لاعلم ہوتی۔ سالن میں نمک تیز ہو گیا تھا؟ اس کی دھوئی ہوئی جرابیں اتنی گندی تھیں کہ انہیں پہنا ہی نہیں جا سکتا تھا؟ پچھلی رات' کچن کی کھڑکی کھلی رہ جانے کی وجہ سے' بارش کا پانی اندر آ گیا تھا' وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی کہ آخر کون سی وجہ تھی جس سے اس کے شوہر کا موڈ خراب ہو گیا۔ بالآخر' وہ اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھی اور اس کے سامنے' غیر یقینی کیفیت کا شکار رہنے لگی۔

''کبھی میرے بارے میں بھی سوچتی ہو؟'' ایک شام اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ''کبھی یہ خیال آیا کہ میں بھوکا ہوں گا یا میں کیا چاہ رہا ہوں؟'' یہ درشت اور نوکیلے الفاظ گویا اس کے دل میں پیوست ہو گئے۔ اس وقت آٹھ بجے تھے اور تھوڑی ہی دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ اسے بھوک نہیں لگ رہی۔ اسے پتہ تھا کہ یہ غصیلا لہجہ کسی نئی آفت کی پیش بندی ہے۔

''کھانا کچن میں پڑا ہے۔ اپنی مدد آپ کرو۔'' اس نے زیر مطالعہ کتاب کو زور سے بند کرتے ہوئے سرکشی سے کہا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ آخری بار' انہوں نے آرام اور سکون سے' کب بات کی تھی؟ اپنے تعلقات کے متعلق جتنا وہ سوچتی' اتنا ہی غصے کی آگ اس کے ذہن میں بھڑکتی جاتی۔ ''میں نے کتنی دفعہ پوچھا تھا کھانے کیلئے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ بات کافی پہلے کی ہے۔ تمہیں علم ہے' مجھے یہ قطعی پسند نہیں۔ ان دنوں سوائے کتابیں پڑھنے کے' میں نہیں سمجھتا تم کوئی اور کام بھی کر رہی ہو۔''

''جب ہم سکول میں اکٹھے پڑھتے تھے تو کیا ہم برابر نہیں تھے؟ کیا ہم کا پیاں مل جل کر استعمال نہیں کرتے تھے؟ اور اب کیا ہو گیا؟ کھانے' کپڑے' گھر کا کام کاج! اس کے علاوہ کبھی کوئی بات کی تم نے۔تم نے مجھے سونی کی ملازمہ بنا کر رکھ دیا ہے۔تم کبھی اس کے سامنے' مجھ سے اس کی ماں کی طرح پیش آئے۔اس کے بجائے تم کہہ رہے ہوتے ہو: پانی لاؤ میرے لئے' سنا نہیں تم نے؟ میں نے کہا تھا میرے لئے پانی لاؤ۔'' اس نے انتہائی نفرت انگیز لہجے میں اپنے میاں کی نقل اتاری۔ ''غور سے سنو' میں ایک اچھی گرہستن عورت ہوں' ممکن ہے کہ میرے معیار بہت اعلیٰ نہ ہوں لیکن میں دوسری عورتوں کے مقابلے میں کم بھی نہیں۔ میں کام کاج اچھے طریقے سے نمٹانے کی کوشش کرتی ہوں' اس لئے ہم مہذب لوگوں کی طرح گزر کر سکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہمارے پڑوسی ہمیں جانور سمجھنے لگیں۔تم کسی آئیڈیل گرہستن سے میرا موازنہ کیوں کرنا چاہتے ہو؟ کیا میں نے کبھی کسی آئیڈیل شوہر کے ساتھ تمہارا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' تم ہی صحیح ہو۔تم سے اچھی گرہستن کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔''

''سنو—— میری بات کا یہ مطلب نہیں۔''

''نہیں' تم بالکل صحیح ہو' تم اچھی ہو' تم بہت ہی اچھی ہو—— اپنی حد تک' جو کام بھی تم اپنے لئے کرتی ہو' واقعی اچھا کرتی ہو لیکن اس وقت تک' جب تک یہ کام تمہارے لئے ہو رہا ہو' میرے لئے نہیں۔'' اس طرح بات بڑھتی چلی گئی۔ دونوں میں کوئی کسی کی بات سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ نتیجتاً شدید ہنگامہ اور——!

پھر اچانک ایک رات' دونوں کے دل میں چھپی محبت جاگ اٹھی۔شوہر نے حیرانی سے کہا ''تم مجھ سے پیار کرتی ہو——اب بھی مجھے چاہتی ہو—— کتنی دلکشی ہے اس تصور میں!''

رات کو مدہم روشنی میں' جب اس نے اپنے شوہر کو سوتے دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کا شوہر بھی تنہائی اور محرومی کا شکار ہے۔ایسے موقعوں پر اس کے دل میں' اپنے شوہر کیلئے شدید محبت کے جذبات جاگ اٹھتے۔ وہ سوچتی' میں اپنے شوہر کو حتی المقدور محبت دوں گی' ہر طرح اس کا خیال رکھوں گی اور اس کے دکھ درد میں شریک رہوں گی۔

لیکن ہوتا یہ کہ جلد ہی زندگی کی تلخ حقیقتوں کا منحوس چکر دوبارہ انہیں اپنے جال میں پھنسا لیتا۔کبھی کوئی غلطی ہوئی' کوئی نقصان ہو گیا۔اب چاہے اس میں بیوی کا کوئی قصور ہو یا نہ ہو'

شوہر اسے بخشنے کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ وہ گندگی اور غلاظت سے بری طرح الجھتا تھا۔عورت کو جب اس حقیقت کا احساس ہوتا کہ شوہر کی انا مجروح ہوئی ہے تو وہ خود پر نادم ہوتی۔اپنے آپ کو ناکارہ اور بدتمیز سمجھنے لگتی۔ایسے موقعوں پر قدرت ہی اس کی آسودگی کا باعث بنتی۔سونی کی شکل میں' اسے جینے کی امید نظر آتی۔ وہ اپنی بچی کیلئے کپڑے سینے لگتی' اس کو بہلانے کے جتن کرتی۔ دراصل وہ خود کو ناامیدی اور یاس کے دائرے سے نکالنے کی کوشش کر رہی ہوتی تھی۔ بچی کو بنانا سنوارنا' اس کی پونی ٹیل بنانا' فارغ وقت میں درخت کے نیچے جا بیٹھنا یا تالاب کی پرسکون لہروں کو حیرت اور تعجب سے دیکھنا—— یہ سب اپنی تکالیف اور دکھوں سے گریز کی کوششیں ہی تو تھیں۔

وہ جب کبھی کوئی کتاب خریدتی تو اس کے اندرونی صفحے پر تاریخ خریداری ڈال دیا کرتی۔ جب سونی جوان ہو جائے گی اور وہ ان کتابوں کو پڑھے گی—— وہ سوچتی—— کتنا اچھا لگے گا! وہ یقیناً زیادہ فراخ دل ہوگی اور اس کی حقیقی دوست بھی۔بعض اوقات وہ سوچتی کہ اپنا علم سونی کو منتقل کرے۔ وہ سونی کو دنیا کی وسعت اور نیرنگی کے متعلق بتائے۔ یہ بھی بتائے کہ دنیا نے اسے کیا دکھ دیئے' کتنی پریشانیاں دیں۔ ایسے وقت' وہ اپنی بچی کے ساتھ' گھنے درخت کے نیچے لیٹ جاتی۔ اسے گرتے پتوں کا مشاہدہ کراتی' اور نیوٹن کے کشش ثقل کے قانون کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتی۔ بارش ہو رہی ہوتی تو وہ سونی کو لے کر برآمدے میں بیٹھ جاتی۔ اسے بتاتی کہ بجلی چمکنے کے بعد' گرج چمک کی آواز کیوں آتی ہے۔کبھی فکر آمیز انداز میں بچی کو آگ سے کھیلنے یا سڑک پر گاڑیوں کے قریب جانے سے منع کرنے لگتی۔

جب کبھی وہ اپنی ناخوشگوار شادی پر نظر ڈالتی تو اسے شدید ناکامی اور مایوسی کا احساس ہوتا۔ وہ زندگی میں کوئی مقصد بھی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ تمام مادی ضروریات کیلئے وہ اپنے شوہر کی محتاج تھی۔ اسے لگا کر شادی کے بعد کا ہر لمحہ اس کی مسلسل ہار کا لمحہ تھا اور ہر اگلے قدم پر' وہ مزید اپنے گھر میں محدود ہوتی چلی گئی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ہمراہ' اکیلی زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس کی روحانی قوت ہر آنے والے دن سکڑتی چلی گئی اور بالآخر اس نے اپنی بدقسمتی سے سمجھوتہ کر لیا۔ اس کا شوہر بھی ناامیدی کا شکار ہو گیا۔ دکھ اور مایوسی اس کے چہرے پر نظر آنے لگے تھے۔ وہ کبھی کبھی اس کی غمزدگی کو بری طرح محسوس بھی کرتی مگر خود کو بے حوصلہ اور کم ہمت پاتی۔ شوہر کی موجودگی میں تو اس کے حواس ہی جواب دے جاتے۔

فلم میں ایک صاف ستھری، پرسکون پتھریلی سڑک نظر آ رہی تھی۔ واز یک کی بیوی پڑوس کی لڑکیوں کو ایک بہت پرانی کہانی سنا رہی تھی۔ وہ بہت ہی غریب تھی، ساری فلم میں اس نے ایک ہی لباس پہنے رکھا۔ فلم واز یک کے بارے میں تھی اور اس کی بیوی کا کردار بہت معمولی نوعیت کا تھا لیکن قریب کے سینما میں بیٹھ کر یہ فلم دیکھتے ہوئے اس عورت کو یوں لگا جیسے یہ غمزدہ کردار خود اسی کا ہے۔ جب وہ گھٹنوں کے بل جھکی فرش رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی تو اس نے فلم کے اس کردار کے دکھ اور اندرونی بے چینی کی شدت کو بری طرح محسوس کیا۔ واز یک کی بیوی عادتاً کہانی سنانے میں مصروف تھی کہ واز یک شدید غصے میں وہاں دندناتا ہوا آیا اور اسے گھسیٹتا ہوا قریب کے ایک خالی کھیت میں لے گیا جہاں جھاڑیوں اور جھاڑ جھنکار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دھوپ کی شدت سے زمین جھلس رہی تھی۔ وہاں اس نے اپنی بیوی کو بری طرح زدوکوب کیا۔ اس کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا اور بالآخر وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسی۔

فلم دیکھنے کے بعد، وہ ذہنی پریشانیوں میں گم، کہر آلود راستے سے ہوتی، آہستہ آہستہ اپنے گھر آئی لیکن گھر کے داخلی راستے پر موجود جوتوں کے نشانوں نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس کے شوہر کے جوتوں کے ساتھ کسی اور کے جوتوں کے نامانوس نشانات بھی تھے۔ سونی اور پڑوسن لڑکی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ آخر کیا وجہ ہوئی کہ اس کا شوہر دن دہاڑے گھر واپس آ گیا؟ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اس غلطی کی زبردست سزا کا سامنا اسے کرنا پڑے گا۔ مزید شور شرابہ اور ہنگامہ۔ اسی وقت، اس نے کسی کی آواز سنی۔ ''مہینے میں ایک بار ان عورتوں کی اچھی طرح سکائی ہوتی رہنی چاہئے تا کہ یہ زیادہ ہوا میں نہ اڑیں۔ اس میں ہرج کی کوئی بات نہیں —— یہ تو ایک ناگزیر عمل ہے۔'' تو دوسرے جوتوں کے نشان اس کے شوہر کے کزن کیانگ ہاک کے تھے۔ وہ ایک لمحے کو ہچکچائی۔ منظر پر طائرانہ نظر ڈالی اور واپس زینے سے ہوتی، اپنے پڑوس میں چلی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی شاہانہ محل میں آ گئی ہے۔ حسب توقع اس کی بیٹی بھی وہیں تھی۔ ''تمہارا شوہر کسی دوست کے ساتھ آ گیا تھا۔ سو میں سونی کو یہاں لے آئی۔'' پڑوسن لڑکی نے کہا۔

اس رات، اس کے شوہر نے اپنے کزن کے مشورے پر پوری طرح عمل کیا۔ اس نے اسے اتنی بری طرح زدوکوب کیا جیسے وہ اس کی ہر غلطی کی اصلاح اسی دن کرنا چاہتا ہو۔

''کیسی خبیث عورت ہے' اپنے شوہر کے بغیر ہی فلم دیکھنے چلی جاتی ہے؟ کسی سے بھی پوچھ لو ــــــ وہ تمہیں بتائیں گے ــــــ اپنی بچی کو بھی اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں؟''

''میں بیوی ہوں' کوئی غلام نہیں۔'' اس نے درشت انداز میں جواب دیا۔

اس کا شوہر بھی بالکل واز یک کی طرح غضبناک ہو گیا۔ عورت اس کے ہاتھوں پٹتے ہوئے بھی اس کا غم و غصہ محسوس کر رہی تھی۔ اس کے اندر موجود دکھ اور کرب اسے دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں ہی تنہا کشتیوں کی طرح سمندر میں بھٹک رہے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنا چاہتے تھے لیکن کشیدگی کی انتہا نے انہیں بہت دور کر دیا تھا اور وہ ایک دوسرے کے قریب نہیں آ پا رہے تھے' اس لئے شیطانی چرخہ چلتا رہا' بالآخر' اس کے شوہر نے اسے ٹھوکریں مار مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔

اس کا شوہر خود بھی بری طرح دیوار سے جا ٹکرایا' اچانک اسے کوئی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے آواز کہیں باہر سے آ رہی ہے لیکن اس کی گونج اسے خود اپنے اندر پیدا ہوتی محسوس ہو رہی تھی ''تم اپنی بیوی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہو؟ لیکن اب وہ تمہاری پہنچ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ وہ تاریکی اور درد میں کھو گئی ہے۔ تمہارا اس کا تعلق ختم۔ اب وہ ہماری ہے' تمہاری نہیں۔''

''تم ہو کون؟'' شوہر بری طرح چلایا۔

''فطرت ــــــ ہوا' پانی' بادل۔''

''لیکن میں بھی تو تمہارا ہی ہوں؟''

''ہاں' بالآخر تم بھی ہمارے ہی ہو گے۔''

عورت عقبی برآمدے کی ڈھلان پر لیٹ گئی۔ زمین انتہائی سخت اور کھردری تھی۔ اس اندھیرے میں اسے صرف گھر کا عقبی حصہ دھندلاہٹوں کی لپیٹ میں دکھائی دے رہا تھا۔ اندر سے روشنی کی کوئی کرن باہر نہیں آ رہی تھی۔ ستاروں کی مدہم روشنی میں' درخت کا سایہ گھر کی چھت پر پڑ رہا تھا۔ اون ہوئی بھی انہی دکھوں کا شکار رہی ہو گی۔ اس نے سوچا اس کی کالج کی دوست نے بھی شادی کر لی تھی اور اس کے بعد وہ دونوں کبھی نہیں ملے تھے' نہ ہی اس نے اون ہوئی کے بارے میں کچھ سنا تھا۔ مجھے یقین ہے' شادی کے بعد وہ بھی مشکلات کا شکار رہی ہو گی۔ اس نے اس سے پہلے کسی بھی عورت کے بارے میں یا پڑوسن عورتوں کے متعلق اس انداز

میں نہیں سوچا تھا۔

ماحول خنکی کی شدید لپیٹ میں تھا۔خزاں کی آمد آمد تھی۔ ''کیا کروں میں؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔سب بکواس ہے! میں زخم خوردہ ہوں —— میں بے پناہ دکھوں کا شکار ہوں' میں ناخوش ہوں' اف میرے خدا! میرا سر!''

اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا' اسے اپنے کانوں میں نامانوس سی آواز سنائی دے رہی تھی: ''تمہارے سر میں درد ہے' میرے سر میں درد ہے۔'' عورت اپنے پیروں کو سنبھال کر کھڑی ہونے لگی۔آواز پھر سنائی دی۔ ''تمہارے سر میں درد ہے' میرے سر میں درد ہے۔''

''کیا کسی اور کے بھی سر میں درد ہے؟'' عورت حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ''یہ کون ہوسکتا ہے جس کے سر میں' میری طرح درد ہے۔'' وہ بوجھل دماغ لئے' مسلسل وہی آواز سن رہی تھی۔ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ درخت کے پاس سے' وہ درخت کے قریب چلی گئی۔ وہاں بھی اسے وہی آواز سنائی دی۔کہیں آواز گیٹ سے تو نہیں آ رہی۔ وہ بھاگتی بھاگتی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ''تمہارے سر میں درد ہے——''

یہ آواز کہاں ہوسکتی ہے؟ آخر کہاں سے آ رہی ہے؟ اور کون ہے جو درد کی شکایت کئے جا رہا ہے؟ کون ہے جو میرے پھٹتے ہوئے درد کی کیفیت سمجھ سکتا ہے؟ آواز کی تلاش میں' وہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے احاطے میں' ماری ماری پھر رہی تھی۔

اگلی صبح ضرورت سے زیادہ سردی تھی۔ پڑوسیوں نے عقبی باڑ کود کر' اس کی یخ بستہ لاش تالاب میں سے نکالی۔انہوں نے ہی تابوت اور تجہیز و تکفین کے منتظم کو بلایا۔

سورج کی روشنی چھن چھن کر برآمدے میں آنے لگی۔اس کا شوہر بے یقینی اور اداسی کی کیفیت میں خاموش' وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سب خواب ہے۔اس نے سوچا: میری بیوی حسب عادت چیختی چلاتی میرے سامنے آ کھڑی ہوگی۔اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہوگی' جو وہ غصے سے میرے ہاتھ میں تھما دے گی۔ظاہر ہے' رات کے واقعے سے' اس کا منہ پھولا ہوا ہوگا۔ چلو ٹھیک ہے' کوئی بات نہیں۔ وہ اس کے چیخنے' شور مچانے یا کسی چیز کے زور سے فرش پر پھینکنے کا برا نہیں منائے گا۔لیکن اس کی بیوی عقبی کمرے میں بے جان پڑی تھی۔ حقیقت یہی ہے اس نے خود کو سمجھایا۔اب کیا کیا جائے۔اس نے اپنا ہاتھ نگاہوں کے سامنے رکھا اور قسمت

کی الجھی لکیروں کو دیکھنے لگا۔ پڑوسن لڑکی سونی کو اپنے گھر لے گئی تھی۔ پڑوسی تکفین کے ادارے سے پہلے ہی رابطہ کر چکے تھے۔

پھر دوست رشتہ دار آنے شروع ہوئے۔ اس کے رشتہ دار' اس کی بیوی کی ماں' بہنیں اور دوسرے لوگ۔ بہت ہی خوفناک دن تھا۔ لوگوں کی آ رجار لگی رہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی میں ایسے لمحے کیوں آتے ہیں۔ ایسے لمحے' جن کے بارے میں آدمی نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا۔ اسی افراتفری میں دن کا گزرنا پتہ بھی نہیں چلا۔ کل یہی گھر کتنا اداس اور خاموش تھا اور آج اندر باہر روشنی ہو رہی ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہے اور سکوت نام کو نہیں۔ تعزیت کیلئے جمع ہونے والے بہت سے لوگ رات ہوتے ہی واپس جانے لگے۔ قریبی رشتہ دار وہیں ٹھہر گئے۔ ان میں سے کچھ سونے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ اس عورت کا شوہر عقبی کمرے میں گیا۔ وہاں اسے اپنی ساس آنسو بہاتی ملی۔ اسے دیکھ کر وہ ایک جانب کھسک گئی اور داماد سے بیٹھنے کو کہا۔ اس کی بیوی کی لاش تابوت میں رکھی تھی۔ تابوت کی اوپری سکرین دیکھ کر وہ بری طرح بے چین ہو گیا۔ جلتی ہوئی اگربتیوں کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔

اس نے' تصور ہی تصور میں' اپنی بیوی کو تابوت سے باہر نکالا اور جھنجھوڑ ڈالا۔ کیا اس نے واقعی خود کو مار ڈالا تھا—— اور وہ بھی معمولی سی بات پر؟ حالانکہ یہ سارا الجھاؤ اور انتشار اسی کا پیدا کردہ تھا۔ گر اس نے اسے ٹھوکریں مار کر باہر نکال بھی دیا تھا تو کیا ہوا؟ وہ اتنی بری طرح اس کے سر پر چڑھی ہوئی تھی۔ نوچ کھسوٹ رہی تھی' شور مچا رہی تھی۔ اگر اس نے اسے بری طرح زدوکوب کیا بھی تو کیا ہوا؟ اسے معافی مانگ لینی چاہیئے تھی۔ وہ کہتی کہ وہ آئندہ اس کا کہا مانے گی۔ ایک اچھی اور فرمانبردار بیوی کا رویہ تو یہی ہونا چاہیئے۔ اگر وہ اسے رو رو کر بلاتی تو کیا وہ اپنی بیوی کے پاس نہ جاتا؟ اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اندر نہ لاتا۔ اس کا دل تو اتنا بڑا ہے کہ فوراً ہی اپنی بیوی کو معاف کر دیتا۔ اور پھر' وہ اکٹھے بستر میں جا لیٹتے۔ اس نے آہ بھری۔

کیانگ ہاک کی بیوی سونی کو گود میں لئے نمودار ہوئی۔ یہ وہی عورت تھی جس کی تصحیح کیلئے' اس کا شوہر ہر مہینے اسے بری طرح زدوکوب کیا کرتا تھا۔ بچی نے وہی سبز جیکٹ اور قرمزی سکرٹ پہنا ہوا تھا' جو اس کی ماں نے پچھلے دنوں اس کیلئے بنایا تھا۔ اس نے بچی کے باپ کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''دیکھو' یہ رہے ابو' دیکھ لیا؟ وہ کہیں نہیں گئے۔'' سارا دن باپ

سے جدا رہنے کی وجہ سے بچی اس کی گود میں کسمسائی۔ وہ اپنے باپ کے پاس آنا چاہتی تھی مگر کیا تنگ ہاک کی بیوی نے اسے اور بھی دبوچ لیا۔ کہنے لگی۔ ''چلو اب چلتے ہیں۔تم تو اچھی بچی ہو' دوسرے بچے تو روتے ہیں' ضد کرتے ہیں مگر ہماری سونی بہت اچھی ہے' کیا پیارا چہرہ ہے' کیا سرخ سرخ ہونٹ ہیں!'' یہ کہتی ہوئی' وہ تیزی سے پلٹی اور بچی کو تھپکیاں دیتی ہوئی باہری احاطے کی طرف چلی گئی۔اسی دوران اس کی دو سالیاں اپنی بہن کے سامان' کپڑوں اور دوسری اشیاء کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

''اف خدایا! کیا ہو رہا ہے مجھے؟'' آدمی نے کہا اور تیزی سے اپنا سر دیوار میں دے مارا۔ پریشانی اس کے سر پر ناچ رہی تھی۔ایک بار پھر اس نے اپنا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس کی ساس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ساس کو کبھی اس سے کوئی انسیت نہیں رہی تھی مگر اس وقت وہ بری طرح بوکھلا گئی۔ وہ اپنے داماد کو دیوار سے سر ٹکرانے سے باز نہ رکھ سکی۔ٹھک' ٹھک' ٹھک!

''کیا کروں میں؟'' ساس حواس باختہ ہوگئی۔ پھر اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔''یہاں آؤ' دیکھو' یہ کیا کر رہا ہے! جلدی کرو!''

اس شخص نے اپنا سر پوری قوت سے دیوار میں مارا' جیسے اب اسے زندگی میں سر ٹکرانے کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہ ہو۔ٹھک' ٹھک' ٹھک——

باہر تالاب کی پرسکون سطح پر' چاند ستاروں کی روشنی میں' کچھ سائے سے نظر آئے' جیسے کچھ نوجوان ساتھی باہم کھڑے کورس کی شکل میں گا رہے ہوں۔

''تمہارے سر میں درد ہے' میرے سر میں درد ہے——''

ملگجے اندھیرے کا کھیل

اوچنگ ہوئی

خدا کی پناہ! مجھے یوں لگا جیسے میری نمائش ہو رہی ہے۔ دراصل ہمارے کچن کا دروازہ ٹی وی لاؤنج میں کھلتا ہے اور وہاں بیٹھے ہوئے کچن میں کی جانے والی ہر حرکت صاف نظر آتی ہے۔ میں مغربی طرز تعمیر کو دل ہی دل میں کوس کر رہ گئی۔ ہوا یوں کہ چاول ابل کو چولہے پر گر گئے۔ میں نے اسے اچھی طرح صاف کیا مگر پھر بھی اس کی اوپری اور سامنے کی طرف خاصے داغ دھبے بدستور میرا منہ چڑا رہے تھے۔ میں نے غصے میں آستین چڑھالی اور اس کی مزید صفائی میں جت گئی۔

چولہے کی یہ درگت پچھلے سال ابو کے ہاتھوں بنی تھی۔ انہیں کسی دوائی کی تیاری کا جنون چڑھا تھا۔ سوانہوں نے بڑی محنت سے بعض جڑی بوٹیاں تلاش کیں۔ سرخ پیٹ والے مینڈک لئے' سیاہ مٹر کے دانے منگوائے' زہریلے مینڈک کا تیل ڈھونڈ کر لائے اور پھر ان سب چیزوں کو ایک بڑی پرانی سی دیگچی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ گھنٹوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد' کولتار جیسا ایک ملغوبہ تیار ہو گیا' جو ان کے خیال میں خون کی صفائی اور قبض کے خاتمے کیلئے اکسیر ثابت ہوتا۔ دوائی کے فوائد تو خیر وہی بہتر جانتے ہوں گے لیکن اس کی تیاری کے دوران' یہ ملغوبہ بارہا ابل ابل کر چولہے کی سطح پر گرتا رہا تھا اور وہ انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ کسی قدیم کیمیا

دان کی طرح' اپنے کام میں لگے رہے تھے۔

دوا کی مخصوص بو' گھر کے کونے کونے میں پھیل گئی تھی۔ مینڈکوں کے گوشت اور ہڈیوں کے ملغوبے کی تلخ اور سڑی ہوئی بھاپ جہاں کہیں بھی پہنچی' درودیوار پر کسی لیس دار مادے کی طرح چپک کر رہ گئی۔ بعض اوقات ماحول میں بسی وہ بو اس درجہ میرے سر پر سوار ہوتی کہ مجھے ابکائیاں آنے لگتیں اور میں تیزی سے باتھ روم کی جانب دوڑ لگا دیتی لیکن وہاں شیشے میں اپنی شکل دیکھ کر اور بھی زیادہ بوکھلا جاتی۔ میرے چہرے پر شدید خارش کے آثار نظر آتے اور میری خشک جلد پر جھریاں پڑی دکھائی دیتیں۔

پچھلی سردیوں میں' یہ واقعہ کئی بار میرے ساتھ ہوا۔ اب چولہے کو صاف کرتے ہوئے' اس پر لگے داغ دھبے ——— جو وقت کے ساتھ دھندلا گئے تھے——— مجھے دہشت زدہ کر رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ یہ لیس دار ملغوبہ اپنے اصل عناصر کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک تھا۔

گزرے ہوئے کل کی طرح' آج بھی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کچن میں لٹکی گھڑی ساڑھے پانچ بجا رہی تھی۔ ایک برنر پر چاول ابل رہے تھے جبکہ دوسرے پر مچھلی تقریباً پک کر تیار تھی۔ سورج کی کرنیں مغربی کھڑکی سے کچن میں گھس رہی تھیں۔ چاپر کی چمکدار سطح اور کچن کیبنٹ پر رکھی مختلف چیزیں روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ سنک میں جمع پانی کے ساتھ سبزی اور گوشت کے ننھے ننھے ٹکڑے تک تیرتے نظر آ رہے تھے۔ میں پنجوں کے بل کھڑے ہوئے بغیر بھی' اس روشن کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر سکتی تھی۔ آج بھی حسب معمول' میں نے نوجوان مجرموں کو' کھیتوں میں کام کرنے کے بعد' واپس اپنے اصلاح خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ سرمئی رنگ کا مخصوص لباس اور اسی رنگ کی ٹوپی پہنے یہ لڑکے تعداد میں ستر یا اسی کے لگ بھگ رہے ہوں گے۔ یہ منظر دیکھ کر ہمیشہ میرے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ یوں لگتا جیسے میں نے ان ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپے جسموں کو چھو لیا ہو اور اندر مجھے راج ہنسوں کا کھردرا گوشت دکھائی دیا ہو۔ خدا جانے یہ تصور' جیل کی یونیفارم سے متعلق میرے پرانے خیالات پر مبنی تھا یا کھیتوں میں کام کرتے ہوئے' ہوا کے زور سے پھڑ پھڑاتے اور غبارہ بنتے کپڑے دیکھ کر' ذہن میں ابھرا تھا۔ وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے اور بدن سے غیر مطابقت رکھنے والے کپڑوں میں' اپنی آہستہ روی کے باوجود' مجھے سیمنٹ کے کسی بہت بڑے ایسے پہیے کی طرح پھسلتے ہوئے لگ رہے تھے' جس کا ایکسل ہی نہ ہو یا جیسے کوئی آوارہ گرد سیٹی کے ذریعے

کوئی غمناک دھن بجا رہا ہو۔

جیکٹ پہنے دو گارڈ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ایک آگے اور دوسرا ان کے پیچھے تھا۔ میں ان مجرموں کو قریب سے نہ دیکھ چکی ہوتی تو انہیں کسی قریبی فوجی کیمپ کے زیر تربیت نوجوان سمجھ کر نظرانداز کر دیتی اور میرے ذہن میں بغیر ایکسل کے بڑے سے پھسلتے پہیے کا تصور کبھی نہ آتا اور نہ ہی حیدز میرے تخیل کے پردے پر نمودار ہوتا' وہی حیدز جسے پچھلے جنم کے گناہوں کی پاداش میں' لامتناہی سفر کی سزا ملی تھی اور کوئی غیبی ہاتھ نشان منزل آگے پیچھے کرتا رہتا تھا۔

پہلی دفعہ' میں نے ان لڑکوں کو سڑک پر اس وقت دیکھا' جب میں اپنے کتے کے ساتھ' شام کی سیر کیلئے باہر نکلی ہوئی تھی۔ میں کچھ متعجب بھی ہوئی مگر پھر مجھے یاد آ گیا کہ چھوٹی پہاڑی کے قریب ہی ایک اصلاح خانہ موجود ہے۔ اسی لمحے' قطار میں موجود ایک لڑکے کی نگاہیں مجھے خود پر جمی نظر آئیں اور میں گھبراہٹ کے عالم میں' اپنے کتے کو کھینچتی ہوئی' وہاں سے ہٹ گئی۔ اس لڑکے کی عمر کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا مگر اس کی آنکھوں میں' مجھے عجیب سی دلکشی اور جاذبیت محسوس ہوئی۔ ممکن ہے یہ احساس محض اس لئے پیدا ہوا ہو کہ اس کی یونیفارم نسبتاً صاف ستھری اور نئی تھی یا شاید یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی ہو کہ ابھی میری عمر کوئی خاص زیادہ بھی نہیں ہوئی۔ شاید اس کے گول رخساروں پر چھائی زردی سے کوئی احساس جاگا ہو۔

لڑکا نظروں کے سامنے سے گزرا اور جلد ہی دستے کے دوسرے لڑکوں میں گم ہو گیا۔ بعد میں تو مجھے اس کے خدوخال تک یاد نہیں رہے۔ اگر ان لڑکوں کو قطار میں میرے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تو ان میں سے' اسے پہچاننا میرے لئے ناممکن ہی ہوتا۔ تاہم اس کی خوبصورت آنکھوں کی جاذبیت نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں ان کی آمد کے وقت کچن کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی' اس موہوم سی امید میں کہ شاید میں اسے پہچان سکوں۔

وہ میدان سے تقریباً نکل ہی چکے تھے کہ اچانک قطار کے عین درمیان کوئی خلل اندازی سی محسوس ہوئی۔ ایک لڑکا نیچے کو اس طرح جھکا جیسے اپنا جوتا ٹھیک کرنا چاہ رہا ہو۔ غالباً لڑکے کو زمین پر کوئی چمکدار چیز نظر آئی تھی' جو اس نے چپکے سے اٹھا کر' اپنی آستین یا جوتے کے اندر چھپا لی۔ اسی لڑکے کے رکنے کی وجہ سے پچھلے تمام لڑکوں کو بھی رکنا پڑا۔ قطار کے پیچھے موجود محافظ تیزی سے بڑھ کر' اس کی طرف آیا۔ لڑکا جلدی سے کھڑا ہو گیا اور اسے اپنے ہاتھ جھاڑ کر دکھانے لگا۔ گویا وہ خالی ہاتھ تھا۔ ان کے مابین دو تین جملوں کا تبادلہ ہوا لیکن ظاہر ہے' اتنی دور

سے وہ محض اشاراتی زبان ہی لگ رہی تھی' مجھے کیا سمجھ آتی!

محافظ واپس پیچھے چلا گیا۔ درمیان کے لڑکوں نے تیزی سے قدم بڑھا کر' اگلے لڑکوں کے ساتھ درمیانی فاصلہ کم کرنا شروع کر دیا۔ ممکن ہے وہاں کچھ بھی نہ رہا ہو لیکن وہاں کوئی چیز چمک کیسے رہی تھی جبکہ سورج کی روشنی میدان کے اس جانب پڑ ہی نہیں رہی تھی؟

سرمئی قطار قدم بڑھاتی' میدان سے نکل کر' پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ پہاڑی کی ڈھلان پر رہائشی مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بہت سے مکان ابھی زیر تعمیر تھے جبکہ بہت سے تکمیل کے مرحلے میں پہنچ چکے تھے۔ سرمئی قطار کے غائب ہوتے ہی ذہن کے پردے پر موجود پھسلتا ہوا پہیہ اور غمگین دھن کی گونج بھی خود بخود تحلیل ہو گئی۔

میں نے سنک کا ربڑ کھینچا تو پانی با آسانی نیچے جانے لگا۔ غالباً مستری دوپہر کو آ کر' سنک کی لائن صاف کر گیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا کچھ اس میں جا پھنسا تھا' عجیب سی بو آ رہی تھی۔ بہرحال اس وقت سنک صاف شفاف تھا۔ گھڑی چھ بجا رہی تھی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر کھانے کی میز پر تین چمچے اور تین چاپ سٹکس لا کر رکھ دیں۔ میز کچن کی دیوار کے بالکل برابر میں لگی ہوئی تھی۔ پھر اچانک میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ میں نے ایک چمچہ اور چاپ سٹکس اٹھا کر ٹرے میں رکھ دیئے۔ مجھے اچھی طرح پتہ تھا کہ بھائی آج شام بھی گھر سے غائب ہو گا' نامعقول عادت۔۔۔۔ میں نے خود کو بتایا۔۔۔۔ چلو کوئی حرج نہیں۔

''پیاری بچی! یہ نیل کنٹھ کس جانب منہ کر کے بول رہا ہے؟'' ابو نے پوچھا۔

میں نے میدان کی اس جانب ایستادہ ایک درخت کی جانب دیکھا' جہاں ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ مجرم لڑکے موجود تھے۔ وہ پرندہ اسی درخت کے زردی مائل خاکستری رنگ کے گھنے پتوں کی اوٹ میں تھا۔ ''میں اپنے کنٹیکٹ لینز اتار چکی ہوں۔'' ڈشوں کی جھنکار میں' میں نے جواب دیا۔ ابو کو پتہ تھا کہ لینز کے بغیر' میں واقعتاً اندھی ہو کر رہ جاتی تھی' لیکن انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''جس جانب سے اس کی آواز آ رہی ہے' وہاں تھوک دو۔ تم نے سن تو رکھا ہو گا کہ شام کو نیل کنٹھ کا نظر آنا اچھا نہیں ہوتا۔''

''میں نے کہا نا' میں ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکتی۔''

''کیا تم نے پھر کہیں اپنے لینز گم کر ڈالے ہیں؟ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ انہیں استعمال نہ کر رہی ہو تو پانی میں بھگو کر رکھا کرو؟''

میں جھوٹ بول رہی تھی۔ دراصل میں لینز پہنے ہوئے تھی۔ وہ پتلیوں پر ٹھیک اپنی جگہ موجود تھے اور مجھے دور درخت پر بیٹھا نیل کنٹھ بھی صاف نظر آ رہا تھا' جو ہماری طرف منہ کئے ہوئے گا رہا تھا۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں مجھے اس کے سیاہ چمکدار پر دکھائی دے رہے تھے اور اس کا پھیلا ہوا بدن فولاد کی طرح مضبوط لگ رہا تھا۔ میں نے ایک نگاہ ابو کی طرف ڈالی۔ وہ لاؤنج میں اپنی کرسی پر نیم دراز حالت میں براجمان تھے۔ وہاں سورج کی روشنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میں ان سے ناراض نہیں تھی۔ پھر میں نے شیلف پر رکھے ہوئے کیسٹ پلیئر کو آن کر دیا۔ میرے ذہن میں کوڈالی کے دلکش سر ابھی تک گونج رہے تھے لیکن کیسٹ پلیئر چلا تو میرے کانوں سے ایک ہلکی' نقاہت زدہ سرگوشی ٹکرانے لگی۔ میں سمجھی کہ پلیئر میں کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے لیکن اچانک ہی موسیقی کا شور ابھرا۔

میں نے یہ خوبصورت گیت آج ہی کلاسیکی ریڈیو سٹیشن پر' آپ کی فرمائش کے پروگرام میں سنا تھا اور اس کی دل میں جذب ہو جانے والی موسیقی کے ہاتھوں' میں اسے ریکارڈ کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ پرانا سا کیسٹ ریکارڈر بھائی کا تھا اور اس نے اسے بیکار سمجھ کر عرصہ پہلے الماری کی دراز میں پھینک دیا تھا۔ جب تک میں نے اسے الماری سے نکالا اور صاف کر کے آن کیا' اس وقت تک گیت کا ایک حصہ ختم بھی ہو چکا تھا۔ موسیقی میں کہیں کہیں رگڑ کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً یہ ریکارڈ خود بھی بہت پرانا رہا ہو گا۔ مجھے اسے ریکارڈ کرنا ہی نہیں چاہیئے تھا مگر اسے محض میری سستی اور کاہلی سمجھیں۔ میں نے ریکارڈ کا بٹن بند نہیں کیا اور گیت ریکارڈ ہو گیا۔ ساٹھ منٹ کی ٹیپ کی ایک سائیڈ بالکل صحیح حالت میں تھی۔

دس منٹ تک میں اپنا ریکارڈ کیا ہوا گیت سنتی رہی' پھر میں نے پلیئر کو آف کر دیا۔

''ڈنر تیار ہے۔'' میں نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ ذرا خشک رکھا۔

میں بغیر دیکھے بتا سکتی تھی کہ ابو اپنی کرسی سے اٹھے ہوں گے۔ پہلے انہوں نے اپنے کان پکڑے ہوں گے۔ پھر انگوٹھے پر دوسرے ہاتھ کے ناخن سے ہلکا سا دباؤ پیدا کیا ہو گا اور پھر ہاتھ دھونے باتھ روم کا رخ کیا ہو گا۔

باتھ روم کی پتلی دیوار کے دوسری جانب پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں کھانے کی میز پہلے ہی صاف کر چکی تھی۔ ایک بار پھر میں نے اسے اچھی طرح صاف کیا۔

ابو گیلے ہاتھ' باتھ روم سے نمودار ہوئے۔ ''تولیہ مل سکتا ہے؟''

''باتھ روم میں تولیہ لٹکا ہوا تو ہے۔''

''وہ گیلا اور گندا ہے۔''

یہ سفید جھوٹ تھا۔ میں نے پلمبر کے جانے کے بعد' نیا تولیہ وہاں لٹکایا تھا۔ نیلی کنٹھ ابھی تک' اسی درخت کی اونچی شاخوں پر بیٹھا' خدا جانے چیخ رہا تھا یا گا رہا تھا۔ ابو نے کھڑکی کی جانب گھور کر دیکھا۔ نیل کنٹھ کی آواز ان کے حواس پر چھائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''کچن کی کھڑکی ہی غلط سمت میں ہے۔ ڈھلتے سورج کی روشنی کو تو اندر آنا ہی نہیں چاہئے۔'' ابو بڑبڑائے۔

دو سال پہلے ابو کا آدھے سے زیادہ معدہ نکال دیا گیا تھا۔ اس وقت سے کھانے کا دورانیہ خاصا لمبا ہو گیا تھا۔ میں ذہنی طور پر خود کو تیار کرتی تھی کہ انتہائی آہستہ کھانا کھاؤں گی مگر عملاً میں اپنا سارا کھانا چٹ کر جاتی جبکہ ابو اپنا مختصر سا کھانا بھی ختم نہیں کر پاتے تھے۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور افق پر موجود اس کی باقی ماندہ کرنیں بھی سمٹنے کی کوشش میں تھیں۔ جلد ہی باہر سے آتی روشنی کی آخری کرن بھی لاؤنج کے اندھیرے میں ڈوب جاتی۔ میں ابو کو کھانا کھاتے دیکھتی رہی۔ ہر لقمے کے ساتھ' ان کے جبڑوں کی حرکت' چہرے پر پڑی جھریوں اور گردن کے گرد لٹکی کھال' گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں ایک عجیب سا تصور دے رہے تھے۔ ہلکی سی تشویش اچانک میرے پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑا گئی۔ ایک دن میرے اپنے چہرے کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوگا——

خزاں کے دن بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ ادھر آپ نے سورج ڈوبتے دیکھا اور دوسرے لمحے ہر طرف اندھیرا چھانے لگا۔ ''لائٹ جلا دوں؟'' میں نے مچھلی کی ڈش ابو کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''سوپ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔''

میں نے چولہا جلایا اور سوپ گرم ہونے رکھ دیا۔ برنر کی نیلی روشنی' کچن کے ملگجے اندھیرے میں مجھے کسی جادوئی شعلے کی طرح لگی—— برفاب سی روشنی جیسے کسی نیلے فولاد کا عکس پڑ رہا ہو۔

تاریکی میں ابو کا چہرہ کچھ زیادہ ہی دکھی لگ رہا تھا۔ ان کی پتلی نوکیلی ناک کا سایہ خاصا بڑا محسوس ہوا۔ میں ایک لمحے کو لرز کر رہ گئی۔

میں نے میز پر' ابو کیلئے گرم سوپ رکھا اور انتہائی خاموشی سے وہاں سے اٹھی اور جا کر کیسٹ پلیئر کا بٹن آن کر دیا۔ ابو نے سر اٹھا کر گویا دو متصادم سازوں کا پس منظر سمجھنے کی کوشش کی اور پھر سر جھٹک کر سوپ پینے میں مصروف ہو گئے۔ موسیقی کی ایک اور دھن سنائی دینے لگی۔ ابو آہستہ آہستہ اپنے کام سرانجام دیتے رہے۔ ان کے کھانے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کوئی جانور اپنے چارے میں لمحے بھر کو منہ مارے اور پھر دیر تک' اس کی جگالی کرتا رہے۔ ریکارڈڈ موسیقی ختم ہو گئی تاہم ٹیپ ابھی چل رہی تھی۔ کون اٹھ کر پلیئر کو بند کرے۔ ٹیپ ختم ہوتے ہی' بٹن خود بخود آف ہو جائے گا۔

ابو نے کھانا ختم کرتے ہی زوردار ڈکار لی اور گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''تھوڑا سا پانی چاہئے۔'' میں گلاس میں پانی بھر رہی تھی کہ چلتی کیسٹ میں سے گہری اور بامعنی آواز برآمد ہوئی۔ ابو نے حیرت سے اپنی نگاہیں پورے لاؤنج میں گھما ڈالیں۔ بھرائی ہوئی آواز ''دھواں دھار شام'' کے پروگرام والی تھی مگر اس کے الفاظ بڑے صاف اور واضح انداز میں کانوں میں ٹکرانے لگے۔ —— ''اس کے کوئی مشاغل نہیں۔ بولنے کا اسے شوق نہیں' زندگی میں بس ایک ہی چیز اسے اچھی لگتی ہے اور وہ ہے بندوق۔ جب پوری دنیا نیند کی آغوش میں ہوتی ہے' وہ بے لباس ہو کر اپنے بستر پر آلیٹتا ہے اور پانچ گولیوں سے بھرا ریوالور اپنے سرہانے رکھ لیتا ہے۔ یہ کام کرتے ہوئے' مکمل آزادی اور تھوڑی بہت اذیت کا احساس اسے ہر شے سے زیادہ پیارا لگتا ہے' ممکن ہے یہ آزادی نہ ہو' لیکن بس' یہ اس کا کھیل ہے۔ وہ اپنی انگلیاں ریوالور کے ٹرائیگر پر جماتا ہے اور اس کے دبا دینے کے بارے میں سوچتا ہے —— اگر کوئی شخص غیر متوقع طور پر کمرے کے اندر آ گیا یا اگر کسی کی نگاہیں' کسی جانب سے' اس کی نگرانی کرتی نظر آ گئیں یا ممکن ہے کسی مچھر نے اس کی کمر میں بری طرح کاٹ لیا —— تو میرے دماغ کی شریانوں میں ہزاروں لاکھوں وولٹ کا کرنٹ دوڑنے لگے گا ——''

آواز ختم ہوئی اور ساتھ ہی بولنے والا بھی غائب ہو گیا۔ میں اور ابو میز کے گرد پڑی تیسری خالی کرسی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پلیئر کی خالی ٹیپ اب بھی چل رہی تھی۔ میں نے ابو کے گلاس میں پانی بھر دیا۔ چند لمحوں کے بعد' مجھے احساس ہوا کہ یہ آواز میرے بھائی کی تھی۔ حیرت ہے' ٹیپ کے ذریعے اس کی آواز اتنی صاف اور واضح آ رہی تھی۔ لگ یوں رہا تھا جیسے کسی مرے ہوئے آدمی کی روح' انتہائی عجیب افراتفری کی کیفیت میں بات کر رہی ہو۔

میرا بڑا بھائی اکثر اپنی لکھی ہوئی چیزوں کو ریکارڈ کر کے سنا کرتا تھا لیکن یقین اس لئے نہیں آ رہا تھا کہ وہ سننے کے بعد ریکارڈ شدہ ٹیپ کو صاف کر دیا کرتا تھا۔ ٹیپ اپنے اختتام تک پہنچی اور پلیئر کا بٹن خود بخود بند ہو گیا۔ ''لائٹ جلا دوں ابو؟'' میں نے اندھیرے میں آنکھیں جھپکاتے ہوئے محتاط انداز میں پوچھا۔

ٹیبل لیمپ روشن کرتے ہی' میز روشنی میں نہا گئی مگر کمرے کی دوسری اشیاء فریج' ٹی وی' کیسٹ پلیئر' دیوار پر لگے خوبصورت وال پیپر پر ہلکا سا اندھیرا چھا گیا۔ لیمپ کے اطراف میں پھیلتے سائے ماحول کو ایک نیا رنگ دے رہے تھے۔

ابو کھنگارتے ہوئے اٹھے اور کمرے سے تاش کی گڈی اٹھا لائے۔ میں میز کی صفائی کر رہی تھی۔ انہوں نے میرا انتظار کئے بغیر' کیلے ہی کوئی کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ موٹا اونی سویٹر پہنے ہوئے تھے اور عقبی دیوار پر ان کا سایہ کسی جن کی شبیہ کا تصور پیش کر رہا تھا۔

''شام کی تاریکی بھی چھا گئی۔ دن بھر کی قسمت کا حال' اب جاننے کا فائدہ؟'' میں نے میز سے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اندھیرا تو ہو گیا لیکن دن تو ابھی ختم نہیں ہوا' یا ہو گیا۔''

ابھی ختم نہیں ہوا! اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ ابو کے بعض عام سے فقروں میں پوشیدہ مفہوم کی تلاش میں' میں بعض اوقات خاصی زچ ہو جاتی تھی۔ میں برتن دھو کر فارغ ہوئی' ایپرن اتارا اور ان کی جانب پلٹی۔ ابو نے بکھرے ہوئے پتوں کو ایک گڈی میں سمیٹ لیا۔

''کیا ملا آپ کو؟''

''وہی ملاقاتی!'' انہوں نے جذبات سے عاری لہجے میں سیدھا سا جواب دیا۔

''کچھ پھل لاؤں آپ کیلئے؟''

''نہیں' البتہ کافی پینا چاہوں گا۔'' ان کی آنکھوں میں تشویش جھلک رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ میں فوراً وہاں بیٹھ جاؤں۔ چائے کا برتن چولہے پر رکھ کر' میں ان کے سامنے آ بیٹھی۔

''پہلا پتہ لینا چاہو گی؟''

''بالکل نہیں' بانٹنے کیلئے' پہلے پتے کاٹنا ہوں گے۔'' میں نے گڈی کو بالکل نیچے سے

کاٹ دیا۔ اوپر کا کارڈ اٹھایا تو وہ پان کا جوکر تھا' ابو نے اگلا کارڈ کھولا ـــــ وہ اینٹ کی ستی تھی۔ سو کارڈ ابو کو بانٹنا پڑے۔ کارڈ انتہائی بوسیدہ اور خستہ حالت میں تھے۔ انہیں باہم ملانا اور بانٹنا بھی ایک دردسر تھا۔ تاہم انہوں نے ایک ایک کر کے' دس دس کارڈ بانٹ دیئے۔ میں نے اپنے کارڈ اٹھا لئے اور انہیں ترتیب دینے لگی۔ ابو نے بھی اپنے کارڈ اٹھا لئے' تاہم ان کی نگاہیں بدستور میری جانب اٹھی تھیں۔ میں نے ہڑبڑا کر پوچھا ''ہم رمی ہی کھیل رہے ہیں نا؟''

''ہوں'' ان کے ہونٹ بڑی مشکل سے کھلے۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ میرے تاش غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ کارڈ برسوں سے ہمارے پاس تھے اور اگر ذرا احتیاط اور غور سے دیکھا جاتا تو انہیں ان کی پشت سے بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں ہنس پڑی۔ یہ فائدہ تو مجھے بھی حاصل تھا۔ تاش اتنے خستہ تھے کہ انہیں سنبھالنا اور اپنی جگہ سیٹ کرنا بھی کاردارد تھا۔

''میرا خیال ہے' اب ان کی جان چھوڑ ہی دی جائے تو بہتر ہے۔'' میں نے ابو کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کھسیا گئے۔

''میں تمہارے چہرے سے اندازہ لگا رہا تھا کہ تمہارے پتے کتنے اچھے ہیں۔''

میں نے اینٹ کا یکہ نیچے پھینک دیا اور گڈی میں سے ایک پتہ اٹھا لیا۔ میری ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ میں رمی میں چھوٹے پتے لگاتی ہوں۔ دوسرے ابو اگر یہ پتہ اٹھاتے تو میں اینٹ کا بادشاہ روک لیتی۔

''پانی ابل رہا ہے۔'' ابو نے پتے لگانے شروع کر دیئے تھے مگر میں ان کی جانب نہ دیکھ سکی کیونکہ چولہے پر رکھا پانی ابل ابل کر باہر گرنے لگا تھا۔ میں نے' پہلے سے رکھے کپوں میں اسے انڈیلا اور کافی بنانا شروع کر دی۔

''میرے کپ میں سکرین ڈالنا۔'' ابو نے مجھے یاد دلایا۔ مجھے یہ بات کبھی نہیں بھولتی تھی مگر ابو اس بہانے' میز پر پڑے میرے پتوں پر چور نگاہ ڈال رہے تھے۔ ابو عرصے سے ذیابیطس کے مریض ہیں۔ بلاناغہ انسولین کا انجکشن لگواتے ہیں۔ تمام سردی' وہ اپنی تیار کردہ عجیب و غریب دوائی استعمال کرتے رہے لیکن روزانہ صبح کو ٹوائلٹ میں زرد پیشاب کی باقیات کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ انتہائی اداسی کے عالم میں' ابو ٹمس پیپر کا ایک ٹکڑا' انتہائی احتیاط سے اس میں بھگو کر رکھ لیا کرتے تھے۔ میں اس مشق کا مقصد کبھی نہ سمجھ سکی۔

میں نے کافی کا کپ ان کے سامنے رکھ دیا۔ تب انہوں نے میز پر سے کارڈ اٹھایا اور

پان کا جو کر نیچے پھینک دیا۔ ان کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کا مطلب ہے، وہ چوسر لگا چکے تھے۔ ''کیوں بھئی؟ کچھ لگانا ہے یا یونہی کھیلو گی۔''

''جو چاہے لگا لیں۔''

خزاں کی راتیں بہت طویل ہوتی ہیں اور انہیں کاٹنا کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ تاش کے کھیل میں دلچسپی پیدا کرنے کیلئے ہم عموماً کچھ نہ کچھ رقم بھی لگا لیا کرتے ہیں۔ کھیل میں انہماک وقت کو بڑی تیزی سے گزار دیتا ہے۔ اوپری منزل پر کسی کے ٹہلنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی چھوٹے بچے کے رونے اور اس کی ماں کے لوری سنانے کی آوازیں ـــــ باہم گڈ مڈ ـــــ ہمارے کانوں میں پڑنے لگیں۔ ماں اپنے بچے کو بہلا رہی تھی۔ کھڑکی کسی کاربن پیپر کی طرح سیاہ نظر آ رہی تھی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی کے باوجود، یوں لگا جیسے میں اور ابو دونوں ہی تاریکی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں اور نہ جانے، اسی طرح تاش کھیلتے کھیلتے، کتنا عرصہ بیت گیا ہے۔ شاید بچپن سے، ہم اس طرح بیٹھے کھیل رہے ہیں، دھندلی سی یادیں، آپس میں بری طرح گڈمڈ، بچپن کے معصوم اور انجان خواب، دور دور تک اپنی سرسبز اور شاید گنجلک شاخیں پھیلائے، کبھی مجھے خوشی کی کیفیت سے ہم کنار کرتیں اور کبھی سراسیمگی سے۔ سنا ہے جب کوئی جواری کسی مشکل میں آ پھنستا ہے تو وہ باتھ روم کی طرف دوڑ لگاتا ہے۔ بھائی بھی کئی بار اسی طرح اپنی کرسی سے اٹھ کر بھاگ جایا کرتا تھا۔

''کسی بچے کا رات کو یوں چیخنا چلانا اچھا شگون نہیں ہوتا۔ جب بچے اس طرح ڈکراتے ہیں تو خاندان میں کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جاتا ہے۔'' ابو نے کہا۔

میں نے میز پر سے پتہ اٹھایا۔

''کیا کہا آپ نے، میں بھی چیخا کرتی تھی۔'' میں نے اینٹ کا بادشاہ نیچے گرایا۔ شب بخیر، میری بچی! اس سے پہلے کہ صبح کا اجالا ہو، شب کی آغوش میں نیند کے مزے لے لو۔

''تمھاری امی کی آواز بڑی پیاری تھی۔''

یہ سچ ہے وہ کنڈرگارٹن کی ٹیچر تھیں اور انہیں بچوں کے کئی گیت زبانی یاد تھے۔ انہیں اپنی آواز کی خوبصورتی اور سریلے پن کا علم تھا۔ اس لئے وہ گا کر خود بھی لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔

میری ننھی سی یہ بچی، کبھی دوڑے، سنہری تتلیاں پکڑے، کبھی یہ چاند تاروں کی طرف لپکے۔

سنہری اور روپہلی دھاتیں بے وقعت ہیں تیرے سامنے لیکن

تری آنکھوں میں ہیرے جگمگاتے اور ستارے جھلملاتے ہیں
مری ننھی سی بچی! اپنی آنکھیں موند لے، کھو جا کہیں خوابوں کی دنیا میں!

"تمہاری باری ہے بھئی۔" ابو نے مجھے ٹوکا۔ میں چونک سی گئی، مجھے لگا جیسے ابو بھی میرے ساتھ وہی لوری سن رہے تھے۔ اوپری منزل پر عورت اپنے بچے کو لئے ٹہل رہی تھی، شاید بالکونی کے قریب وہ اسے ہلکورے دے کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ لوگ کوئی چار مہینے پہلے ہی اوپری منزل پر آئے تھے اور میں نے اس عورت کی آواز بہت کم سنی تھی۔ ہمارا ملنا جلنا بھی نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ اس کے اپارٹمنٹ کا راستہ عمارت کے باہر سے تھا۔ اس کا بچہ ان دنوں، رات کو سونے سے پہلے، اسے خاصا تنگ کر رہا تھا۔ تاش کھیلتے ہوئے ہمیں عموماً اس کے رونے اور ماں کے اس کو بہلانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی وہ ٹہل کر اسے بہلاتی اور کبھی گود میں جھلا جھلا کر اسے چپ کراتی۔ اس کے قدموں کی چاپ گویا ہمارے سروں پر دھمک پیدا کرتی محسوس ہوتی۔ اسکی نرم اور یکساں آواز کی لوری شاید بچے کو مطمئن نہیں کر پاتی تھی۔

میں نے میز سے تاش کا پتہ اٹھایا اور بے دھیانی میں ہاتھ سے کام کا پتہ پھینک دیا۔ ابو نے فوراً وہ پتہ اٹھالیا۔ پتہ انہیں لگ چکا تھا۔ انہوں نے گیم میز پر پھیلا دی۔

"لو بھئی گنواؤ، اپنے پوائنٹ۔" انہوں نے خوش مزاجی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ایک بار کی جیت سے پیٹ تو نہیں بھر جاتا۔" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"روشنی بہت کم ہے، ٹرانسفارمر نہ چلا گیا ہو؟"

"یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی آنکھیں زیادہ کمزور ہو رہی ہوں۔"

ہم بے حد بوسیدہ اور خستہ حال تاش سے کھیلے جا رہے تھے اور کھیل کے دوران باتیں بھی چل رہی تھیں۔ موسم کے بارے میں، آپس کے معاملات، ایک دوسرے کی صحت کے متعلق، دنیا بھر کی سنسنی خیز خبروں پر تبصرے۔ حقیقتیں اور افواہیں۔

میں نے اپنے پتے ابو کی طرف دھکیل دیئے۔ وہ انہیں اکٹھا کر کے شفل کرنے لگے۔ میں اس دوران ٹی وی کی طرف چلی گئی۔ ٹی وی آن کیا تو پردے پر آنے والی تصویر اتنی خراب آ رہی تھی کہ اسے نہ دیکھنا ہی مناسب لگا۔

''ٹی وی کیسے صحیح چلے' ہمارے پاس اتنی طاقت اور توانائی ہی نہیں' نہ جانے یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟''

''کیا یہ ہماری غلطی نہیں؟'' میں نے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا' ہاں غلطی تو ہماری ہی ہے۔ میں نے خود سے کہا۔

میری بچی! تیری آنکھوں میں ہیرے جگمگاتے ہیں' ستارے جھلملاتے ہیں—— امی اپنے بالوں میں پھولوں کا گجرا سجائے' یہ لوری مجھے اکثر سنایا کرتی تھیں۔

''چند بچوں کو بھی سنبھال نہیں پاتی تھی۔'' ابو نے کہا ''وہ چھوٹی سی تو عورت تھی۔'' پھر وہ پوچھنے لگے: آج اخبار میں کیا خبر تھی۔

''ایک یتیم خانے میں زبردست آگ لگ گئی۔ چند بچے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیسے کیسے خبیث لوگ یہ ادارے چلاتے ہیں' میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسے واقعات بھی سننے کو ملیں گے۔'' ابو ذرا جذباتی ہو گئے۔

''کیا یہ غلطی بھی ہماری ہے۔'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔ پھر خود ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ابو نے تاش کا پتہ میز پر سے اٹھایا تو ایک اور پتہ اس کے ساتھ اٹھا اور کھل کر میز پر گر پڑا۔ اس کا پلاسٹک آدھے سے زیادہ تاش سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

''بہت استعمال کر لئے یہ کارڈ' اب تو نئے کے بغیر کام نہیں چلے گا۔'' ابو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ان کا کہنا تھا کہ تمہاری ماں میں کسی بچے کی روح سما گئی ہے۔'' ابو نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ کیا بے ہودہ اور لغو نظریہ ہے! انہیں اس روحانی عامل کے پاس چھوڑنا ہماری غلطی تھی۔ میں نے سوچا۔ نہ وہ مبلغ تھا اور نہ شامان۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ کسی عورت کو درخت کی ٹہنیوں سے کس طرح زدوکوب کیا جا سکتا ہے۔ ''بچالو مجھے' اس خبیث سے بچالو' میری پیاری——'' امی گھر آنے کے بعد بھی ان مظالم کو اپنے ذہن سے کھرچ نہیں سکی تھیں۔

''یہ سب کچھ تمہارے ابو کے بے لگام طور طریقوں کی وجہ سے ہوا۔'' امی نے لڑکھڑاتے لہجے میں یہ حقیقت بڑے بھائی کو بتائی تھی۔ وہ اس وقت مڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ ہمارا نوزائیدہ بھائی بھی ساتھ ہی پڑا تھا۔ اس کا سر انتہائی لجلجا اور سوجا—— کسی پانی کے غبارے کی

طرح—— لگتا تھا۔اس کے چند دن بعد، میں سکول سے بمشکل اپنا بیگ سنبھالے گھر واپس آئی۔ بیگ کا سٹریپ ٹوٹ گیا تھا۔کھڑکی کے قریب آویزاں آئینے میں، امی اپنے بال کنگھی کر رہی تھیں۔

''بچہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پریشان نہ ہو، میں تمہیں پیاری سی گڑیا خرید کر لا دوں گی۔'' انہوں نے میری گردن کی پشت پر اپنی سرد، لرزتی انگلیاں رکھتے ہوئے کہا۔ہسپتال کی گاڑی جب امی کو لینے گھر آئی تو وہ بری طرح چیخ رہی تھیں۔''پیاری! میں نہیں جانا چاہتی، انہیں روکو! انہیں روکو گی انہیں۔'' چیختے چیختے وہ میز کے نیچے جا بیٹھی تھیں۔ پھر ہسپتال کے ملازمین نے انہیں کندھے سے پکڑ کر باہر کھینچا۔ وہ اس وقت تک چیختی چلاتی رہیں جب تک میری نظروں سے غائب نہیں ہو گئیں۔

''تم ہنس کیوں رہی ہو؟ بتاؤ نا۔'' ابو نے بہت دیر بعد مجھ سے پوچھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے، آپ نے امی پر ظلم نہیں کیا؟'' میں نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''تمہیں کیا پتہ؟ اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا، تم بہت چھوٹی تھیں اور مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ گھر میں اور کیا مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔تم نہیں جانتیں، اس نے اس بچے سے کیسے جان چھڑائی تھی؟ تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے کہ غلطی میری تھی حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔''

''آپ ان کی بہتر نگہداشت کر سکتے تھے۔''

''تمہاری امی وہاں زیادہ آرام سے ہے۔ وہاں اس کی سہیلیاں ہیں۔ایک خاندان کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوتا، جس طرح تم سوچتی ہو اور اگر ذرا گہرائی میں جا کر سوچو تو تم اپنی ماں کے قریب نہ ہونے کو اپنی خوش قسمتی گردانو گی۔ کیونکہ دوسری صورت میں تمہیں یہ شکایت ہوتی کہ وہ تمہاری شادی کے سلسلے میں ہونے والی ہر بات میں بلاجہ رکاوٹ بن جاتی ہے۔''

اس معاملے میں بہرحال میرا ردعمل خاصا درشت اور گستاخانہ تھا۔ابو تاش کے پتے میں پڑی کریز کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

''چلیں، تاش پھینٹیں اور بانٹیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری بات بھلا ٹالی جا سکتی ہے۔'' ابو نے گڈی اٹھائی اور بانٹنا شروع کر دی۔

''تمہاری پیدائش کے وقت ہی اس میں یہ جنونی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔'' ابو نے بتایا ''تم بھی اپنے بھائی کی وجہ سے بچ گئیں۔'' کارڈ پھر دوسرے کارڈ میں پھنسا اور پھسل کر میز پر گر

پڑا۔ ''کیا بکواس ہے' کیا کھیلے کوئی اس تاش سے؟'' انہوں نے دوسرا پتہ غصے میں میز پر پٹخا اور میری جانب دیکھا۔

''اگر میں کنگ میڈاس ہوتی تو یہی پتے لمحہ بھر میں نئے نویلے' چمکدار اور خوبصورت ہو جاتے۔'' میں نے میز سے پتہ اٹھایا۔ اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسا کوئی باہر میدان میں کھڑا سیٹی بجا رہا ہے۔ ساتھ ہی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتی ہوا میں مجھے خشک پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی محسوس ہوئی۔ نہیں' یہ محض میرا واہم ہے۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

''کیا بات ہے؟ پتے بہت برے آ گئے کیا؟'' ابو نے استفہامیہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔''

شاید اس بات کو دس سال گزر گئے یا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ۔ اب تو وہ محض خواب لگتا ہے۔ ایک انیس سالہ لڑکا مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر۔ میدان سے اس کی سیٹی کی آواز سن کر میں دروازہ کھولتی اور باہر نکل جاتی۔ وہ باہر کھڑا ملتا۔ خشک پھولوں کی خوشبو اردگرد پھیلی ہوتی۔ پھر اس کا آنا بند ہو گیا۔ مجھے اکثر خواب میں لگتا جیسے میں چاول کے کھیتوں میں اس کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی ہوں۔ کھیتوں کی باڑ کے ساتھ' دونوں اطراف مہکتے پھولوں سے بھری ہوتیں۔ میں عموماً نائٹ گاؤن پہنے ہوتی اور میرے بالوں میں سرخ ربن لگا ہوتا۔ فضا میں ٹھنڈی میٹھی ہوا اور اس کے دوش پر تروتازہ پھولوں کی مہک تیر رہی ہوتی۔ نرم و ملائم سطح زمین میرے ننگے پاؤں کو عجیب سی فرحت کا احساس دیتی۔ ''ربن تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔'' خوابوں میں در آنے والا لڑکا' سامنے بیٹھے چکور کی جانب دیکھتے ہوئے روحانی گیت شروع کر دیتا اور گاتے گاتے خود بھی دنیا و مافیہا سے بے گانہ نظر آنے لگتا۔ ''ہاں مجھے اندازہ ہے' میری عمر اب بالوں میں سرخ ربن لگانے کی نہیں رہی۔ ایسی حرکتیں تو کوئی پاگل عورت یا طوائف ہی کر سکتی ہے۔ اچھا! میں تتلیاں پکڑنے جا رہی ہوں۔'' لڑکا اپنی جگمگاتی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگتا۔

''تمہاری ماں بھی بالکل تتلی کی طرح لگتی تھی۔'' ابو نے ایک بار مجھے بتایا تھا۔

اچانک میری نظر ابو کی طرف گئی۔ انہوں ے چڑیا کا نہلا گڈی میں سے بڑی صفائی سے اٹھا لیا تھا۔ میں نے سکون سے ان کی حرکت دیکھی مگر بولی کچھ نہیں۔

''بہت گندی گیم ہے' ایک جوڑا لگایا ہے اور بس۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولے۔

''اگر آپ اسی طرح پتے چاٹتے رہے تو میں تو کھیل چکی۔'' مجھے غصہ آ گیا۔''اتنا بے رحم بھی نہیں ہونا چاہئے۔''

ایک دفعہ میں اپنے بھائی کی غیر حاضری کے بارے میں ذرا اونچی آواز میں اظہار حیرت کر بیٹھی تھی تو ابو بری طرح بھتے سے اکھڑ گئے تھے۔''تم نے اسے کبھی جتلایا نہیں وہ گھر میں ہوتا ہے تو سارے معاملے گڑبڑ ہونے لگتے ہیں۔'' ابو کو اس کی غیر حاضری صرف تاش کھیلتے ہوئے ناگوار گزرتی تھی کیونکہ دو آدمیوں کا کھیل زیادہ مزا نہیں دیتا۔

''میں اس کھیل کے ہاتھوں بیمار ہوتا جا رہا ہوں۔'' ایک دن بھائی نے شدید غصے کے عالم میں اپنی کرسی پیچھے دھکیلی اور کھیل کو بگاڑ کر چلتا بنا۔ کھلاڑیوں کی تکون ٹوٹ گئی اور اب پتوں کے ساتھ آوارگی کیلئے ابو اور میں باقی رہ گئے۔

کیا میں بھی اچانک اٹھوں اور بھائی کی طرح غائب ہو جاؤں۔ کیا میں ڈوبتے جہاز کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کیلئے لائف جیکٹ پہن کر یہاں سے بھاگ نکلوں۔ میں نے ابو کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس پر خاصا تناؤ تھا۔ یہ صورتحال غیر یقینی کیفیت کی وجہ سے ہوتی تھی۔ انہیں غالباً سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ گڈی کا کارڈ ہاتھ میں رکھیں یا نیچے پھینک دیں۔ ان کے رخساروں کا گوشت عرصہ ہوا گھل چکا تھا۔ لمبی طوطے جیسی نوکیلی ناک لمبوترا پچکا ہوا چہرہ دھندلی آنکھیں نہ جانے کتنی کہی اور ان کہی داستانوں کے امین تھے۔''پیاری بچی! مجھے گھر لے چلو۔ یہ جگہ خطرناک ہے۔ میں بہت تنہا ہوں۔'' میں جانتی ہوں مگر ہر جگہ یہی عالم ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ میں لگاتار دو بازیاں جیت گئی۔ ابو کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے اپنے کارڈ میرے سامنے پھینک دیئے۔''اب دیکھتا ہوں کیسے جیتتی ہو؟''

میں نے جلدی سے ان کے پتے اٹھائے گڈی میں ملائے اور انہیں بانٹنا شروع کر دیا۔ ابو کے ہاتھوں کا پسینہ اور اس کی بو تاش کے پتوں کو اور بھی خراب کر چکی تھی۔ کھیل شروع ہو گیا ابو کی ساری توجہ پتوں پر تھی۔ میں بھی خاموشی اور بے دلی سے کھیل میں لگی رہی۔ اچانک ابو کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

''میں جیت گیا! یہ لو چاروں جوکر!'' ابو کا جوش دیدنی تھا۔

دو تین منٹ حساب کتاب میں اور لگ گئے۔ دس بج چکے تھے۔ ٹی وی پر ''خوشی کے رنگ'' نامی پروگرام آ رہا تھا۔ میں نے ابو کی توجہ ان کی دوائی کی طرف دلائی۔ میز پر سے اٹھتے

ہوئے مجھے چکر سا آ گیا۔ خود کو سنبھالنے کیلئے میں نے میز کا کونا مضبوطی سے تھام لیا۔

''کیا ہوا؟'' ابو نے اپنے تاش میز پر ڈال دیئے۔ بڑھاپا اور غم ان کے چہرے پر بری طرح بکھرے نظر آ رہے تھے۔ ان کی نوکیلی ناک بالائی ہونٹ سے ٹکراتی محسوس ہو رہی تھی۔

''چکر آ رہے ہیں ___ '' دور کہیں مجھے سیٹی کی آواز گونجتی سنائی دی۔ عموماً مجھے سیٹی کی گونج خیالوں میں محسوس ہوتی تھی مگر اس وقت واقعتاً سیٹی کی آواز فضا میں بکھرتی ہوئی لگی تھی۔ اس کا میری بے خوابی اور چکروں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

''کوئی احمق آدھی رات کو سیٹیاں بجاتا پھر رہا ہے۔ نہ جانے دنیا میں کیسی کیسی خباثتیں جنم لے رہی ہیں۔ کاش سامنے کے نئے مکانات میں کچھ اچھے گھرانے آ کر آباد ہو سکیں! یہ لڑکے تو ہنگامہ بازی اور شور شرابے سے باز ہی نہیں آ پاتے ___ '' ابو کا ہاتھ گفتگو کے دوران ایک بار پھر عادتاً تاش کی گڈی کی طرف بڑھا۔ لیکن فوراً ہی انہیں احساس ہو گیا کہ میری چبھتی نظریں ان کے ہاتھ پر ہیں۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے اپنے ہاتھ کو پیچھے کھسکا لیا اور پھر بڑی مشکل سے اپنی پینٹ کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا۔

''اب یہ بجلی کا بل ہی دیکھ لو کئی دن سے میل باکس میں پڑا تھا۔ انہیں بروقت ادائیگی نہ ہو تو جرمانہ بھی دینا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اس طرح آدمی بلاوجہ کی پریشانیوں سے بچ جاتا ہے اور ہاں یہ اتنا زیادہ بل کیسے آ گیا؟ اگر ہم بجلی ضائع کرنا چھوڑ دیں تو اچھی خاصی رقم بچائی جا سکتی ہے۔'' ابو وقت کی اہمیت پر اس لئے لیکچر دے رہے تھے کہ ہمیں بجلی کے بل پر جرمانہ بھی دینا پڑ رہا تھا۔

''فریج عرصے سے بند پڑا ہے۔'' میں نے ذرا غصیلے لہجے میں کہا لیکن ابو سے ایسی کوئی بات کرنا فضول ہی تھی۔ یہ دراصل ابو کی بے احتیاطی یا لاپروائی کا نتیجہ تھا۔ ابو دن میں دس بار میل باکس چیک کرتے تھے۔ خطوط وغیرہ تو کسی کے آتے نہیں تھے۔ عموماً یہ بل ہی آتے تھے اور وہ بھی مہینے میں ایک بار۔ اب اس کے باوجود وہ اگر ابو کو بجلی کا بل باکس میں نظر نہیں آیا تو کس کی غلطی تھی لیکن ابو اپنی غلطی ماننے کے بجائے ہمیشہ الجھ پڑتے تھے۔

ابو نے بجلی کا بل میز کے کونے پر پھینکا اور ان کی نگاہیں دوبارہ تاش کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ انہوں نے تاش اپنی طرف کھسکائے اور تاش کو اس طرح ترتیب دینے لگے کہ ان سے اہرام کی شکل بننا شروع ہو جائے۔ میں ہتھیلی پر اپنی تھوڑی سجائے ان کی جانب دیکھتی رہی۔ ابو

کو تنہائی میں کھیلنے کیلئے تاش کی سینکڑوں گیمیں آتی تھیں۔

''کیا بتایا تاش کے پتوں نے؟'' میں نے ابو سے رواداری میں پوچھ لیا۔

''عاشق اور اس کی چھل قدمی —— '' کہتے کہتے ابو چونک کر میری جانب گھورنے لگے' تاہم ان کی آنکھوں میں شفقت عیاں تھی۔ ''تمہاری طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی' خاصی تھک گئی ہو آج' جاؤ' جا کے آرام کرو۔'' انہوں نے کہا۔

میدان کے پار سے آتی ہوئی سیٹی کی گونج تاریکی کے سینے میں اترتی جا رہی تھی اور ہر طرف سکوت طاری تھا۔ تاش کی نئی گڈی لانا پڑے گی۔ میں نے سوچا' جب آدمی سارے کارڈ پہچانتا ہو تو پھر مزا کیا رہا۔

عورت کے قدموں کی چاپ' اوپری منزل پر لمحے بھر کو رکی اور پھر دور ہوتی چلی گئی۔

''لگتا ہے' آج اسے اپنے بچے کو' اپنی گود میں ہی لئے ہوئے' رات گزارنی ہو گی'' ابو نے کہا ''یہ عورت بچے کو بڑی خطرناک عادتیں ڈال رہی ہے۔''

میں نے زوردار جماہی لی اور اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ ''میں سونے جا رہی ہوں' آپ بھی اور یہاں نہ بیٹھیں۔'' میں نے کہا ''یہ رہی آپ کی دوائی' میں گھر کے دروازوں کو چیک کر کے سوؤں گی۔ آپ بےفکر رہیں۔''

میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ پورا پانی کھول دیا اور اطمینان سے اپنا منہ ہاتھ دھونے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ ابو کی نظریں تاش پر ہی جمی رہیں گی۔ پھر بھی میں بہت احتیاط سے باتھ روم سے نکلی' لاؤنج سے دبے پاؤں گزر کر خارجی دروازے تک پہنچی' آہستگی سے دروازہ کھولا اور اپارٹمنٹ سے باہر آ گئی۔ میں دیوار سے چپکی ہوئی چل رہی تھی تاکہ اوپری منزل پر موجود عورت' اپنے بچے کو بہلاتے ہوئے —— اگر بالکونی پر کھڑی ہو تو اسکی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔

میدان کی دوسری جانب' مزدوروں نے روشنی اور حرارت کیلئے جگہ جگہ آگ جلا رکھی تھی۔ غالباً وہ ابھی تک اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ شاید آنے والی سردی سے پہلے انہیں یہ تعمیراتی کام ختم کرنا تھا۔ میں جلتی آگ کے الاؤ اور اکا دکا بلبوں کی روشنی سے بچتی بچاتی' تیز تیز قدم اٹھائی آگے بڑھتی گئی۔ وہ ریت اور بجری کے ایک بڑے سے ڈھیر کے درمیان کھڑا تھا۔ پیچھے ہی ایک زیرِتعمیر مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

''میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں' آج بھی دیر کر دی۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ

شروع سے میرے تعاقب میں ہو، وہ نظریں جھکائے اپنے پنجے ریت میں گھسائے جا رہا تھا۔

''بالکل کل کی طرح ہوا۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''میں نے سیٹی بجانی اس لئے بند کر دی تھی کہ کہیں کوئی چوکنا نہ ہو جائے۔''

اس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ نشے میں تھا۔ ریت برف کی طرح سرد تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے، سردی کا احساس اور بھی بڑھا رہے تھے۔ ممکن ہے، شبنم گرنے لگی ہو، میں نے سوچا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا، لحہ بھر کو اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس کی ہتھیلی کی جلد کسی دھات کی طرح سخت تھی۔ اس کا ہاتھ بہت بڑا اور مضبوط لگا۔ دن کی روشنی میں یقیناً یہ بہت گندا اور سخت لگتا ہوگا۔ میرے ذہن میں آیا۔

''یہاں خاصی ٹھنڈ ہے لیکن اندر مکان خالی پڑا ہے۔ گارڈز ہوا کے ہاتھوں پریشان ہو کر بار میں جا بیٹھے ہیں۔'' نشے میں ہونے کے باوجود، وہ جوش کے مارے کپکپا رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی میں ایک نمی سی آ گئی۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر بجری اور اینٹوں کے ڈھیر پر سے بچتی بچاتی مکان میں داخل ہو گئی۔ ''کیا بکواس ہے!''

''کیا ہوا؟''

''یہاں لائٹ وغیرہ نہیں ہے؟'' بہرحال بہت اندھیرا ابھی نہیں تھا کیونکہ کمرے کی چھت ابھی نہیں پڑی تھی۔ اس نے بجری اور بکھری ہوئی چیزیں ایک طرف سمیٹ کر، مناسب سی جگہ بنالی۔ اس کا کھردرا ہاتھ میرے سویٹر پر پھسلنے لگا۔ اس پر اب بھی کپکپاہٹ طاری تھی۔ وہ تیزی دکھانا چاہ رہا تھا مگر گھبراہٹ کے عالم، میں بمشکل سویٹر کا پہلا بٹن ہی کھول سکا۔ دوسرے بٹن پر صحیح ہاتھ نہ پڑنے پر، اس نے سویٹر کو اوپر اٹھا لیا اور وہ میری گردن میں آن پھنسا۔ میرا سانس رکنے لگا اور ٹانگوں سے شدید سردی چڑھنا شروع ہو گئی۔ فرش کی برفیلی ٹھنڈک نے مجھے دہرا کر کے رکھ دیا۔ اس نے اپنی جیکٹ اتاری اور میری کمر کے نیچے بچھا دی۔ آسمان پر پھیلے روشن اور جگمگاتے تارے کھلی چھت سے اتر کر، میری آنکھوں کے فرش پر چمکنے لگے۔ رات کی تاریکی میں خشک پھولوں کی خوشبو تو ہمیشہ ہی مہکتی محسوس ہوتی تھی۔

''تمہارا اسٹار کیا ہے؟''

''برج عقرب۔''

''ایک دن تمہارا شاندار سا گھر ہوگا، مکمل اور محفوظ، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والا اور تم بے

خطر اس میں مزے اڑا رہے ہو گے۔ تم شرمیلے اور داخلیت پسند ہو مگر خواب رومانی دیکھتے ہو۔''

''تم پھول کیوں نہیں لگاتیں؟''

''میرا خیال ہے، پھول ـــــ بالوں میں پھول لگانے کی میری عمر نہیں رہی، اس عمر میں عام عورتیں پھول نہیں لگاتیں، سوائے جنونی عورتوں یا طوائفوں کے۔''

''اگر سردی اسی طرح بڑھتی رہی تو اس کھلی فضا میں، ہمارا ملنا مشکل ہو جائے گا۔'' وہ میرے بالوں سے اس طرح کھیلتے ہوئے بولا، جیسے یہ بھی ایک کام ہو۔ ''انہیں یہ مکانات مکمل کرنے میں ابھی کئی ہفتے لگیں گے۔ اس دوران سردی بہت زیادہ بڑھنی تو نہیں چاہیئے۔''

''میں سردی میں ٹھٹھرنا بالکل پسند نہیں کرتی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کے علاوہ، باقی سب تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے نا؟ بڑی مشاق کھلاڑی لگتی ہو، ہے نا؟'' وہ مکھن لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ چلتے پھرتے لوگوں کے قدموں کی چاپ قریب آتی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً اپنی جیکٹ فرش پر سے اٹھائی اور پہن لی۔ ''لوگ ادھر ہی آ ئیں گے۔'' باہر، دوبارہ بجری اور اینٹوں کا ڈھیر عبور کرتے ہوئے، اس نے پوچھا ''کل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''تمہارے پاس کچھ فالتو رقم ہو گی؟ میری طبیعت ٹھیک نہیں، مجھے کچھ دوائی لینی ہو گی۔ میں کوئی زیادہ رقم نہیں مانگ رہی۔''

اس نے دانت پیسے۔ ''لعنت ہے'' وہ بڑبڑایا ''اب سمجھ آئی کہ تم نے کوئی مسئلہ کیوں پیدا نہیں کیا۔ ٹھیک ہے میں شرط لگا سکتا ہوں، تمہاری قیمت کوئی خاص نہیں کیونکہ تم فری لانسر ہو۔'' اس نے جیکٹ کی جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی پھر ماچس کی تیلی جلائی گویا سگریٹ سلگانے جا رہا ہے مگر سگریٹ کے بجائے تیلی کا لمبا شعلہ میرے چہرے کے آگے لہرا دیا۔ میں نے شعلے میں جھانکا اور پھر نفرت آمیز طریقے سے دانت کچکچائے۔

''شٹ! تم نے اچھے دن دیکھ رکھے ہیں۔ مجھے دیکھو، میں کتنا شکستہ ہوں، پرسوں تنخواہ ملے گی۔ اگر تمہیں رقم کی ضرورت ہو تو ضرور آنا۔'' اس نے غصے سے تھوکا، اس کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے تھے۔

میں وہاں سے چل دی۔ راستے میں کچھ اور مزدور میرے قریب سے گزرے۔ خارجی دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ اوپری منزل پر موجود عورت ابھی تک ٹہل ٹہل کر اپنے بچے کو بہلا رہی

تھی اور تھکی تھکی آواز میں اسے لوری دے رہی تھی۔ میں خاموشی سے اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہوئی۔خود کو رگڑ رگڑ کر سردی کے احساس سے نجات پانے کی کوشش کی۔ابو ابھی تک کچن ٹیبل پر بیٹھے اکیلئے تاش کا کوئی کھیل کھیل رہے تھے یا شاید اپنی قسمت ڈھونڈ رہے تھے۔

''پھر کیا ملا آپ کو؟''

''عاشق ــــــ جلدی کرو اور سیدھی سونے چلی جاؤ۔'' انہوں نے پیچھے مڑے بغیر کہا' وہ پتے پھینٹ رہے تھے اور پتے شاید اپنی بے بسی پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔

میں اپنے کمرے میں گھس گئی' جاتے ہی لائٹ جلائی۔ایک لمحے کو اچانک پھیلتی روشنی کی جانب دیکھا اور پھر اپنی میز کی دراز کھولی ''سویٹی مجھے یہاں سے دور لے جاؤ' میں یہاں بہت خوفزدہ اور تنہا ہوں۔'' امی کاغذ میں بھی چیختی چلاتی محسوس ہو رہی تھیں۔تحریر بڑی بڑی اور اوٹ پٹانگ تھی جیسے کوئی بچہ ابھی لکھنا سیکھ رہا ہو۔حروف کے درمیان چھٹی ہوئی خالی جگہ پر انہوں نے بعض علامتی تصویریں بنا دی تھیں۔کہیں کھڑے ہاتھ تھے' کہیں گیند کی طرح گول سر اور کہیں ان کے ہاتھ اور پاؤں درخت کی شاخوں کی طرح' بری طرح کھنچے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں نے کاغذوں کا بنڈل اپنی ناک کے پاس رکھا تو خشک پھولوں کی نامعلوم سی خوشبو میری سانسوں میں اتر آئی' جب میں نے ان کا معمولی سا لاکٹ کھولا تو اس میں موجود بالوں میں سے بھی وہی خوشبو محسوس ہوئی۔

وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے اور ہمارے آنے کے بعد ہی انہوں نے تابوت کو بند کیا تھا۔ آواز کی گونج میرے تصور سے خاصی مختلف تھی۔ ماں کا جسم گلنے سڑنے کے قریب تھا مگر اس میں سے پھولوں کی خوشبو ابھی تک گئی نہیں تھی۔ابو نے کہا تھا ''وہ اپنی ہی زندگی کی حفاظت اور بچاؤ کیلئے نہائے گی نہیں مگر پرفیوم کبھی نہیں بھولے گی۔کسی طوائف سے بھی زیادہ گندی اور غلیظ تھی وہ اور انتہائی غیر محتاط اور خود پرست بھی۔''

شاید'یہ ان کی خشک جلد کی بو اور پرفیوم کی خوشبو کا ملا جلا احساس ہی تھا' جو آخری دم مجھے ان کے پاس ملا تھا' میں ٹھنڈے فرش پر لیٹ گئی۔ مجھے یہ یاد تھا کہ ابو کے اپنے کمرے میں جانے کی آہٹ ابھی تک میرے کانوں میں نہیں آئی' میں نے اپنے کپڑوں کو اسی انداز میں سمیٹ لیا جیسے میں نے اس خالی اور نامکمل مکان میں کیا تھا۔ میرے سر پر اس عورت کے قدموں کی چاپ مسلسل دستک دے رہی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے بچے کو سلانے کی کوشش میں لگی

ہوئی تھی ـــــ میری بچی! تیری آنکھوں میں ہیرے جگمگاتے ہیں' ستارے جھلملاتے ہیں' سنہری اور روپہلی دھاتیں بے وقعت ہیں تیرے سامنے۔

میں اٹھی اور کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ کمرہ رات کے ہیبتناک سکوت میں ڈوبنے لگا۔ جلد ہی مجھے یوں لگا جیسے ساری عمارت ہی ٹوٹتی پھوٹتی' چرمراتی تاریک سمندر میں' آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی ہے۔

اوپری منزل پر عورت تمام رات کسی پرانے چیتھڑے کی طرح پھڑ پھڑاتی رہے گی۔ فضول اور بے فائدہ' کسی ڈوبتے جہاز کے شکستہ مستول پر لٹکے ہوئے بادبان کی طرح' جس کی جانب کوئی نگاہ نہیں اٹھے گی' اپنے جسم پر گرتے قطرہ قطرہ پانی کے بے رحم دباؤ سے میں بری طرح ہانپنے لگی' میں نے جلدی سے اپنا منہ کھولا اور آہستگی سے اپنے دانت کچکچانے لگی' بالکل اسی طرح جیسے اس آدمی کی جلائی ہوئی ماچس کی روشنی اور اس کے شعلے کو اپنے چہرے کے پاس پا کر میں نے کیا تھا۔

چائنا ٹاؤن

اوچنگ ہوئی

ریلوے لائن شہر کے عین درمیان سے گزرتی ہوئی' بندرگاہ کے شمالی کنارے تک' ایک فلور مل کے قریب جا کر اچانک ختم ہو جاتی تھی۔ کوئلے سے بھری ٹرین ایک زبردست جھٹکے سے وہاں رکتی اور اس کا انجن اس بری طرح بل کھاتا جیسے کسی بھی لمحے سمندر میں گرنے والا ہے۔ کوئلے کی دھول فضا میں اڑنے لگتی اور اس کے ذرات اور گرد کھڑی کاروں کی چھتوں پر سیاہی مائل تہیں بچھا دیتے۔ سردی کے دن بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ ان دنوں گھر پر دوپہر کے کھانے کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ سکول سے چھٹی ہوتے ہی بچے کتابیں الٹی سیدھی اکٹھی کرتے اور فلور مل کی طرف دوڑ لگا دیتے۔ اس کے احاطے میں پٹ سن کے ٹاٹوں پر' گندم کے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔ غالبًا اسے دھوپ نکالنے کیلئے وہاں بچھایا جاتا تھا۔ وہاں اگر کوئی چوکیدار نظر نہ آتا تو ہم بڑے گیٹ سے اندر جاتے' مٹھی بھر گندم کے دانے اٹھاتے اور ٹاٹ کے کناروں پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑتے' اپنی راہ لیتے۔ راستے میں گندم کے دانے پھانکتے اور چباتے جاتے۔ جلد ہی اندرونی لعاب انہیں نرم سفوف کی طرح کر دیتا۔ اس کا مزیدار گودا' ہمارے منہ کے اندر چپکنے لگتا۔ اس کا مزا لیتے لیتے ہم ریلوے لائن تک پہنچ جاتے۔

کوئلے کی ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے' ہم اناج کا گودا چباتے رہتے اور اس سے بڑے

بڑے ببلز بناتے۔ ریلوے لائن سے کنکر اور بجری اکٹھے کرتے‘ ان کے ڈھیر بناتے‘ ان پر کنکر پھینکتے رہتے یا پھر لوہے کے ان ٹکڑوں کو ڈھونڈنے لگتے جو ہم نے پچھلے روز مقناطیس بنانے کیلئے ریل کی پٹڑی پر رکھے تھے۔

بالآخر انتظار ختم ہوتا اور ریل شور مچاتی‘ آ کھڑی ہوتی۔ ہم ڈبوں کی درمیانی جگہ سے‘ ان کے اوپر چڑھتے اور جہاں کہیں ہاتھ پڑتا‘ کوئلے کے ٹکڑے لائن پر گرانا شروع کر دیتے اور پھر اتر کر انہیں اپنے پاس موجود تھیلوں میں بھر لیتے۔ اس عرصے میں ہم کوئلے کی دھول اور اس کے ذرات میں اس طرح نہا چکے ہوتے کہ ایک دوسرے کی شکلیں تک نہیں پہچان پاتے تھے تاہم ایک دوسرے کو دیکھنا اور بے ساختہ قہقہے لگانا بھی اس کھیل کا حصہ تھا۔ بڑی عمر کے تیز طرار لڑکے تو کوئلے کیلئے سیمنٹ کے بڑے تھیلے لایا کرتے تھے۔ بہرحال سب بچے اپنے اپنے تھیلے اٹھائے‘ بندرگاہ کے گرد موجود لوہے کی معمولی سی باڑ کو پھلانگتے ہوئے نکل جاتے۔

گاؤں کا سنیک بار ہماری منزل ہوتا۔ ہم وہاں پہنچتے اور اس کی میزوں پر قبضہ جما لیتے۔ نوڈل سوپ‘ ٹماٹر کی چٹنی سے بھرا مقامی برگر یا کباب ہماری مرغوب غذا تھے‘ ہم ڈٹ کر‘ اپنا پیٹ بھرتے۔ بعض اوقات کوئلے کے بدلے ہم ابلے میٹھے آلو خرید لیتے اور کبھی بار کے برابر والی دکان سے پکچر کارڈ یا ٹافیاں لے لیتے۔ بہرحال‘ ہمیں یہ علم تھا کہ کوئلہ رقم کا نعم البدل ہے اور اس کے ذریعے ہم اردگرد کی دکانوں سے کوئی بھی چیز بڑے آرام سے خرید سکتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے علاقے کے بچے سارا سال کالے کارٹون بنے دکھائی دیتے تھے۔ بعض لوگ ہمارے علاقے کو ساحلی گاؤں کا نام دیتے تھے اور بعض اسے چائنا ٹاؤن کہتے تھے۔

سردیوں کے موسم میں شمال کی ہوا کوئلے کی دھول کو سارے علاقے میں سائے کی طرح پھیلا دیتی۔ سورج بے چارہ کالے آسمان پر بے نور چاند کی طرح نظر آتا۔ دادی اماں ہمارے چولہے کی راکھ اکٹھی کر کے گھر کے برتن اور واش بیسن صاف کرتیں اور انہیں ناقابل یقین حد تک چمکا دیتیں لیکن کپڑے سکھانے کی بڑی مشکل تھی۔ انہیں ہوا کی پہنچ سے دور اندر کمروں میں لٹکایا جاتا‘ سوکھنے تک ان پر پھر دھول جم جاتی اور انہیں دوبارہ دھویا جاتا اور نچوڑ نچوڑ کر سکھانے کی کوشش کی جاتی تاکہ وہ پہننے کے قابل ہو سکیں۔

''لعنت ہے اس دھول پر بھی! یہ کوئی جگہ ہے رہنے کی!'' دادی اماں اپنے غصے کا اظہار کرتیں۔ پرانی یادیں ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتیں۔ بہت سی باتیں ماضی کے جھروکوں سے

جھانکتی رہتی ہیں۔ دادی اماں اکثر کہا کرتی تھیں: جنگ سے پہلے یہ علاقہ شمال میں تھا۔ پانی کوانگ سوک کے چشمے سے آیا کرتا تھا۔اسی کا پانی ہمارے استعمال میں ہوتا تھا' اس سے کپڑے اتنے اجلے دھلتے کہ ان میں نیلاہٹ آ جاتی۔ آج کا دھوبی بھی کیا کپڑے دھوئے گا اس کے سامنے۔''

سردی کی چھٹیوں کے بعد' جب ہم سکول جاتے تو ہوسٹل کی وارڈن ہمیں' خاص طور سے چائنا ٹاؤن کے بچوں کو' باتھ روم لے جاتی اور خوب گرم پانی سے ہمیں نہلاتی اور پورا بدن رگڑ رگڑ کر صاف کروا دیتی۔ پھر وہ باقاعدہ چیک کرتی کہ کسی بچے کے بدن پر کوئلے کے ذرات چپکے تو نہیں رہ گئے۔اس کی ایک شفقت بھری تھپکی کا مطلب ہوتا کہ ہم انسپکشن میں کامیاب رہے' ورنہ پھر وہی مشق ستم دھرائی جاتی۔

بہار کا موسم آ گیا' ہم نئی جماعتوں میں چلے گئے' میں اب تیسرے درجے میں تھی' ہمارے زیادہ تر پیریڈ صبح کے وقت لگتے تھے' ایک دوپہر کو میں چی آ ک کے ساتھ گھر جا رہی تھی ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے شانوں پر پڑے تھے ''میں بڑی ہو کر ہیئر ڈریسر بنوں گی۔'' ایک تکونی راستے پر موجود' بیوٹی پارلر کے پاس سے گزرتے ہوئے چی آ ک نے کہا۔ اس کی آواز نے مجھے زردیت کا احساس دلا دیا۔ اس دن سکول میں کیڑوں سے بچاؤ کی کوئی دوائی پلائی گئی تھی۔ ہماری ٹیچر نے ہمیں خاص طور سے خالی پیٹ سکول آنے کی ہدایت کی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ یہ بھوک کا نتیجہ تھا' دوائی کا اثر تھا یا کسی ابلتی سبزی کی خوشبو' بہرحال ہر چیز پیلی پیلی لگ رہی تھی ـــــ سورج کی روشنی' راہگیروں کے چہرے' میرے سکرٹ میں گھستی اور اسے پھڑ پھڑاتی تندوتیز ہوا ـــــ ہر شے پر پیلاہٹ کا راج تھا۔

بعض سٹوروں کے علاوہ' سڑک کے دونوں طرف کی دکانیں اجڑی پڑی تھیں۔ایک بڑی عمارت بمباری کے ہاتھوں بالکل ہی تباہ ہو گئی تھی۔ اب محض اس کے کھنڈر باقی تھے ''کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ گاؤں کا سب سے بڑا سینما تھا۔'' چی آ ک نے ایک اور کھنڈر بنی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے' سرگوشی میں کہا دیوار پر سفید پلاسٹر کی وجہ سے وہ فلم سکرین یا سٹیج کا پردہ سا محسوس ہو رہی تھی لیکن جلد ہی یہ بھی زمین بوس ہو جائے گی۔ بہت سے مزدور اپنے اپنے کلہاڑے لئے اس پر چڑھائی کیلئے تیار تھے۔ کسی بھی لمحے' ایک دھماکہ ہوگا اور یہ زمین پر آ رہے گی۔ کچھ اور مزدور' ایک اور جگہ پر موجود' اینٹوں اور لوہے کے ڈھیر علیحدہ علیحدہ لگا رہے تھے۔

''اس علاقے پر قبضہ جمانے کیلئے' بمباری کی گئی تھی۔'' چی آ ک نے بڑے بوڑھوں کے سے لہجے میں بار بار یہ فقرہ کہا۔ مقامی لوگ بہت محنتی تھے' انہوں نے اس تباہ شدہ علاقے میں واپس آ کر فوراً اپنے گھر وغیرہ دوبارہ بنانے شروع کر دیئے تھے۔ جگہ جگہ' کوئلوں کے کھلے چولہوں پر' مزدوروں کا کھانا پکتا نظر آ رہا تھا۔ چی آ ک اور میں راستے بھر مسلسل منہ بنا بنا کر تھوکتے آ رہے تھے۔ ''لگتا ہے کہ دوائی کیڑوں نے ہضم کر لی۔''

''لگتا ہے' کم بخت پیشاب کئے جا رہے ہیں۔'' بہر حال وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے' ہمارا جی چاہ رہا تھا کہ کسی بھی طرح ہم قے کر ڈالیں۔ سبزیوں کے اوپر ابلتا ہوا جھاگ' کوئلے کا دھواں' پلاسٹر کی بو اور سمندری گھاس پھوس کی بو' یہ سب مل کر' ہماری آنکھوں کے سامنے ایک بڑے سارے زرد گرداب کا روپ دھار رہے تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تعمیر میں گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکار کیوں استعمال کرتے ہیں۔'' چی آ ک نے کہا ''اس کی ہلکی سی بو دماغ میں چڑھی نہیں کہ سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔''

میرے کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ ہٹا تو ذرا میری جان میں جان آئی۔ میں کچھ دیر قصبے میں یونہی آوارہ گردی کرتی رہی۔ وہ زردسی بو' میرے ذریعے شہر میں آئی۔ سب سے پہلے میری اس کی جان پہچان ہوئی تھی۔ ہمارا گاؤں حالیہ جنگ کے دوران بالکل تباہ ہو گیا تھا اور ہمارے خاندان نے پچھلے موسم بہار میں' یہاں آ کر پناہ لی تھی۔

''اگر تمہارے باپ کو کوئی نوکری مل جائے۔'' امی حقے کا کش لیتے ہوئے اکثر کہا کرتی تھیں۔ وہ اس دوران گھر کے دالان میں موجود تمباکو کے گٹھوں کو پانی مار رہی ہوتی تھیں۔ وہ عموماً تمباکو کے پتوں کا ایک بڑا سا بنڈل لے کر صبح سویرے گھر سے نکل جاتیں اور دو تین دن بعد انتہائی کمزور اور لاغر حالت میں واپس آتیں۔'' میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں لیکن مجھے ہر جگہ تمباکو کی اجارہ داری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر تمہارے پاس لائسنس نہیں ہے تو چوروں کی طرح پولیس سے چھپتے پھرو۔ کاش تمہارے باپ کو نوکری مل جاتی!''

ابا نوکری کے سلسلے میں اپنے ان دوستوں اور ہم جماعتوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے جو شمال سے ہجرت کر کے یہاں آ بسے تھے یا کسی نہ کسی طرح جنگی تباہ کاری سے بچ نکلے تھے۔ بالآخر انہیں شہر میں کیروسین آئل بیچنے کی ملازمت مل گئی۔

جس دن' ہمیں لے جانے والے ٹرک نے آنا تھا' ہم نے منہ اندھیرے ہی ناشتہ کر لیا

پھر اپنے سارے گھریلو ساز و سامان کے ساتھ سڑک کے کنارے آ کر بیٹھ گئے۔ لنچ کا وقت بھی گزر گیا مگر ٹرک نہیں آیا۔ پڑوسیوں سے الوداعی ملاقاتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ بھی بالآخر اختتام کو پہنچا۔ اچھلتے کودتے' ناچتے گاتے' بھاگتے دوڑتے' آخرکار ہم تھک گئے۔ شام ہونے لگی تو امی ہمیں ایک قریبی ہوٹل میں لے گئیں۔ وہاں ہم نے نوڈل سوپ لیا اور کچھ کھانا کھایا۔ اس صبح ہم بہن بھائیوں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے۔ مگر اس وقت تک ان کا حشر ہو چکا تھا۔ ہماری ناک بہہ بہہ کر ہمارے کپڑوں پر عجیب و غریب نقش و نگار بنا چکی تھی۔

رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا مگر امی' ہمارے ننھے بھائی کو گود میں سنبھالے' کپڑوں کے ایک بنڈل پر بیٹھی' اپنی نگاہیں پل کی جانب لگائے ہوئے تھیں اور بے صبری سے ٹرک کی آمد کی منتظر تھیں۔ سورج چھپنے کے بہت بعد' بالآخر ٹرک کی ہیڈ لائٹس پل پر سے جھانکتی نظر آئیں۔ ''خدا کا شکر ہے۔'' امی جوشیلی آواز میں بولیں۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے' ٹرک آ کر رک گیا' امی تیزی سے ٹرک ڈرائیور کی طرف گئیں۔ اس کے معاون نے امی سے کچھ کہا جو انجن کے شور کی وجہ سے ہمیں بالکل سمجھ نہیں آیا۔ امی واپس آ گئیں اور ٹرک آگے چلا گیا۔ ہم سب بہن بھائی حیرت اور تعجب سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ ٹرک کے پیچھے مدہم سی روشنی میں جانور سوار نظر آئے۔ ان کے ابھرے ہوئے سینگ' جگالی کرتے منہ اور منہ سے نکلتی آوازیں ـــــ یہ سب کچھ اس حقیقت کا غماز تھا کہ وہ مویشی ہی ہیں۔

''وہ مویشی اتار کر' واپسی پر ہمیں لینے آئیں گے۔ یہ انتظام یوں کرنا پڑا کیونکہ اگر ہم ٹرک کو خالی واپس بھیجتے تو ہمیں واپسی کا بھی آدھا کرایہ دینا پڑتا۔'' امی نے دادی اماں کو سمجھایا۔

دادی اماں نے اپنا سر ہلایا مگر ان کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نظر آئے جیسے کہہ رہی ہوں ''تمہیں ہی پتہ ہوگا کہ تم دونوں کیا کرتے پھر رہے ہو۔'' ہم نے دادی اماں کو امی اور ابا سے کبھی اختلاف کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ٹرک کے آنے میں دو گھنٹے اور لگ گئے۔ دس میل دور واقع شہر میں' کسی مذبح خانے میں مویشیوں کو اتارنے کے بعد پورے ٹرک کی صفائی اور دھلائی بھی کی گئی۔

گھر کا مال و اسباب ٹرک پر چڑھایا گیا۔ پھر ہم سب بچوں کو اس میں بٹھا دیا گیا۔ امی ننھے بھائی کو گود میں لئے' ڈرائیور اور اس کے معاون کے درمیان پھنس کر بیٹھ گئیں۔ ٹرک کے اسٹارٹ ہوتے ہی آدھی رات کو جنوب کی طرف جانے والی ٹرین کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔

میں نے بنڈلوں کے درمیان سے اپنا سر باہر نکالا اور اپنے گاؤں کو رات کے اندھیرے میں پہاڑی کے پیچھے' درختوں کی اوٹ میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر پہاڑی اور درختوں کے جھنڈ بھی' آسمان کی تاریکی میں تحلیل ہونے لگے۔ فاصلے بڑھنے لگا اور بالآخر وہ نقطوں کی شکل اختیار کر گئے۔ آبادی سے نکلتے ہی' ٹرک ایک اونچی نیچی پہاڑی سڑک پر آ گیا۔ ٹرک کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہم لوگ سامان کے ساتھ ساتھ' ادھر ادھر لڑھکتے پھر رہے تھے۔ ڈرائیور بہت بے ہودہ طریقے سے ٹرک چلا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹرک اپنا توازن قائم نہیں رکھ پا رہا۔ میں دادی اماں کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اپنے دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے کہ کہیں خوف سے ان کی چیخ نہ نکل جائے۔ ہر جھٹکے کے ساتھ محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سر کے بل' نیچے بہتے دریا میں جا گریں گے۔ میں نے آنکھیں سختی سے بند کر لیں اور اپنے چھوٹے بھائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

بہار کا موسم ہونے کے باوجود' رات انتہائی سرد تھی۔ دریا کے قریب ہونے کی وجہ سے برفیلی ہوا بری طرح بدن میں چبھ رہی تھی۔ البتہ ہوا کی تیزی کا یہ فائدہ ہوا کہ مویشیوں کی بدبو ٹرک کے اندر باقی نہیں رہی۔ اچانک مجھے مویشیوں کا اندھیرے میں جگالی کرنا اور ہلکی ہلکی آوازیں نکالنا یاد آ گیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے وہ سارے مویشی اب تک مر چکے ہوں گے؟'' میں نے بڑی بہن سے پوچھا لیکن اس نے اپنا چہرہ بدستور گھٹنوں میں چھپائے رکھا اور جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ ظاہر ہے ان جانوروں کو ذبح کر کے' ان کی کھال اتاری گئی ہو گی' گوشت بنایا گیا ہوگا بلکہ شاید اب تک تو ان کا قیمہ ہو چکا ہوگا۔

چاند ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چھوٹا بھائی اس کی طرف دیکھتا اور کہتا: ''بے وقوف چاند! تم کہاں جا رہے ہو؟''

سردی کے مارے' ہم میں سے کسی نہ کسی کو پیشاب آئے جا رہا تھا' چنانچہ ٹرک کو بار بار رکوانا پڑتا تھا۔ ہوتا یوں کہ ہم کیبن اور ٹرک کی درمیانی چھوٹی سی کھڑکی پر دستک دیتے۔ ٹرک کا معاون داہنی کھڑکی سے اپنا سر باہر نکالتا اور چیختے ہوئے پوچھتا' کیا بات ہے؟

''ہمیں باتھ روم جانا ہے۔'' ہم میں سے کوئی کہتا' وہ آدمی ہاتھ کے اشارے سے کہتا کہ جہاں بیٹھے ہو وہیں فارغ وہ جاؤ مگر دادی اماں آڑے آ جاتیں اور ڈرائیور بادل ناخواستہ ٹرک روک دیتا۔ اس کا معاون نیچے اترتا اور ہم سب کو باری باری نیچے اتارتا اور غصیلے لہجے میں کہتا:

چلو جلدی سے فارغ ہو کر آ ؤ۔ ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے' فراغت میں خاصا وقت لگتا مگر بعد کی آسودگی کچھ ہم ہی سمجھ سکتے تھے۔ٹرک جب بھی کسی آبادی میں داخل ہونے لگتا تو اس کا سامنا چیک پوسٹ سے ہوتا اور یوں لگ رہا تھا جیسے ہر موڑ پر ہی چیک پوسٹ قائم ہے۔فوجی وردی میں ملبوس کوئی سپاہی ٹرک پر فلیش لائٹ مارتا' امی تمبا کو کے بنڈل ذرا نیچے کھسکا کر' کھڑکی سے منہ نکالتیں اور زور سے کہتیں'' لے لو تلاشی! پیچھے گھر کا سامان ہے اور میرے بچے اور بس ـــــ!''

تمام رات ٹرک مختلف پہاڑیوں' جھیلوں اور نیند میں کھوئے ہوئے قصبوں کے پاس سے گزرتا رہا۔ایک جگہ اس نے پٹرول بھروایا۔دو جگہوں پر تو بہت سخت چیکنگ ہوئی۔بالآخر صبح کے اجالے کے ساتھ ہی ہم شہر پہنچ گئے۔ٹرک کے پرانے انجن کے شور سے' گلیاں سنسناتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔نہ جانے کون کون سے راستوں سے گزرتے ہوئے' ہم شہر کے ایک دور افتادہ علاقے میں پہنچ گئے۔سمندر یہاں سے بس دو چار ہاتھ ہی دور تھا۔یہاں ہم ٹرک سے اترے' ساز و سامان اتارا گیا۔تمام رات ہمارے ساتھ ہم سفر رہنے کے بعد' تھکا ماندہ چاند مغربی افق میں جا چھپنے کی تیاری میں تھا۔ٹرک ایک خوبصورت اور صاف ستھری دو منزلہ عمارت کے قریب جا ٹھہرا تھا۔پہلی منزل پر شیشے کے سلائیڈنگ دروازے سڑک کی طرف کھلتے تھے۔بالکل کسی دکان کے دروازوں کی طرح' اور ان کے شیشوں پر ''مٹی کے تیل کی دکان'' لکھا ہوا تھا۔

یہ تھا' وہ گھر جہاں' ہمیں رہنا تھا۔

سرد طوفانی ہوا کے تھپیڑے ماحول کو یخ بستہ کئے ہوئے تھے۔سردی کے مارے میرے دانت بری طرح بج رہے تھے۔چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال چونکہ میرے ذمے تھی' اس لئے میں نے اسے اپنی کمر پر لپیٹ لیا۔

ٹرک پر بیٹھے ہوئے' ہم بنڈلوں کے درمیان سے جھانک جھانک کر شہر کی فضا اور در و دیوار کو دیکھتے رہے تھے۔استعجاب اور توقعات کے نہ جانے کیسے کیسے رنگ ہمارے ذہن میں بسے ہوئے تھے۔شہر میں آتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ پلاسٹک کی بنی نالی کے ذریعے' میں صابن کے جھاگ اڑایا کروں گی جس سے قوس وقزح کے خوبصورت رنگ میرے اردگرد بکھریں گے۔کسی انجانی سرزمین سے آنے والے کرسمس کے درخت میرے خوابوں میں سجے تھے اور نہ جانے کیا کیا خواب تھے' جو ادھورے ہی رہ گئے۔

ہماری گلی کے دونوں جانب دومنزلہ، بالکونی والے گھر تھے۔ ایک شکل وصورت کے، سرموفرق نہیں تھا ان میں۔ مچھلیاں اور جھینگے بیچنے والے، سامان اپنی سائیکلوں پر رکھے، تیزی سے سائیکلیں چلاتے غالباً بندرگاہ کی طرف جارہے تھے۔ نزدیکی فلورمل میں کام کرنے والے مزدور بھی بھاگے بھاگے، مل کی طرف رواں دواں تھے۔ کوڑے کرکٹ اور گندگی سے بھری سڑک پر مجھے تو یہ لوگ بھاگتی دوڑتی دانہ چگتی مرغیوں کی طرح لگے۔ گلی کے بیچوں بیچ کھڑا ٹرک اور ہمارا اوٹ پٹانگ انداز میں بکھرا ہوا سامان بھی ان کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ بہرحال وہ رکاوٹیں پار کرتے ہوئے ہمارے گھر کے ساتھ ہی شروع ہوجانے والی پہاڑی پر چڑھنا شروع کردیتے۔

میں منتشر خیالی کا شکار ہوگئی۔ یہاں ہر چیز ہمارے گاؤں سے مختلف تھی لیکن کیا ہم واقعی حرکت میں آئے تھے؟ کیا حقیقت میں یہ ہمارا نیا گھر تھا؟ بڑی خوابناک سی خوشبو تھی جس نے سارے آسمان کو شام کے دھندلکے کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایک جانے پہچانے مگر ایسے بھولے ہوئے خواب کی طرح جس کی محض سنسناہٹ باقی رہ گئی ہو تو پھر وہ خوشبو کیا تھی۔

ابا نے دکان کے دروازے کھولے اور ٹرک ڈرائیور کو آواز دی کہ وہ وعدے کے مطابق سامان اندر گھر میں پہنچائے مگر ڈرائیور نے ہماری طرف اشارہ کیا جیسے ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ ادھر ہم استعجاب اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر دیکھ رہے تھے۔

راستے میں میری گردن پر عین گدی کے قریب بنڈلوں کے ٹکرانے کی وجہ سے خراشیں آ گئی تھیں۔ میری زرد رنگ جیکٹ بھی ادھڑی ہوئی تھی۔ ایک نو سالہ بچی، اس حالت میں حیران و پریشان کھڑی اپنے نئے ماحول کو دیکھنے اور سمجھنے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ عجیب اور بے چین سوچیں میرے سر پر سوار تھیں جبکہ کمر پر میرا چھوٹا بھائی لدا ہوا تھا۔

ہماری آمد کے شوروغل نے اردگرد کے گھروں کے مکینوں کو جگا دیا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے بہت سے چہرے نمودار ہوتے نظر آئے۔ درجن بھر گھروں کی اس قطار میں ہمارا گھر آخری تھا۔ اس کے ساتھ ہی پہاڑی شروع ہوجاتی تھی۔ پہاڑی کی بلندی پر بھی اسی طرح دورویہ اور دومنزلہ گھروں کی قطاریں تھیں لیکن وہ نسبتاً بڑے گھر تھے۔ بعض سفید رنگ کے تھے اور بعض پر نیلگوں سرمئی رنگ نظر آرہا تھا۔ پہاڑی پر بنے گھروں کے درمیان کچھ کچھ فاصلہ بھی تھا۔ تاہم آخری گھر کی دیواریں ہمارے گھر سے بالکل ملی ہوئی تھیں۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں اتنے چھوٹے چھوٹے اور سختی سے بند تھے کہ وہاں کسی کا رہنا محال تھا۔ شاید وہ گودام

کے طور پر استعمال ہوتا ہو۔

مجھے مغربی طرز تعمیر کی' ترچھی اور ڈھلوانی چھتوں والی یہ عمارتیں انتہائی عجیب اور بے ڈھنگی لگتی تھیں۔ کسی دور دراز جزیرے کی طرح تنہا یہ پہاڑی اور اس میں جگہ بہ جگہ ایستادہ یہ بڑے بڑے گھر اور ان کے پاس سے گزر کر بندرگاہ کی طرف جانے والے مجبور اور پریشان حال مزدور ـــــ یہ سب مناظر باہم ملکر' ایک نفرت انگیز ماحول کو جنم دیتے تھے۔ ان گھروں کا رخ سمندر کی طرف تھا تاہم ان کے در و دیوار کسی سیپی یا گھونگھے کی طرح ایک بند ماحول کو جنم دیتے تھے۔ اپنی خستہ حالی اور کہنہ سالی کے باوجود' ان میں ایک نرالی شان بھی تھی' انہیں دیکھنے والے یقیناً ان کی قدامت اور تاریخ کے بارے میں سوچتے رہ جاتے ہوں گے۔

ٹرک سٹارٹ ہو گیا مگر چلا نہیں۔ ڈرائیور کو اس کی توقع کے مطابق رقم نہیں ملی تھی اور وہ شاید اس پر ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ ''صبح صبح کیا شور شرابا ہو رہا ہے؟ کیا شمال والوں نے پھر حملہ کر دیا ہے؟'' ایک کرخت اور بے خوف آواز ہمارے سروں پر کوندی۔ ٹرک ڈرائیور نے بوکھلا کر ٹرک گیئر میں ڈال دیا اور چلتا بنا۔ ہم نے اوپر نگاہیں اٹھائیں تو ایک بالکونی سے کوئی نوجوان عورت ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں رانوں تک کھلی تھیں اور شانوں پر فوجی جیکٹ نظر آ رہی تھی۔ لحہ بھر کو اس نے باہر کا جائزہ لیا اور پھر اپنے بالوں کو سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میرے بڑے بھائی نے ٹرک کے پہیوں سے لپٹ لپٹ کر' اپنے کپڑوں کو گندا کر لیا تھا اور ابھی تک سڑک پر ہی کھیل رہا تھا۔ ابا اسے ہاتھ سے گھسیٹ کر ہمارے پاس لائے اور اس کے سر پر زوردار دھول جما دی۔ ہم ایک جگہ اکٹھے کھڑے تھے۔ ان کی نظر ہم پر پڑی تو خوش ہو کر بے ساختہ بولے۔ واہ واہ! یہ تو ہماری پوری پلٹن ہے!

صبح کے بادلوں کے بیچ سے سورج اپنا سر نکالنے لگا لیکن پہاڑی کے باسیوں میں کوئی ہلچل نظر نہیں آئی۔ شاید وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کئے ابھی تک نیند کے مزے لے رہے تھے۔ آسمان پر بکھری نیلاہٹ خود کو سمیٹ کر' پہاڑی کی چوٹی پر مرتکز کرنے لگی' بالکل ایسے ہی' جیسے طوفان آنے سے پہلے بادل ہر طرف سے آ کر ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

ماحول پر مسلط اندھیرا غائب ہوتے ہی وہ بو ـــــ جو مجھے سب سے پہلے محسوس ہوئی تھی ـــــ گزری رات کی نامعلوم اندھی شاخوں میں سے ہوتی' زمین کی تہوں میں دفن ہوتی دکھائی دی اور پھر سڑکوں پر' ہر سمت سے' کسی گہرے سانس کی طرح ابھرتی دکھائی دی۔ لمحے بھر

میں' میری ذہنی پراگندگی ہوا ہوگئی اور اردگرد کا ماحول مجھے مانوس اور اپنا اپنا سا لگنے لگا۔ بالآخر مجھے اس خوشبو کی نوعیت سمجھ میں آ گئی۔ یہ وہ موہوم سی خوشی تھی یا رنگین تصور تھا' جو اپنے گاؤں سے جلاوطنی کے ساتھ' ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوا تھا' ہماری یادوں میں رچ بس گیا تھا۔۔۔۔ جی ہاں' بچپن کی انمول اور انمٹ یادیں' جو کل رات میرے ذہن کے پردے پر دوبارہ منعکس ہونے لگی تھیں۔ کچھ عرصے بعد ہی' پھولوں کا موسم اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ماحول پر چھا گیا تھا۔ ان دنوں میرے چکروں میں بہت اضافہ ہوگیا۔ ہر وقت قے کرنے کو جی چاہتا اور میں بار بار باہری نالی کی طرف بھاگتی نظر آتی۔ میرا منہ جھاگ آلود لعاب سے بھرا ہوتا اور میرا چھوٹا بھائی صحن میں بیٹھا اپنے منہ اور ہاتھوں پر مٹی مل رہا ہوتا۔ لگتا ہے دادی اماں پورے موسم بہار میں میرے لئے دیسی نسخے تیار کرتی رہیں۔ گاہے بگاہے وہ ایک تلخ سے شربت کا پیالہ مجھے دیتیں اور میں بادل ناخواستہ' اپنی آنکھیں بند کئے' اسے پینے کی کوشش کرتی رہتی۔ اس کے پینے کے بعد مجھے بخار سا چڑھتا محسوس ہوتا۔ مجھے ہر شے زرد لگتی اور میں دادی اماں سے پوچھا کرتی کہ یہ صبح کا وقت ہے یا شام کا۔

''چھوٹی سی نامعقول لڑکی! یہ بتاؤ کہ کیڑے کلبلا رہے ہیں یا نہیں؟'' دادی اماں بات مذاق میں اڑا دیتیں۔ ایک دن میں اسی پیلاہٹ پنے کی اذیت میں مبتلا تھی۔ مجھے لگا جیسے میں کسی بھولے بسرے خواب میں چل رہی ہوں' اچانک پہاڑی پر موجود دومنزلہ گھر میرے بہت قریب آ گئے اور ان میں سے ایک گھر کا شٹر کھلا۔ اس میں سے ایک نوجوان آدمی کا پیلا چہرہ نمودار ہوا۔

امی پھر حاملہ ہوگئیں۔ ساتوں بچے کو جنم دینے کیلئے۔ ان دنوں جھینگے' مچھلی اور سور کا تازہ گوشت ان کا من بھاتا کھاجا تھے۔ کوئی اور چیز حلق سے نیچے اترتی ہی نہیں تھی۔ سو مجھے سکول جانے سے پہلے' پہاڑی کی دوسری جانب' جہاں دورویہ بنگلوں کا سلسلہ ختم ہوتا تھا' چائنا ٹاؤن کی آخری حد پر واقع بازار تک دوڑ لگانا پڑتی تھی۔ میں ایلومنیم کا پیالہ ہاتھ میں لیتی اور بند درودیوار والے بنگلے کے پاس سے تیزی سے گزرتی چلی جاتی اور سیدھی قصائی کی دکان پر جا کر سانس لیتی۔ قصائی بھی تقریباً میرے ساتھ ہی اپنے سامان کے ساتھ وہاں پہنچتا اور میرے سامنے اپنی دکان کھولتا تھا۔

میں ہر ہفتے' اس دکان سے سور کا ایک پاؤ گوشت خریدنے جایا کرتی تھی۔ امی میرے

ہاتھ میں کچھ پیسے رکھتیں اور چلتے چلتے مجھے خبردار کرنا نہ بھولتیں ''اگر وہ تمہیں پورا گوشت نہ دے تو اسے پراعتماد لہجے میں کہنا' مجھے بچی جان کر یہ حرکت کر رہے ہو' شرم کرو۔'' اور ساتھ ہی نصیحت کرتیں ''اس سے چربی والا گوشت نہ لینا۔''

قصائی ایک غیر شادی شدہ چینی تھا۔ اس کے رخسار پر پھوڑے کی طرح کا' خاصا بڑا سرمئی مائل ابھار تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے کسی نے زوردار مکا مار کر' اس کا منہ ٹیڑھا کر دیا ہے۔ لمبے بالوں کی لٹیں اس کے کندھوں تک آتی تھیں۔ میں پہلی دفعہ اس کی دکان پر گئی تو وہ اپنے چھرے کو تیز کر رہا تھا۔

''مجھے بچی سمجھ کر' اتنا تھوڑا سا گوشت دے رہے ہو؟'' میں نے بڑے حوصلے سے کہا۔ ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر بھی بمشکل میرا چہرہ اس کے کاؤنٹر تک پہنچتا تھا۔ میں اس وقت پیسے کاؤنٹر پر رکھ رہی تھی۔ قصائی فوراً مڑا اور گھبرا کر میری جانب دیکھنے لگا۔ اس خوف سے ــــــ کہ کہیں وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی گوشت نہ بنا دے ــــــ میں نے جلدی جلدی ماں کے الفاظ دہرا دیئے۔ ''انہوں نے کہا تھا' بغیر چربی کا گوشت دینا۔''

قہقہہ مارتے ہوئے' قصائی میرے لئے گوشت بنانے لگا۔ ''بغیر چربی کا کیوں؟ میں تمہیں بال اور کھال بھی ساتھ دے سکتا ہوں۔''

قصائی کی دکان کے برابر میں' اشیائے خوردنی' نمک' مصالحے' بھوری چینی وغیرہ کی دکان تھی۔ یہ چائنا ٹاؤن کا واحد جنرل سٹور تھا۔ ہمارے اردگرد کے لوگ قصائی کے پاس تو جاتے رہتے تھے مگر وہ سٹور سے عموماً کوئی چیز نہیں خریدتے تھے۔ نہ ہم کپڑے رنگ کراتے تھے' نہ پٹاخے خریدتے تھے اور نہ ہی ہمیں کپڑوں یا جوتوں پر منکے نقش کرانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ سٹور کا دروازہ صرف ایک طرف کھلتا تھا اور انتہائی روشن اور تیز دھوپ والے دن بھی دکان کا اندرونی حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تاہم شام کے وقت' وہاں چینیوں کا زبردست جمگھٹا ہوتا۔ جھٹ پٹے کے ساتھ ہی اردگرد کی گلیوں میں چینی ہی چینی نظر آنے لگتے۔ عورتیں اپنے بھاری کانوں میں بالیاں یا بندے پہنے ہوتیں۔ بند جوتے پہنے' شانوں پر ٹوکریاں لٹکائے اور سر جھکائے' ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ سی محسوس ہوتی۔

عورتیں خرید و فروخت کیلئے سٹور میں گھس جاتیں اور مرد سٹور کے باہر کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور سگریٹوں کے کش لینے لگتے یا لمبے پائپ پینے لگتے۔ یہ زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ تھے۔

ہم خاموشی سے' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے' ان کے بالکل قریب سے گزرتے ہوئے انہیں دیکھتے اوران کی طرف اشارہ کر کے کہتے: ''یہ لوگ افیم پی رہے ہیں۔گندے افیمی کہیں کے۔''

اور حقیقتاً' ان کے پائپوں سے نکلنے والا دھواں غیر معمولی طور پر زرد ہوا کرتا تھا۔بعض اوقات یہ بوڑھے لوگ' ہم بچوں کی جانب دیکھ کر مسکرا بھی دیا کرتے۔ ہمارے خاندان چائنا ٹاؤن کے بالکل ساتھ ہی رہتے تھے مگر چینیوں میں دلچسپی' صرف ہم بچوں کو ہی تھی۔ ہمارے بڑے انہیں ''نشئی'' کہتے تھے اوراچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

اگرچہ پہاڑی کی چوٹی پر رہنے والے ان چینیوں سے ہمارا کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا۔اس کے باوجود بھی وہ ہمارے لامحدود تخیل اوراستعجاب کا ایک اہم جزو تھے۔سمگلر' نشے باز افیمی' اپنے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں سونا چھپا کر لے جانے والے' برفیلی زمینوں کو روندتے نقاب پوش ڈاکو' اپنے دشمنوں کو ہلاک کر کے' ان کا کچا کلیجہ چبا جانے والے وحشی' انسانی جسموں کا گوشت اور قیمہ بنا کر بیچنے والے مردود قصائی' شمالی منچوریا کے میدانوں کے باسی' جہاں پاخانہ زمین پر گرتے ہی جم جاتا ہے——ان لوگوں کے بارے میں ہمارے تصورات کچھ اسی قسم کے تھے۔اتنے بند اور وحشت زدہ گھروں کے اندر آخر کیا ہے؟اوران کے ذہنوں کی گہرائی میں کیا لاوا پکتا رہتا ہے جو سالوں کی دوستی کے باوجود' یہ کسی کو نہیں بتاتے۔سونا ہے؟ افیم ہے؟ یا محض وہم وگمان؟

ہم چی آ ک کے گھر پہنچے تو اس نے کہا''آج یہیں بیٹھ کر ہوم ورک کر لیتے ہیں۔''

اس نے بالکونی پر لٹکے ہوئے کمبل اور صاف بستر کی جانب دیکھا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ میگی کہیں گئی ہوئی ہے۔ وہ اگر گھر میں ہوتی تو بستر کے اندر' یہی کمبل اوڑھے پڑی ہوتی۔ میں نے سڑک کے پار' اپنے گھر کی جانب نگاہیں دوڑاتے ہوئے' کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ امی اور دادی اماں چی آ ک کے گھر کو امریکی فوجیوں کا عشرت کدہ کہا کرتی تھیں۔آس پڑوس میں صرف ہمارا گھر ہی تھا' جہاں کسی طوائف کو کرائے پر کمرہ نہیں دیا گیا تھا۔یہ عورتیں عموماً اپنے کمرے کا خارجی دروازہ کھلا رکھتیں اور امریکی فوجی' اپنی سہولت کے مطابق جب چاہتے ان کے پاس آ دھمکتے۔گندے اور ناپاک کمبل اور رنگ برنگے زیر جامے' ان کی بالکونی پر لٹکے' سورج کی تپش اور دھوپ میں سوکھتے ہوئے' گندی رات کی کہانیاں سنا رہے ہوتے تھے۔

''چھی' چھی' حد ہے بے شرمی کی۔'' دادی اماں ان کپڑوں سے نظریں ہٹاتے ہوئے بڑبڑاتیں۔ان کے خیال میں عورتوں کو اس طرح کے کپڑے گھر کے اندر سکھانے چاہئیں تھے۔

چی آ ک کے ماں باپ نچلی منزل پر رہتے تھے اور میگی کسی کالے کے ساتھ اوپری منزل پر رہ رہی تھی لیکن چی آ ک کو اپنے کمرے میں جانے کیلئے' میگی کے اوپری راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔اس کا اپنا کمرہ بہت چھوٹا اور تنگ و تاریک تھا۔ میں صبح کو جب بھی سکول جانے کیلئے' اسے بلانے جاتی تو میں عین میگی کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے آواز دیا کرتی۔ چی آ ک کے مطابق میگی کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی وہ سامنے بیڈ پر الٹی سیدھی پڑی ہوتی اور اس کا کالا ساتھی ڈریسنگ کے آس پاس' کسی کام میں مصروف ہوتا۔ بہت ہیبت ناک چہرہ تھا اس کا۔ میں کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے' چی آ ک کو آواز دیتی اور اس اثنا میں تانک جھانک میں لگی رہتی۔ کالے کے سینے پر بے تحاشا چڑھا ہوا گوشت کسی ربڑ کی طرح لگتا۔ دھندلی دھندلی آنکھیں اور بڑی بڑی مونچھیں اسے خاصا خوفناک بنائے رکھتی تھیں۔ وہ عموماً منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتا۔ مجھے دیکھ کر کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ حد درجہ بے رونق اور اداس آدمی تھا وہ بھی۔

''تم مجھے سڑک پر سے ہی آواز نہیں دے سکتیں؟'' چی آ ک نے ایک بار پوچھا'' وہ کالا آدمی تمہارا آنا جانا بالکل پسند نہیں کرتا۔'' لیکن میں ہر بار سیڑھیاں چڑھ کر اس کے ادھ کھلے کمرے میں جھانک کر ہی چی آ ک کو آواز دیا کرتی۔''میگی نے کہا تھا کہ وہ رات گئے واپس آئے گی۔ہم بے فکر ہو کر اس کے بیڈ پر کھیل سکتے ہیں۔'' چی آ ک نے مجھے بہلایا پھسلایا۔

میں نے ایک لمحے کو سوچا۔ امی کی صبح سے طبیعت خراب تھی۔ وہ غالباً اپنے کمرے میں لیٹی' باقی گھر والوں کو پریشان کر رہی ہوں گی۔ بڑا بھائی باہر کہیں جھینگر یا چھچھوندر پکڑنے کے چکر میں ہوگا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ گھر پہنچتے ہی دادی اماں حکم دیں گی کہ چھوٹے بھائی کو اٹھاؤ اور باہر سیر کرانے لے جاؤ۔سو میں نے چی آ ک کے ساتھ' اوپری منزل پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔میگی کی بیٹی جینی بستر پر دراز' بے سدھ سو رہی تھی۔ پردوں کی وجہ سے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ چی آ ک نے ایک الماری کھولی اور اس میں سے کچھ بسکٹ نکالے۔ خاصے مزیدار اور خستہ لگ رہے تھے۔

''کیا خوبصورت چیز ہے؟'' میں نے پرفیوم کی ایک بڑی سی بوتل کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا۔ چی آ ک نے اسے اٹھایا اور یوں ظاہر کیا جیسے خوشبو اپنی بغل میں چھڑک رہی ہو۔ ''میڈ ان امریکہ'' ایک بار پھر اس کے ہاتھ الماری کی جانب بڑھ گئے۔ وہ اندر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس بار ہاتھ باہر آئے تو اس میں کچھ ٹافیاں تھیں۔

''بڑی مزیدار ہیں یہ تو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! کیونکہ یہ امریکہ کی بنی ہوئی ہیں۔'' چی آ ک نے بھی اسی طرح لہکتے ہوئے کہا۔

اس اثناء میں جینی کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ ہمیں دیکھ رہی تھی۔

''جینی! کتنی پیاری بچی ہو! دیکھو ہم یہاں سکول کا کام کریں گے، تم پچھلی طرف جا کر سو جاؤ۔'' چی آ ک نے اپنی ہتھیلی سے جینی کی پلکوں کو بند کرتے ہوئے، بڑے پیار سے کہا اور بچی نے کسی گڑیا کی طرح فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میگی کے کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ شاندار لگ رہی تھی۔ چی آ ک ہر چیز مجھے بس لمحے بھر کو دکھاتی اور میں ایسے خوش ہوتی جیسے وہ مجھے ہی تو مل گئی ہے۔ پھر وہ چیز اسی طرح اپنی جگہ پر پہنچ جاتی تا کہ کسی کو بھی اس چھیڑ چھاڑ کی خبر نہ ہو۔ ''ایک زبردست آئیڈیا آیا ہے۔'' چی آ ک نے بیڈ کے اوپر بنی چھوٹی سی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہاں سے اس نے سبز رنگ کے محلول کی ایک نیم بیضوی بوتل نکالی۔ بوتل کی سطح پر ناخن سے ہلکا سا نشان لگایا تا کہ محلول کی اونچائی کا اندازہ رہے۔ پھر اسے کھول کر اس کے ڈھکنے میں تھوڑا سا محلول مجھے دیا ''اسے چکھو، خاصا میٹھا ہے، کسی مینتھول کی طرح۔ میں فوراً اسے چڑھا گئی اور ڈھکنا چی آ ک کو دے دیا۔ اس نے دوبارہ ڈھکنا بھرا اور اپنے منہ سے لگا لیا۔ محلول نشان زدہ سطح سے دو انگلی نیچے آ گیا تھا۔ چی آ ک نے پانی ڈال کر اس فرق کو ختم کر دیا۔ بوتل کو ڈھکنا لگایا اور اس کی جگہ واپس رکھ دیا۔

''کمال ہے! کیسا تھا؟ مزیدار تھا نا؟'' میرے منہ میں حرارت اور تازگی کا عجیب سا احساس تھا جیسے میں نے پودینے کا ست پی لیا ہو۔ ''کسی کو بتانا نہیں۔'' چی آ ک نے کپڑوں کی دراز میں سے ایک ویلوٹ باکس نکالتے ہوئے کہا۔ میگی کے کمرے کی ہر چیز ایک سربستہ راز تھی۔ باکس میں موتیوں کا ایک بڑا سا تین لڑی کا ہار تھا جس میں رنگ برنگے موتی چمکتے نظر آ رہے تھے۔ ساتھ ہی کانوں کے بندے اور کچھ اور زیور بھی تھا۔ چی آ ک نے ایک نیکلس اپنی گردن میں پہن لیا اور سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔

''بڑی ہو کر، میں بھی کسی امریکی فوجی کی داشتہ بنوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں

کہا۔ ''میگی نے کہا ہے کہ وہ مجھے نیکلس' جوتے' کپڑے غرض ہر چیز دے گی۔''

مجھے اپنا آپ پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا' میری انگلیاں اور پنجے سن ہو رہے ہیں۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں' یہ کمرے کی تاریکی تھی' سانس باہر لیتے ہوئے مجھے لگا جیسے میرے منہ سے ہر دفعہ سفید سی لکیر نکل رہی ہے۔ میں نے بالکونی پر پڑے پردے ہٹا دیئے تاکہ سورج کی روشنی کمرے میں آ سکے۔ روشنی کی کرنیں اندر آتے ہی فضا میں کچھ بہتری محسوس ہوئی۔

میں نے اپنے تمتماتے رخسار دروازے کے ناب پر رکھے اور باہری فضا میں دیکھا۔ ایک بار پھر مجھے' چائنا ٹاؤن کا دو منزلہ گھر کھلا نظر آیا۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا گویا میرا ہی منتظر تھا۔ عجیب ناقابل فہم اداسی اور ناقابل بیان ہمدردی کی لہر میرے سینے میں اترتی ہوئی' میرے پورے بدن میں پھیل گئی۔

''کیا بات ہے؟ کیا تمہیں چکر آ رہے ہیں؟'' چی آ ک نے مجھ سے پوچھا۔ اسے سبز محلول کی اصلیت اور اس کے اثرات کا غالباً اچھی طرح علم تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی بالکونی کے دروازے سے جھانکنے لگی۔

ناسمجھی اور بے خودی کی سی کیفیت مجھ پر سوار تھی۔ دوسری منزل کی کھڑکی سے نظر آتے چہرے کو دیکھ کر' میں اپنے جذبات بے قابو ہوتے محسوس کر رہی تھی' اسی اثناء میں کھڑکی کا دروازہ بند ہوا اور اس نوجوان کی شکل غائب ہو گئی۔

چی آ ک کے گلے میں پڑے نیکلس کے موتی آپس میں ٹکرا کر جھنکار پیدا کر رہے تھے۔ ان کے رنگ سورج کی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ چی آ ک نے ایک موتی کو اپنے منہ میں لے لیا۔ ''میں بھی کسی فوجی کو ساتھ رکھوں گی۔''

میں نے پردے کھینچ کر برابر کر دیئے اور بستر پر لیٹ گئی۔ وہ کون ہو سکتا ہے؟ میں نے کسی بھولے بسرے خواب کو دوبارہ یادوں کے پردے پر لانے کی کوشش کی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے پچھلی خزاں میں نائی کے پاس دیکھا تھا۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے' مجھے کرسی پر تختہ رکھ کر بیٹھنا پڑا تھا' میں نے امی کے کہنے کے مطابق نائی کو باقاعدہ ہدایات دی تھیں۔ ''بال چھوٹے کرنا' دونوں طرف سے اور پیچھے سے بھی مگر اوپری بالوں کو لمبا ہی رہنے دینا۔ پہلے ہی میری شکل وصورت اچھی نہیں۔ الٹے کٹورا کٹ بال بالکل نہیں چلیں گے۔''

لیکن نائی کے بال کاٹنے کے بعد' جب میں نے اپنے بال کٹورا کٹ ہی دیکھے تو مجھے غصہ آ گیا مگر میرے بولنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

''شکایت کرنے کا فائدہ؟ اگلی دفعہ میں تمہارے بہتر بال بناؤں گا۔ وعدہ رہا!''

''مجھے علم تھا کہ تم یہی کرو گے۔ تم بال کاٹنے پر توجہ دینے کے بجائے گپیں کیوں لگانے لگتے ہو؟''

نائی نے تختہ میرے نیچے سے نکال کر ایک طرف رکھا اور کہا ''کیا ننھی منی سمارٹ بچی ہے لیکن بولنے کا انداز اچھا نہیں۔ میں شرطیہ کہتا ہوں' تم شروع سے ہی اس طرح بولتی ہو گی' کسی نے تمہیں ٹوکا نہیں؟''

''میں کیسی بولتی ہوں' یہ میرا مسئلہ ہے لیکن میں شرطیہ کہتی ہوں' تم پچھلے جنم میں قصائی رہے ہو گے۔'' دوسرے گاہک یہ سن کر بری طرح ہنس پڑے۔ میں نے اپنے اردگرد فاتحانہ نظر ڈالی۔ نائی کے علاوہ' ایک اور نوجوان بھی ـــــ جس کے گلے کے گرد کپڑا بندھا ہوا تھا۔ لوگوں کو ہنستے دیکھ رہا تھا۔ نوجوان شیشے میں سے میرا جائزہ لے رہا تھا ''یہ تو چینی ہے۔'' اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے اسے سڑک کے پار جا کر دیکھا' خاصا فاصلہ تھا' پھر بھی اس کی غیر متجسس نگاہوں سے مجھے یہی تاثر ملا۔ ''مرتے دم تک تم محض بال کاٹنے والے قصائی ہی رہو گے۔'' میں نے دور سے گویا نائی کو بددعا دی اور اپنے گھر کی طرف تیزی سے بڑھ گئی۔

ابا گھر میں ضرور تبدیلیاں کروا رہے تھے۔ پناہ گزینی کے دنوں کے دکھ اور تکالیف کو وہ اب راحت' خوشی اور آرام میں بدلنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے ـــــ وہ وقت بھی تھا جب ہم سب گھر والے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک دوسرے پر چڑھے بیٹھے ہوتے تھے یا وہ چھوٹا سا خیمہ' جس میں ہم سب اکٹھے سا ہی نہیں سکتے تھے' ابو بعض بچوں کو باہر میدان میں یا پل کے نیچے لئے کھڑے' انہیں حرارت دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ انہوں نے گھر کے خالی احاطے میں ایک کمرہ اور برآمدہ بھی بنوا لیا تاکہ گھر ہماری ضروریات کے مطابق ہو سکے۔

بہرحال ہوا یہ کہ گھر کے اندر ایک لمبی اور پتلی سی' بھول بھلیاں' راہداری نے جنم لیا جو تمام کمروں کو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے ملاتی تھی۔ ٹوائلٹ کے پیچھے ایک ایسا کمرہ وجود میں آ گیا کہ جہاں میں بے خوف وخطر گھنٹوں چھپ سکتی تھی۔ یہاں گھر کی ساری فالتو چیزیں اور پرانا ساز وسامان ڈال دیا گیا۔

اسی بے ہودہ روز، جس دن میں نے بال کٹوائے تھے، میں کمروں کو دیکھتی، سیدھی اس اندھیرے کمرے میں جا پہنچی اور میرا چہرہ زوردار طریقے سے وہاں رکھے جار سے ٹکرا گیا۔ ہڈیوں پر پڑنے والی شدید ضرب سے پیدا شدہ کرنٹ، لگتا ہے اسی جار میں جا کر جمع ہو گیا۔

اس کے علاوہ بھی، کئی بار ایسا ہوا، میں شام کے وقت نیچے ابا کی دکان پر شام کے اخبار کے انتظار میں کھڑی ہوتی تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ اداس اور غمزدہ چہرے والا نوجوان، اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑا، میری راہ تک رہا ہے۔

''جینی! اٹھو بھئی، تمہاری امی آنے والی ہیں جینی!'' چی آ ک نے انتہائی ملائم لہجے میں بچی کو جگایا۔ جینی نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھی۔ چی آ ک نیچے سے نیم گرم پانی بھرا برتن اٹھا لائی اور اس کا منہ دھلانے لگی۔ صابن کا پانی آنکھوں میں گھس جانے کے باوجود جینی نے قطعی شور نہیں مچایا۔ ہم نے مل جل کر اس کی کنگھی کی۔ اس کے پرفیوم لگائی اور جو کپڑے بھی ہمیں مل سکے، اسے اچھے طریقے سے پہنانے لگے۔ جینی کا باپ کوئی سفید فام تھا جبکہ ماں کوریائی تھی۔ پانچویں سال میں لگنے کے باوجود اس نے ابھی بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے آپ کھا پی بھی نہیں سکتی تھی۔ کپڑے ضرور الٹے سیدھے پہن لیتی تھی۔ کھانے کے دوران، عموماً کھانے کا کچھ حصہ منہ کے ایک جانب سے نکلتا رہتا تھا۔ کالے آدمی کی موجودگی میں جینی چی آ ک کے گھر والوں کے پاس رہا کرتی تھی۔

دادی اماں کبھی کبھار، بالکونی میں کھڑی باہر کا نظارہ لے رہی ہوتیں اور ان کی نظر جینی پر پڑ جاتی تو ان کا برا سا منہ بن جاتا۔ ان کی آنکھوں میں اس کیلئے نفرت ہی نفرت ہوتی۔ یوں لگتا جیسے انہوں نے کسی گندے جانور کو دیکھ لیا ہے۔ میں دادی کی اس متنفر نگاہ سے بہت خوفزدہ ہوتی تھی۔ کسی زمانے میں ہمارے ہاں چوہوں نے دھاوا بول دیا تھا چنانچہ ہمیں بلی کا بندوبست کرنا پڑا۔ بلی نے سٹور میں بچوں کو جنم دیا۔ دادی اماں نے اس کا خاص خیال رکھا اور اسے خوب کھلایا پلایا تاکہ وہ تندرست ہو جائے۔ پھر ایک شام انہوں نے بلی کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کئی بار یہ جملہ کہا ''بلی کے پاس کچھ چوہے کے بچے ہیں، سات بچے چوہے کے۔'' بلی اسی شام ان ساتوں بچوں کو ہڑپ کر گئی۔ صرف ان کے سر باقی پڑے تھے، پھر اپنے اسی خون آلود چہرے کے ساتھ وہ ساری رات روتی پیٹتی رہی۔ دادی اماں غالباً اسی صورتحال کی منتظر رہی تھیں۔ انہوں نے بلونگڑوں کے سر نیچے سیوریج میں پھنکوا دیئے۔

امی ان کی درشتی اور سفا کی کی وجہ یہ بتاتی تھیں کہ وہ کبھی ماں نہیں بنی تھیں۔ دراصل وہ ابو کی سوتیلی والدہ تھیں۔ ایک دفعہ میں نے امی کو اپنی کسی رشتہ دار سے یہ کہتے ہوئے سنا تھا ''ان کی شادی کو صرف تین مہینے ہوئے تھے کہ ان کے میاں کا اپنی سالی سے چکر چل گیا اور وہ بڑی بی سے الگ ہو گیا۔ نا قابل یقین بات ہے؟ پھر وہ ہمارے ساتھ آ کر رہنے لگیں۔''

چی آ ک کیلئے جینی کسی گڑیا کی طرح تھی۔ وہ اسے نہلاتی' دھلاتی' اسکے کپڑے تبدیل کراتی۔ بعض اوقات تو ہر آدھ گھنٹے بعد اسے بناتی اور سنوارتی۔ میگی کے کبھی جھڑکنے یا غصے ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ جینی اس کیلئے کبھی چھوٹا سا بچہ ہوتی' کبھی چھوٹی سی بیمار لڑکی ہوتی اور کبھی ایک فرشتہ ہوتی۔ میں چی آ ک پر رشک کیا کرتی تھی۔ شاید میرے چہرے پر ابھرے تاثرات سے وہ سمجھ بھی لیتی ہو۔

''تمہاری کوئی بہن نہیں ہے کیا؟'' چی آ ک نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ہے مگر سوتیلی۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ تمہاری حقیقی امی نہیں؟''

''وہ میری سوتیلی امی ہیں۔'' میں نے بڑی مشکل سے یہ جھوٹ اپنے گلے سے نیچے اتارا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''اچھا! میرے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ کسی کو بتانا نہیں' میری ماں بھی سوتیلی ہے۔'' چی آ ک نے کہا یہ راز اڑوس پڑوس میں ہر کسی کو معلوم تھا۔ بہرحال سب نے اپنی چھوٹی انگلی چی آ ک کی چھوٹی انگلی سے ملائی اور اس طرح ایک دوسرے کے راز کو راز رکھنے کا وعدہ کیا۔

''تب تو تمہاری امی تمہیں خوب مارتی ہوں گی' ڈانٹتی ڈپٹتی ہوں گی' دفع ہو جانے اور کہیں ڈوب مرنے کا بھی کہتی رہتی ہوں گی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہاں' جب کوئی اور نہیں ہوتا۔'' چی آ ک نے اپنی پینٹ اتار کر اپنے زخمی کولہے دکھائے۔'' میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی اور کسی امریکی کے ساتھ رہنے لگوں گی۔''

نہ جانے کتنی بار یہ خواہش میرے دل میں بھی ابھری تھی کہ کاش میری ماں سوتیلی ہوتی تا کہ میں بھی' اپنی مرضی سے گھر سے بھاگ جانے کا سوچ سکتی اور ادھر امی ساتویں بچے کو جنم دینے والی تھیں۔

چائنا ٹاؤن کے برابر میں واقع اس بستی میں کسی بھی بچے کو یہ یقین نہیں تھا کہ آنے والا

بچہ آدھی رات کو، آسمان سے آنے والا فرشتہ، اپنے ہاتھوں میں لاتا ہے یا ماں کے پیٹ کے بٹن کھلنے پر، ہنستا مسکراتا بچہ باہر آجاتا ہے۔ سب کو اچھی طرح علم تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ چیختا چلاتا، ماں کی ننگی ٹانگوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

ہم امریکی فوجیوں کے ٹھکانے کے پاس کھڑے، ان کی نشانہ بازی کی مشق دیکھ رہے تھے۔ ٹی شرٹس پہنے فوجی، ٹینس کے میدان میں کھڑے اپنے سامنے موجود، ایک مخصوص جگہ پر بنے سیاہ دائرے کو اپنے خنجر سے نشانہ بنا رہے تھے۔ خنجر ان کے ہاتھوں میں سے کسی نوکیلی سوئی، چمکتی بجلی یا کسی آدمی کے سفید چمکدار بالوں کی طرح، تیزی سے فضا میں چمکتے گھومتے اپنے نشانے کی جانب بڑھتے نظر آ رہے تھے جونہی خنجر گول سیاہ دائرے کے اندر پیوست ہوتا تو وہ لوگ کسی جانور کی طرح چیخ کر خوشی کا اظہار کرتے اور ہم خوفزدگی سے کانپ کر رہ جاتے۔

ایک سفید فام فوجی ہر بار نشانہ لیتے ہوئے، پہلے سے کچھ قدم پیچھے ہٹ جاتا۔ اس نے ایک بار پھر نشانہ لیا اور خنجر ہاتھ سے چھوڑتے چھوڑتے، اس کے ہاتھ کا رخ بدل گیا۔ خنجر ہوا میں اڑتا ہوا ہماری جانب لپکا۔ ہم سب دہشت کے مارے، باڑ کے گرد، بری طرح گر پڑے۔ میں نے اپنی ٹانگوں کے درمیان گرم سی گیلاہٹ محسوس کی۔ چند لمحوں بعد، ہم نے خود کو سنبھالا اور اٹھے۔ اس خبیث فوجی نے ہمارے عقب میں کسی چیز کو نشانہ بنایا تھا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا کچھ دور ایک سیاہ بلی کمر کے بل زمین پر پڑی تھی، اس کی ٹانگیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ خنجر اس کے سینے میں جا گھسا تھا۔ یہ غالباً ان آوارہ اور لاوارث بلیوں میں سے تھی جو فوجی اڈے کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ وہ ابھی تک تڑپ رہی تھی۔ ہم اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ ناگہاں میرے بڑے بھائی نے بلی کو پکڑا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ ہم سب بھی پیچھے پیچھے بھاگے۔ میرا گیلا زیرجامہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔

ہم امریکی بیرکوں سے باہر نکل آئے تو میرا بھائی ہانپتا کانپتا رک گیا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا کہ اس نے کیا پکڑ رکھا ہے۔ وہ بری طرح کپکپایا اور اس نے بلی کو وہیں پھینک دیا۔ وہ زوردار دھماکے سے زمین پر جا گری۔

''تمہیں یہ چیز وہاں سے لانے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' ایک بچے نے سوال داغ دیا۔

چیلنج کی فضا میں میرے نپولین جیسے بہادر ننھے بھائی نے خنجر بلی کے سینے سے باہر نکالا، اس کے بلیڈ کو گھاس کے ساتھ صاف کیا۔ وہ بے پناہ تیز اور سوئے کی طرح نوکیلا لگ رہا تھا۔

اس نے خنجر کو تہ کیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''کوئی جا کر' ایک ٹہنی لائے۔'' اس نے کہا۔

بچوں میں سے کوئی' قریب ہی موجود ایک درخت کی ٹہنی توڑ لایا۔ یہ درخت ہم نے پچھلی بہار کے دنوں میں ہی لگایا تھا۔ بھائی نے کمر سے بیلٹ اتاری' اسے ایک جانب سے بلی کی گردن میں باندھا اور دوسرا حصہ ٹہنی سے باندھ دیا۔ اس نے ٹہنی کو اٹھایا اور ہم سب مارچ کرتے ہوئے سڑک پر چلنے لگے۔ بلی زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی اور بھائی کے کندھے پر پڑی ٹہنی کسی کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی۔

چائنا ٹاؤن تک آتے آتے' موسم گرما کا طویل دن ڈھلنے لگا تھا۔ جوں جوں سورج افق میں ڈوب رہا تھا' بلی کا سایہ بڑا اور بے ہنگم ہوتا جا رہا تھا۔ فلور مل کے مزدور پہاڑی سے نیچے اترتے نظر آئے' ان کے بالوں میں سفید آٹا بھرا ہوا تھا اور ان کے خالی لنچ باکس ہوا میں لہراتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ ہم اپنے پھیلتے' دہشت انگیز سائے دیکھتے' ایک دوسرے کو ڈراتے' بلی کی طویل اور بے ہنگم پرچھائیں پر نگاہ ڈالتے اور کپکپاتے ہوئے' بندرگاہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ وہاں میں نے اسے دوبارہ دیکھا۔ دوسری منزل کی کھڑکیوں کے پٹ کھلے تھے اور اس کی نگاہ ہمارے جلوس پر تھی۔ میں اس کی چبھتی نظر برداشت نہیں کر سکی مگر میرے خیال میں' میں نے اس میں دکھ' غصہ اور غالباً ایک مجروح مسکراہٹ دیکھی تھی۔

ساحل پر پہنچے تو بھائی نے بیلٹ بلی کی گلی سے نکالی اور دوبارہ اپنی کمر سے باندھنے لگا مگر کراہیت کی وجہ سے بار بار تھوکے جا رہا تھا۔ پھر اس نے بلی کو گندگی کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا' جہاں پہلے ہی کوڑا کرکٹ اور لاتعداد مردہ جانوروں کے پنجر پڑے نظر آ رہے تھے۔

سورج غروب ہونے کے وقت' ہم عموماً پارک میں اکٹھے ہوا کرتے تھے چنانچہ ساحل سے ہم سیدھے پارک کی جانب چلے گئے۔ ہم یہاں پیٹ کے بل زمین پر لیٹ کر' امریکی فوجیوں کی داشتاؤں کے سکرٹس میں جھانکنے کی کوشش کرتے اور اس کے اندر چھپی موٹی تازی ٹانگوں کو دیکھ کر حیران ہوتے یا انتہائی کاہلی کے عالم میں گھاس پر بیٹھ کر' ایک بہت پرانا گیت گانا شروع کر دیتے۔ یہ گیت غالباً بوڑھی طوائفیں اکیلے میں زیر لب گنگناتی ہوں گی۔

میں مڑ کر جب بھی پیچھے دیکھتی ہوں
تلاطم خیز سیلاب آنسوؤں کا
مجھے غرقاب کرنا چاہتا ہے

میں پیاسی واپس آئی ساحلوں سے
جوانی کا گلہ کرنا بھی بے کار
جوانی بھی عبارت ہے دکھوں سے
ادھوری خواہشوں پر مشتمل کل
تو، مستقبل ہے تنہائی کا جنگل
میں مڑ کر جب بھی پیچھے دیکھتی ہوں!

لیکن اس دفعہ ہم خاموشی سے چلتے جا رہے تھے' بلکہ یوں سمجھیں کہ ہواؤں میں اڑتے جا رہے تھے۔ پارک میں سب سے بلندی پر کسی بوڑھے جرنیل کا کانسی کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ چند سال پہلے اس نے یہاں ایک کامیاب زمینی آپریشن کیا تھا اور اب وہ یہاں کا ایک دیو مالائی کردار بن گیا تھا۔ اس جگہ سے سارے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

ساحل سمندر پر کشتیاں اور جہاز لنگر انداز تھے اور ان کے جھنڈے رنگ برنگے کاغذوں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے' ایک کرین مختلف جگہوں سے سامان اٹھا کر' ساحل پر رکھ رہی تھی۔ ذرا فاصلے پر سمندر میں کوئی چھوٹا سا ٹاپو یا شاید کوئی بڑی مچھلی تیرتی نظر آ رہی تھی۔ ممکن ہے وہ کوئی غیر ملکی بحری جہاز ہی رہا ہو۔

ہمارے عقب میں موجود کیتھولک چرچ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ یہ وہ آواز تھی جو بلی کو گندگی کے ڈھیر پر پھینکنے کے بعد سے —— نہیں' اس سے بھی پہلے سے' جب ہم نے پہلی بار ایک اور مری ہوئی بلی اسی طرح سمندر کی لہروں کے حوالے کی تھی —— ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ ایک جیسی' کبھی ختم نہ ہونے والی' وقفے وقفے سے آتی گھنٹیوں کی آواز' نہ جانے کیسی خواہشوں اور مزاجوں کو ایک نئی ہم آہنگی عطا کرتی ہو گی۔ گھنٹی کی آواز نے میرے ذہن کے کسی گوشے میں محو اس خوفناک دھماکے کی یاد دوبارہ تازہ کر دی' جو میں نے' گرمیوں کی ایک شام' عالم خواب سے بیدار ہوتے ہوئے سنا تھا۔ رات کے گہرے سناٹے میں ٹرین کے پہیوں کی زوردار گونج اور اس کے بریکوں کے بے مہابا شور —— یہاں یہی مجھے بیدار کرنے کا باعث بنا تھا۔ ''نن بیچاری تو مر گئی ہو گی۔'' کسی شخص نے دوسرے کو بتایا۔

ہمارے ذہنوں میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ ایسی گھنٹیاں' اس انداز میں' اسی وقت بجا کرتی ہیں جب کوئی نن موت کی وادی میں' پرسکون انداز میں اتری ہو۔

ریلوے لائن کے پار، فلورمل کی چمنیوں سے نکلتا ہوا سیاہ دھواں، جنگ سے تباہ شدہ اس علاقے کے آسمان پر اس طرح پھیل رہا تھا جیسے میدان جنگ سے گرد وغبار اڑ رہا ہو۔

زمینی آپریشن کے دوران، بحری جنگی جہازوں کی شدید ترین بمباری جنگ کی تاریخ میں، لمبے عرصے تک، بھلائی نہیں جا سکے گی۔ ہم بڑے بوڑھوں سے یہ بات اکثر سنا کرتے تھے۔ پڑوس میں موجود کچھ گھروں کی عمارات، جو دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کے قبضے میں تھیں یا پہاڑی پر موجود دو منزلہ عمارتوں کے سوا، یہاں کچھ بھی نہیں بچا تھا، ہر طرف کھنڈرات اور ملبے کے ڈھیر تھے۔

شہر کی مغربی جانب ابھی سورج کی روشنی باقی تھی تاہم چائنا ٹاؤن اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ شاید آسمان پر پھیلتے دھوئیں سے یہ اندھیرا اور بھی دبیز ہو گیا ہو، یا ممکن ہے کوئلے کے احاطے سے آتی ہوئی شمالی ہوا، فضا میں کوئلے کے ذرات اور دھول پھیلا رہی ہو۔

شہر کے اس بلند ترین مقام سے چائنا ٹاؤن کا، اس کے دورویہ، دو منزلہ گھروں کی بالکونیوں پر لٹکے رنگین کمبلوں اور زیر جاموں تک کا مکمل نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ تھے وہ مناظر اور نشیب وفراز جن سے اس شہر کی چیستانی مسکراہٹ جنم لیتی تھی۔ میرے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ انہی تصورات کے بوجھ میں دھنسا رہتا تھا۔ میرے نزدیک، چائنا ٹاؤن اور ہمارے پڑوس کا علاقہ، ایک غرق ہونے والے جہاز کے مضبوط اور سخت جان عقبی حصے کی طرح تھے۔

شام ہوتے ہی، شہر کے مشرقی حصے میں واقع کھیل کے گراؤنڈ میں، مشعلوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔ دھیمی اور مدہم روشنیاں دور از کار ستاروں کی طرح لگتیں۔ آسمان کے نیچے ایک اور آسمان کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ لوگوں کا ایک گروہ بڑے زور وشور سے نعرے لگا رہا تھا ''چیکو سلواکیہ واپس جاؤ، پولینڈ واپس جاؤ، کٹھ پتلی حکومت واپس جاؤ''۔ ہر گھر سے روزانہ ایک آدمی اس جلسے میں ضرور شریک ہوتا تھا اور پھر وہاں پر جوش نعرے لگائے جاتے۔ لوگ پنجوں کے بل، پورا زور لگا کر، انتہائی جذباتی انداز میں نعرے بازی کیا کرتے تھے۔ دادی اماں اس جلسے سے واپسی پر بری طرح تھکی ماندی نظر آتی تھیں۔

ہماری پرنسپل نے، ایک دن صبح کی اسمبلی میں بچوں کو وضاحت سے بتایا کہ لوگ چیکو سلواکیہ اور پولینڈ کے خلاف کیوں احتجاج کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دونوں ملک روس کے حواری اور غیر جانبدار تحریک کے رکن ہیں اور ان کی امن افواج یہاں، امن وامان کے قیام

کے بجائے' اقوام متحدہ کے خفیہ راز ڈھونڈ ڈھونڈ کر کمیونسٹوں کو پہنچاتے ہیں۔

اگر نعرے بازی کے دوران میں اپنا سر گھٹنوں میں دیئے رکھتی تو ان نعروں کا شور بہت دور سے آتا محسوس ہوتا جیسے کسی خالی بوتل میں پوری شدت سے پھونک مارنے سے سیٹی کی سی گونج پیدا ہوئی' ہو حالانکہ اس گونج سے زمین تک دہل جاتی تھی' یوں لگتا تھا جیسے طوفان بادوباراں ہمیں ہر سمت سے لپیٹ میں لے رہا ہے۔

گھر میں' میں نے امی کو برآمدے کی نالیاں صاف کرتے دیکھا تو پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ ہماری مائیں گھر کے اندر کیسے کیسے کٹھن کام کر رہی ہوتی ہیں۔ حاملہ ہوتے ہوئے بھی انہیں گھر کے اکثر کام خود کرنے ہوتے تھے۔ مجھے ان سے شدید ہمدردی ہونے لگی۔ میں نے خاموشی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ اب وہ میرے مزید بہن بھائی پیدا کرنے سے باز آ جائیں۔ ان حماقتوں سے ان کی زندگی کو شدید خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔

رات گئے تک مجھے نیند نہیں آئی۔ میری بڑی بہن کے سینے کے ابھار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس لئے دادی اماں نے' کوئی سکرٹ ادھیڑ کر اس سے اس کا بریزیر بنا دیا تھا لیکن کپڑے کی اندرونی سطح اس کے سینے کو تنگ کر رہی تھی۔ اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں بریزیر کو الٹا کر' سینے پر کس لیا تھا۔ جاگتے ہوئے' میں چوکیدار کے قدموں کی قریب آتی اور دور جاتی چاپ سنتی رہی۔ نزدیک سے گزرتی مال گاڑی کے پہیوں کو گننے کی کوشش کرتی رہی۔

صبح ہوئی تو میں ساحل کی طرف نکل گئی۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے پاس بلی کا نام و نشان نہیں تھا۔ شاید کسی قریبی علاقے کے بچے اس کے گلے میں رسی باندھ کر لے گئے ہوں اور اب ایک دوسرے کو اس سے خوفزدہ کر رہے ہوں گے۔

خزاں قریب آ چکی تھی مگر اس دفعہ کھٹمل اتنی تیزی سے پھیلے کہ پہلے کبھی ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ہم روزانہ اپنے بستر کے گدے اور چادریں دھوپ میں پھیلاتے اور خوب گرمی لگاتے تاکہ ان سے جان چھوٹے۔ رات کے بارہ بجے تک لائٹ جلتی رہتی تو امن و امان رہتا مگر بجلی جاتے ہی' ان کا خوفناک حملہ شروع ہو جاتا۔ ہمارے پاجاموں میں لاسٹک ہونے کے باوجود' نہ جانے یہ کس طرح ہمارے جسموں میں گھس جاتے اور پھر ہمارا حشر ہو جاتا۔

ایک رات' میں غنودگی کے عالم میں' کھٹملوں سے نبرد آزما تھی کہ اچانک کسی چیز کے زور سے گرنے کی آواز نے مجھے مکمل بیدار کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ جان سکتی' میرا بڑا بھائی'

پتلون ٹانگوں پر چڑھائے، کسی گولی کی طرح نیچے سڑک پر جا چکا تھا۔ سڑک سے آتا ہوا شور وغل بتا رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہو گئی ہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں بالکونی پر جا کر کھڑی ہوئی۔ لائٹس بند ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا اور اس وقت ہر طرف تیرگی کا راج تھا۔ لیکن اتنا میری سمجھ میں آ گیا کہ لوگوں کا ہجوم ہمارے اور چی آ ک کے گھر کے درمیان کھڑا تھا۔ اڑوس پڑوس کے سب گھروں کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور لوگ ان میں سے جھانک کر، صورتحال کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے یا سڑک پر کھڑے لوگوں سے پوچھ رہے تھے۔ الفاظ کے ہجوم میں ایک لفظ ''مردہ'' میرے کانوں سے آ ٹکرایا۔ غالباً یہ لفظ مسلسل زبان اور کانوں کے درمیان فاصلے طے کرتا جا رہا تھا۔ بعض لوگ کسی حادثے کا سن کر حواس باختہ ہو گئے، بعض پر کپکپاہٹ چڑھ گئی اور بعض خاموش، یہ لفظ ادا کرنے والے کا منہ تکنے لگے۔ سڑک کے پار میگی کے کمرے کا دروازہ کھلا دکھائی دے رہا تھا۔ کالا آدمی اپنی یونیفارم پہنے، بالکونی کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے، نیچے سڑک کی جانب دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد، میں نے سائرن کی آواز سنی اور ساتھ ہی ایک امریکی فوجی جیپ کو نمودار ہوتے دیکھا۔ لمحے بھر میں مجمع منتشر ہو گیا۔ سامنے سڑک پر میگی لیٹی ہوئی تھی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ اس کے لمبے گھنے بالوں میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ ''اس نے اسے سڑک پر پھینکا ہے۔'' کسی نے کالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

کالا نشے میں بری طرح دھت تھا۔ ملٹری پولیس والوں نے اسکی یونیفارم درست کرائی اور اسے جیپ میں بٹھا دیا۔ جیپ میں بیٹھتے وقت، اس کے ہونٹوں پر فاخرانہ مسکراہٹ تھی۔

اگلے دن میں چی آ ک سے ملی۔ وہ جینی کو پانی پلا رہی تھی۔ بچی کو بری طرح ہچکی آ رہی تھی۔ وہ صبر سے اس کے ماتھے پر آیا پسینہ بھی پونچھے جا رہی تھی۔ کافی پانی پی لینے کے باوجود بھی جینی کی ہچکیاں نہیں رکیں۔ ''اب اسے کیتھولک یتیم خانے میں ڈال دیا جائے گا۔'' چی آ ک، رات بھر کی ہنگامہ آرائی سے پہلے ہی خاصی پریشان اور مکدر لگ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ میگی کالے آدمی سے شادی کر کے امریکہ جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ میگی ان دنوں واقعی بہت خوش تھی اور دن رات کالے کی خدمت میں جتی رہتی تھی۔ میں جس وقت اس کے دروازے پر گئی وہ کالے کے پیر رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔ میں اس کے شفاف، ملائم اور گھنے بالوں کو تعریفی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ بغیر میک اپ کے، مجھے اس کی بھنویں سرے سے غائب

دکھائی دیں۔ اس نے یہ کہتے ہوئے میری ہمت افزائی کی "ٹھیک ہے' آ جاؤ اندر۔"

"جینی کیتھولک یتیم خانے بھیج دی گئی۔" چی آ ک نے دو دن بعد مجھے انتہائی افسردگی سے بتایا اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی لگتی تھیں۔ میگی کی کوئی بہن اس کا سامان لے جانے کیلئے آئی تھی۔

میگی کا کمرہ کافی عرصے خالی رہا۔ تاہم میں پھر کبھی وہاں ہوم ورک کرنے یا کھیلنے نہیں گئی۔ ہر صبح سکول جاتے وقت بھی' میں چی آ ک کو سڑک سے ہی آواز دے دیا کرتی تھی۔

مجھے روز بروز یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ امی اس زچگی کے دوران جانبر نہیں ہو سکیں گی۔ ان کا پیٹ میرے اندازوں سے کہیں زیادہ بڑھ چکا تھا۔ خدا جانے یہ دادی اماں کے پرانے نسخے تھے یا ان کی پراثر دعائیں یا شاید ابھی ان کی زندگی تھی۔ حالانکہ انہی دنوں وہ کپڑے دھوتے ہوئے بری طرح چکرا کر زمین پر بھی گر گئی تھیں۔ یہ چوٹ ایسی لگی کہ پھر وہ ٹھیک نہیں ہو سکیں۔ ساتواں بھائی جوان کی کمر پر لدا رہتا تھا' اب میری بڑی بہن کی ذمہ داری بن گیا۔

ادھر دادی اماں بہت کمزور اور لاغر ہو گئیں۔ انہوں نے پیشاب کرنے کا برتن منگوانے کی فرمائش کی تو امی اور ابا نے انہیں دادا ابا کے پاس' گاؤں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

"جھگڑے کا کیا ہے' یہ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" امی نے ابا سے سرگوشی میں کہا "چاہو تو رائی کا پہاڑ بنا دو اور چاہو تو پہاڑ پگھل کر رائی بن جائے۔" پھر ذرا اونچی آواز میں بولیں۔ "اس عمر میں عورت کو اپنے شوہر کے پاس ہی ہونا چاہئے' چاہے اس سے محبت ہو یا نفرت۔" اور بالآخر واضح اور جھے جکڑے انداز میں بولیں۔ "بہتر ہوگا کہ ہم ان کیلئے ٹیکسی بک کرا لیں۔"

دادی اماں ننھی منی بچی کی طرح بن گئی تھیں جس طرح چی آ ک جینی کا خیال رکھتی تھی' اسی طرح میں بھی دادی کا خیال رکھنے لگی۔ جب گھر میں کوئی نہ ہوتا تو میں ان کے کمرے میں چلی جاتی۔ ان کے بالوں میں کنگھی کرتی۔ انہیں پانی پلاتی یا منہ ہاتھ دھلاتی۔ یہ دیکھنے کی کوشش کرتی کہ کہیں ان کا ڈائپر گیلا تو نہیں۔

جس دن دادی اماں کو گاؤں جانا تھا' امی نے انہیں صاف ستھرے کپڑے پہنائے۔ "ان کی صورت شکل میں اب بھی خاصی جاذبیت ہے' ان کے بچے جو نہیں ہوئے۔"

ابا' دادی اماں کو گاؤں چھوڑنے گئے۔ وہاں دادا ابو' دادی کی چھوٹی بہن اور ان کے بچوں کے ساتھ رہتے تھے "مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔" ابا نے واپس آتے ہی صاف صاف بتا

دیا۔ انہوں ے دکھی بھری آواز میں کہا ''میرے خیال میں وہ لوگ اماں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکیں گے۔ وہ ان کی پریشانی کا باعث بن جائیں گی۔ انتہائی حیرت کی بات ہے' میں سمجھتا تھا' وہ کسی کو بھی نہیں پہچانیں گی' لیکن انہوں نے اپنی جیکٹ پھیلائی۔ ابا جی کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔ وہ یقیناً شدید ذہنی پراگندگی کا شکار ہوں گی۔ تعجب ہوتا ہے' میاں بیوی کے رشتے پر بھی۔''

''پوری زندگی کی تلخیاں بھری ہوئی تھیں اس عورت میں'' امی نے کہا ''میں نے بتایا تو تھا آپ کو؟ ہم نے اسے یہاں سے بھیج کر صحیح قدم اٹھایا ہے۔''

امی نے دادی کے کپڑوں کی الماری کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ دادی اماں نے کبھی گھر کے کسی فرد کو وہاں ہاتھ لگانے تک کی اجازت نہیں دی تھی۔ چنانچہ ہم سب امی کے اردگرد کھڑے ان کے ہاتھوں کی جنبش کی طرف متوجہ تھے۔ امی صاف ستھرے استری شدہ کپڑے نکال کر باہر فرش پر رکھ رہی تھیں۔ ابا کا ایک پرانا سا انڈر ویئر نکلا جو عرصہ سے دادی نے اپنے استعمال میں رکھا ہوا تھا۔ ایک جاپانی سٹائل کی کھلی ڈلی پتلون نظر آئی جو دادی گھر میں اکثر پہنے پھرتی تھیں اور بہت سے دوسرے کپڑے تھے' روایتی انداز میں سلے ہوئے' ریشمی اور موٹے کھدر کے کپڑے' کاٹن کے کپڑے اور ان پر پرانی طرح کی کڑھائی۔ امی الماری میں ہاتھ ڈالتی اور نکالتی رہیں۔ فرش پر کپڑوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ان میں سے بہت سے کپڑے' دادی نے ہمارے سامنے پہنے ہی نہیں تھے۔ بعض ممکن ہے جوانی میں ایک دو بار پہنے ہوں۔ انہیں دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ اس کا مطلب ہے دادی یہاں کبھی واپس نہیں آئیں گی۔ یہ کپڑے پہننے کے دن تو کبھی کے بیت چکے تھے۔ یوں لگا جیسے یخ بستہ ہوا میرے دل کی اندرونی تہوں تک میں اتر گئی ہے۔ انہوں نے یہ کپڑے کب پہنے تھے؟ اور کس موقع کیلئے انہوں نے انہیں الماری کے نچلے خانوں میں چھپا کر رکھا تھا؟

الماری سے نکلنے والی آخری چیز سمور کی جیکٹ تھی۔ امی نے ایک بار پھر الماری کی نچلی تہوں کی تلاشی لی۔ انہیں ایک رومال میں کچھ چیزیں مضبوطی سے بندھی ملیں۔ ہم سب کی آنکھیں امی کی کپکپاتی ہوئی انگلیوں پر مرکوز ہو گئیں۔

عجیب تمسخرانہ انداز میں' امی نے رومال کے اندر موجود چیزوں کو دیکھا ـــــ نیلم کی ایک پرانی اور ٹوٹی پھوٹی انگوٹھی' کمر کی بیلٹ کا میلا کچیلا تانبے کا بکل' کسی بھی لمحے دو ٹکڑے ہونے کو تیار' جاپانی قبضے کے زمانے کے نکل کے چند سکے' کپڑوں سے نکالے گئے مختلف سائز اور رنگ

کے بہت سے بٹن، رنگ برنگ دھاگوں کے کچھ گچھے ـــــ اسی طرح کی چیزیں انہیں رومال میں نظر آئی تھیں۔

''واقعی امی! یہ چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی انگوٹھی سنبھالنا تو ایسے ہی ہے جیسے مٹی کے کسی برتن کے ٹکڑے احتیاط سے رکھ لئے جائیں۔'' امی نے خاموشی سے ان سب چیزوں کو دوبارہ رومال میں باندھا اور واپس الماری میں ڈال دیا۔ انہوں نے لمبا انڈرویئر اور دوسرے پھٹے پرانے کپڑوں کو گودڑ کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور باقی کپڑے اپنی الماری میں منتقل کر دیئے۔ سمور کی جیکٹ بہت اعلیٰ چیز تھی، وہ امی نے سردیوں کے استعمال کیلئے رکھ لی۔

اگلے دن میں دادی اماں کی الماری میں جا گھسی۔ وہاں سے ان کی رومال میں بندھی دولت باہر نکالی اور پارک میں چلی گئی۔ جرنیل کے مجسمے سے درختوں کی جانب، میں نے پینسٹھ نپے تلے قدم اٹھائے ـــــ دادی کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ ان کی زندگی کے ہر سال کیلئے ایک قدم ـــــ آگے دیکھا تو میں بید کے درخت کے تقریباً نیچے کھڑی تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں یہ پانچواں درخت تھا۔ میں نے اس کی جڑوں میں زمین کھود کر دادی اماں کا یہ خزانہ وہاں دفن کر دیا۔

سردیاں اپنے اختتام پر تھیں کہ گاؤں سے دادی اماں کے انتقال کی خبر آ گئی۔ ابھی پچھلی گرمیوں میں ہی تو وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گاؤں گئی تھیں۔ امی نے، جو حمل کے نویں مہینے میں تھیں، بڑی احمقانہ حرکت کی: وہ دادی کے کپڑوں کی الماری سے لپٹ لپٹ کر رونے اور چلانے لگیں حالانکہ اس وقت اس الماری میں صرف بچوں کے روزمرہ کے پہننے کے کپڑے تھے۔ دادی اماں کی کوئی چیز وہاں موجود ہی نہیں تھی۔

میں شام کے اس بکھیڑے اور ہنگامے میں، اسی عقبی کمرے میں چھپی رہی، جہاں کوئی مجھے ڈھونڈ نہیں سکتا تھا۔ جب سب اپنے بستروں میں گھس گئے تو میں خاموشی سے گھر سے نکلی اور پارک میں چلی گئی۔ آسمان پر تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر میں نے پینسٹھ قدم گنے بغیر بھی درختوں کے جھنڈ میں بید کا پانچواں درخت باآسانی پہچان لیا۔ دو موسم گزرنے کے بعد، زمین میں دفن، رومال میں بھرا خزانہ مجھے اسی طرح ملا، البتہ رومال گل چکا تھا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی انگوٹھی، بیلٹ کے تانبے کے میلے کچیلے بکل اور نکل کے سکوں پر سے مٹی اچھی طرح صاف کی اور انہیں اپنے ہاتھوں میں لئے بڑی محبت سے کافی دیر تک دیکھتی رہی۔ سب چیزیں بالکل اسی طرح تھیں۔ اس وقت وہ ذرا گرم محسوس ہو رہے تھے۔ مگر جلد ہی ٹھنڈک ان میں بھی سما جائے گی۔

میں نے ان تمام چیزوں کو دوبارہ، اسی طرح درخت کی جڑوں میں دفن کر دیا۔ اپنے ہاتھوں اور کپڑوں سے مٹی جھاڑ کر میں اٹھی، یہاں سے میں نے مجسمے کی جانب نپے تلے قدم بڑھانا شروع کیے۔ ساٹھ قدم گنے تو میں مجسمے کے سامنے کھڑی تھی۔ میں حیران ہونے لگی۔ پچھلی گرمیوں میں یقیناً یہ پینسٹھ قدم ہی بنے تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اگلی گرمیوں میں، میں پچاس قدم کے ساتھ درخت تک جا پہنچوں گی؟ اور ایک سال بعد یا دس سال بعد، ایک بہت بڑا قدم ہی مجھے وہاں پہنچا دے گا؟

سخت سردی تھی، اوپر سے رات کا وقت۔ میں نے سوچا اس وقت کسی کی نظر میں آئے بغیر، مجسمے پر چڑھ کر دیکھنا چاہیے چنانچہ میں نے مجسمے کے پاؤں پر سے راستہ بنایا اور ہلکی سی چھلانگ کے ساتھ اس کی کمر پر موجود پتھریلی بیلٹ پر چڑھ گئی۔ یہاں سے میں نے نیچے شہر کی طرف نگاہ دوڑائی۔ ہر جانب روشنی کے نقطے سے پھیلے نظر آ رہے تھے۔ میدان جنگ میں اڑتے گرد و غبار کی طرح، پچھلی گرمیوں میں لوگوں کے جوش بھرے نعروں کی آواز کی گرد بھی بیٹھ چکی تھی۔ اس وقت مکمل سکوت تھا۔ میں نے انتہائی توجہ سے ان آوازوں کی گونج فضا میں محسوس کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں زمین کی انتہائی گہرائی میں، پانی کی کوئی غیر دریافت شدہ لہر ڈھونڈ رہی ہوں۔

سمندر کسی سیاہ میدان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ مشرقی چین کے سمندر سے آتی ہوئی سرد ہوا کے تھپیڑے مسلسل میرے بدن میں گھسے جا رہے تھے۔ چائنا ٹاؤن کی پہاڑی پر واقع دو منزلہ گھر کی کھلی کھڑکیوں سے میں نے ترچھی روشنی منعکس ہوتے دیکھی۔ میں نے تصور میں اس زرد رو جوان کو بھی کھڑکی میں کھڑا اپنا منتظر پایا۔ میں نے اس برفاب ہوا میں چھپی، آنے والی بہار کی فرحت بخش ہوا کا لمس بھی محسوس کیا۔ کوئی چیز میرے گرم خون میں کھد بد کر رہی تھی۔ نامعلوم سی، نہ رکنے والی گدگدی، نا قابل برداشت!

''زندگی ـــــ'' میں بڑبڑائی۔ لیکن مجھے موزوں لفظ نہیں مل سکا۔ کیا کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو گزرتے ہوئے کل اور آج، ان میں موجود نا قابل امتیاز تصورات کے ہجوم اور ان میں پھیلے پیچیدہ رنگوں کو اپنے اندر سمیٹ سکتا ہو؟ ایک ایسا لفظ، جس میں آنے والے کل، ہر آنے والے کل کی ہر کیفیت سما سکتی ہو؟

ایک اور بہار آئی۔ اب میں چھٹے گریڈ میں تھی۔ میرا بڑا بھائی کہیں سے کتے کا ایک پلا

اٹھا لایا تھا اور ان دنوں اس کی پرورش میں لگا ہوا تھا۔ دادی اماں تو جا چکی تھیں' اس لئے پلا گھر میں جہاں چاہتا' منہ اٹھائے جا گھستا۔ پچھلے ایک سال میں' میرے قد میں لگ بھگ ایک فٹ کا اضافہ ہوا تھا اور گزشتہ سال سے' میں اپنی بڑی بہن کا سکول بیگ لے جانے لگی تھی' وہی بیگ جس پر خوبصورت بیل بوٹوں کی کڑھائی کی گئی تھی۔

تمام سردی' میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ' حسب معمول' کوئلے کی ٹرین سے کوئلے چرایا کرتی اور پھر سڑکوں پر ادھر ادھر آوارہ بھاگتے دوڑتے وقت گزار دینا' ہماری عادت سی بن گئی تھی۔ کبھی کبھار میں عقبی کمرے میں چھپ کر رومانی ناول بھی پڑھ لیا کرتی تھی۔

ایک ہفتے' ہماری شام کی کلاسیں نہیں تھیں' اس لئے میں سکول سے جلدی گھر جا رہی تھی ''کل کیڑوں کی دوائی لینے کا دن تھا' اس لئے صبح ناشتہ ہرگز نہ کرنا'' ہماری ٹیچر نے ایک دن پہلے ہی یاد دہانی کرائی تھی۔ ''بھرے پیٹ دوائی کھانے کا کیڑوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔''

سورج کی تپتی ہوئی' زرد روشنی میں' مجھے بار بار تھوکنے کیلئے رکنا پڑا۔ ''لگتا ہے' کیڑے نشے میں آ رہے ہیں۔'' میں نے ایک بار پھر خود کلامی کی۔ چوراہے پر واقع بیوٹی پارلر میں' چی آ ک مجھے کوئی محلول تیار کرتی نظر آئی۔ پچھلے سردیوں میں اس کے والد' فلورمل کے کنویئر بیلٹ میں پھنس کر' اپنی ٹانگ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی کے ساتھ' اس علاقے سے چلے گئے تھے تاہم چی آ ک بیوٹی پارلر کے مالکوں کے ساتھ' یہیں رہ گئی تھی۔ سکول سے آتے جاتے' روزانہ میں چی آ ک کو شیشے کے دروازے میں سے دیکھا کرتی۔ وہ مجھے فرش کی صفائی کرتی اور وہاں پھیلے بالوں کو اکٹھا کرتی دکھائی دیتی۔ اس کا سویٹر کمر کی جانب سے اوپر چڑھ رہا ہوتا اور وہ بار بار اپنے سینے کو ڈھکنے کیلئے اسے نیچے کھینچ رہی ہوتی۔

میں بیوٹی پارلر کے پاس سے گزرتی' آگے بڑھی۔ سڑک پر بکھری سورج کی زرد روشنی مجھے یوں لگی جیسے فضا میں ہزاروں پر کڑواہٹ بکھیر رہے ہوں۔ ایسا کب ہوا تھا؟ میں اپنے سر کو تکلیف میں ہلاتے ہوئے کسی دوراز کار خوابی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی' ایسا کب ہوا تھا؟ بہرحال میں گھر کی جانب بڑھتی رہی۔ گھر پہنچ کر میں نے پہاڑی پر واقع دو منزلہ گھر کی کھلی کھڑکی کی سمت نگاہ دوڑائی۔ وہ کھڑکی میں تقریباً جھکا ہوا میری ہی جانب متوجہ تھا۔

میں کسی مقناطیسی اثر کے تحت' پہاڑوں کی طرف چل دی۔ وہ کھڑکی سے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گھر کا دروازہ کھولا اور باہر آیا۔ اس کے زرد' نوکیلی ناک والے چہرے پر

بدستور وہی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ اس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز مجھے دی۔ میں نے وہ اپنے ہاتھ میں تھامی تو وہ فوراً واپس مڑا اور اندر چلا گیا۔ کھلے گیٹ سے مجھے اندر ٔایک تپلی اور طویل راہداری دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سورج کی کرنوں کو اپنے پاؤں تلے روندتا اندر چلا جا رہا تھا۔

گھر واپس آنے کے بعد ٔمیں عقبی کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے ٔمیں نے وہ چیز کھولی۔ اندر سہ رنگی روٹی رکھی ہوئی تھی۔ چینی اس قسم کی روٹی چھٹیوں میں کھایا کرتے تھے۔ ساتھ ہی پلاسٹک کا ایک اژدھا اور انگوٹھے کے سائز کی لالٹین بھی رکھی تھی۔ میں نے یہ سب چیزیں ایک غیر مستعمل ٔشکستہ جار میں چھپا دیں۔ امی اپنے کمرے میں تھیں۔ اس وقت وہ دردزہ میں مبتلا تھیں۔ لیکن ان کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے ٔمیں سیدھی اوپری منزل پر چلی گئی۔ میں وہاں ایک بڑے باکس میں گھس گئی۔ چھپن چھپائی کھیلتے ہوئے ٔاکثر میں یہیں چھپا کرتی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا مگر یہاں سورج کی ایک معمولی کرن بھی نہیں تھی۔ ماں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ موت کی خواہاں نظر آتی تھیں۔ مجھے لگا جیسے چرچ کی مترنم گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں اور میں بے خبر نیند کی آغوش میں کھو گئی۔ یہ بھی ایک طرح کی موت ہی تھی۔

میں جاگی تو اس وقت تک ٔامی شدید اذیت برداشت کرنے کے بعد ٔآٹھویں بچے کو جنم دے چکی تھیں۔ باکس کے اندھیرے میں مجھ پر تنہائی اور مایوسی کی عجیب سی کیفیت غالب آنے لگی۔ میں انہیں مدد کیلئے پکارنے لگی۔ مجھے اپنا بدن شدید حرارت اور پسینے کی لپیٹ میں آتا محسوس ہوا۔ مجھے اب سمجھ آئی کہ یہ حبس زدہ بخار میرے گرد مکڑی کی طرح جالا کیوں بن رہا تھا۔ جوانی کا لاوا پھولوں کی شکل میں ادھر ادھر بکھر رہا تھا۔

الوداعی کلمات

اوچنگ ہوئی

چنگ آک نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور برآمدے میں کھلنے والے متحرک دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے کچھ ابلے ہوئے انڈے اور فریج میں موجود کچھ خربوزے اپنے تھیلے میں ڈال لئے تھے اور اب وہ گھر کے لان میں جانا چاہ رہی تھی لیکن اسی لمحے اسے اپنے والد کی شکل نظر آئی۔ وہ لان میں آلتی پالتی مارے بیٹھے غالباً جنگلی گھاس پھوس صاف کررہے تھے۔ وہ سمجھی کہ لان کے گرد موجود باڑ میں کوئی ہلچل ہوئی ہے اور وہاں سے کوئی شفاف چیز گزری ہے۔

آنکھیں کھولتے ہی، خواب کی سی لمحاتی کیفیت اور اس کی سنسنی خیزی خودبخود غائب ہوگئی۔ باڑ اور اردگرد موجود پرسکوت ماحول میں اسے صرف اپنے ابو کی واضح شکل، باڑ کے ساتھ لگے شکستہ بورڈ کے قریب دکھائی دی۔ بورڈ کبھی خوبصورت رہا ہوگا مگر پچھلی متعدد بارشوں نے اسے بالکل ہی بدرنگ اور بے ڈھنگا کردیا تھا۔ اس کے تصور میں کیا چیز درآئی تھی اور پھر سورج کی چمکتی کرنوں کے بہاؤ کی طرح غائب بھی ہوگئی۔ لمحہ بھر کی سنسنی خیزی جس کی نہ کوئی شکل تھی اور نہ کوئی وجود لیکن چنگ آک کو یہ یقین بہرحال تھا کہ وہ اس حقیقی ہیجانی کیفیت کا مشاہدہ کرچکی ہے، جس کی بدولت، اسے اپنے والدین کے گھر آنا پڑا تھا۔

لیکن؛ میں نے دیکھا کیا ہے؟ وہ حیران تھی کیا وہ محض ایک تخیلاتی کرشمہ تھا جس نے سورج کی روشنی میں چمکتے پانی کے قطرے سے جنم لیا تھا؟ یا پھر کسی ان دیکھی قوت کا غیر مرئی ہاتھ تھا' جو اس کے والد کے چہرے کے نامانوس خطوط اور ان کی تمباکو نوشی سے پیدا شدہ دھوئیں کے ہالے کو کنٹرول کر رہا تھا۔

اس نے دوبارہ لان کی سمت دیکھا' شاید وہاں کوئی معمولی سی تبدیلی محسوس ہو' جو اس کے تخیل کو مہمیز دینے کا باعث بنی تھی لیکن وہاں تو اتنی ہوا بھی نہیں تھی کہ جس کا جھونکا پتوں کو ذرا سا ہلا دے۔ ہاں اس کے والد کے بازو ضرور میکانکی انداز میں بدستور چل رہے تھے۔ ان کے پتلے دبلے کندھوں کی مسلسل حرکت اور ان کی پسینے میں ڈوبی ہوئی قمیض دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سادہ سی مشقت بھی ان کے لئے بہت سخت اور کٹھن ہے۔

نہ جانے یہ کیسی سنسناہٹ تھی جو غیر متوقع طور پر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی؟ تاہم یہ کیفیت اسے اجنبی اور غیر مانوس ہی لگتی تھی۔ پچھلے روز بھی یہی ہوا تھا۔ جب وہ داخلی گیٹ سے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کا بچہ نیند میں مدہوش اس کی گود میں تھا۔ اس کی والدہ برآمدے میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کو آتے دیکھا تو اٹھیں اور اس کی جانب لپکتی ہوئی آئیں اور بچے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی لمحے جانی پہچانی مگر غیر متوقع ہیجانی کیفیت اس پر طاری ہوگئی۔ وہ حیرت کے مارے سن ہوگئی حالانکہ اسے پتہ تھا کہ اس نے صرف اپنے والد کو برآمدے میں بچھی آرام کرسی پر سکڑے ہوئے پڑا دیکھا ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن وہ اب بھی رنگین چشمہ پہنے تھوڑا سا آگے کو جھکے لان کے کونے کو تک رہے تھے' جہاں کھلے ہوئے پھول فضا کو مہکا رہے تھے۔

''آپ نے لائٹ کیوں نہیں جلائی؟ آرام کرسی کا سہارا لیتے ہوئے چنگ آک نے پوچھا۔ مچھر آپ کو کاٹے جا رہے ہیں کیا اندر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟''

''صحیح کہہ رہی ہو بہت برداشت کر لیا' کم بخت کسی شیطان کی طرح کھائے جا رہے ہیں'' اس کی والدہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

رات کی بھاری اور نمی بھری ہوا نے اس قدر حبس کر دیا کہ چنگ آک کو سانس لینا بھی دوبھر لگا ''یہ سو رہے ہیں کیا؟'' چنگ آک نے والد کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز ذرا اونچی ہوگئی تھی جیسے انجانے میں وہ اپنے اردگرد پھیلے حبس اور تاریکی کو پیچھے دھکیلنے کی

کوشش کر رہی ہو۔

اس کی والدہ نے اثبات میں سر ہلایا مگر ان کی نگاہیں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں۔ چنگ آ ک کے والد اپنی ہی دنیا میں گم تھے۔ وہ اپنی انگلی سے گھٹنوں پر عجیب وغریب جیومیٹری اشکال ترتیب دے رہے تھے............ پہلے دائرہ بنایا اس کے اندر مربع تشکیل دیا اور پھر مربع میں ایک مثلث بنا ڈالی۔ یوں لگا جیسے وہ تاریکی کے پار کسی انجان اور نامعلوم دنیا میں سگنلز بھیج رہے ہیں۔ شام کے دھندلکے میں وہ ساکت پانی کی طرح بڑھتی ہوئی تاریکی میں خود کو تحلیل کرتے ہوئے لگے۔ چنگ آ ک کا بچہ احاطے میں کھڑا کھجور کے درخت کو ہلا رہا تھا۔ کھجوروں کو دیکھنے کے لئے اس کا اوپر اٹھا ہوا چہرہ ہوا میں تیرتی پتنگ کی طرح لگ رہا تھا۔

اسی اثنا میں باہر سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور پھر گھنٹی بجتی ہی چلی گئی حالانکہ آنے والا آسانی سے باڑ کے اوپر سے گھر والوں کی موجودگی محسوس کر سکتا تھا۔ چنگ آ ک نے سلیپر پاؤں میں ڈالے اور گیٹ کی طرف بھاگی۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا۔ دو سیاہی مائل سرخ چہرے گویا اس پر چڑھ دوڑے۔ وہ دروازے کے درمیان اس طرح کھڑے ہو گئے کہ دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے لرزتے ہاتھ چنگ آ ک کی جانب بڑھا دیئے۔ چنگ آ ک نے ان کا لمحے بھر کو جائزہ لیا۔ وہ چپ چاپ اپنے پنجے نما ہاتھ اس کی آنکھوں کی جانب بڑھائے کھڑے تھے۔ ''اندر نہ آؤ وہیں کھڑے رہو۔'' چنگ آ ک نے انہیں درشت انداز میں وہیں روکا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک سو وون کا سکّہ نکالا اور ان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ سکہ لینے والے سیاہ فام کی آنکھوں میں سختی جھلکی۔ شاید اس نے دانت بھی پیسے۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا بغیر بھنوؤں کا چہرہ خوفناک لگا۔ ''کون ہے؟'' گھر کے اندر سے اس کی والدہ کی آواز آئی۔

''جذامی ہیں۔''

''وہ چلے جائیں تو دروازے پر تھوڑا سا پانی ڈال کر اس پر نمک کا چھڑکاؤ کر دینا۔''

چنگ آ ک نے داخلی دروازے کو پانی سے اچھی طرح دھو ڈالا اور اس کے ارد گرد نمک کی ڈلیاں بکھیر دیں۔ اس کا بچہ اس دوران کھجور کے درخت سے لپٹا اسے ہلا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ پیچھے ہٹتا زمین پر نظر دوڑاتا اور گھاس پر گری ہوئی کھجوریں اٹھاتا اور انہیں اپنی جیب میں رکھ لیتا۔ پھولوں کی ایک شاخ باڑ کے اوپر باہر کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ گزرتے ہوئے کسی راہ

گیر نے ہاتھ بڑھایا اور ایک بڑا سا خوبصورت پھول توڑ لیا۔

''کیوں بھئی تیار ہو؟'' چنگ آ ک کی والدہ نے پوچھا۔ وہ باہر لان کی طرف آ رہی تھیں چنگ آ ک نے ان پر ایک نگا دوڑائی اور آہستہ سے مسکرادی۔ اس کی والدہ خاصی دل کش خاتون تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے ارغوانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ان کے شانے پر ایک دیدہ زیب منقش بیگ لٹکا ہوا تھا۔ ''تمہیں کا نگ واہ جانے والی ایسی بس پکڑنا ہوگی جو اوجنگ نی سے ہو کر جاتی ہو۔'' چنگ آ ک کے والد نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں آہستگی سے کہا۔ ماں بیٹی کی تیاری کے دوران انہوں نے ان کی جانب نگاہ تک نہیں اٹھائی تھی اور نہ ہی پوچھا تھا کہ وہ کہاں جارہی ہیں۔ وہ بدستور میکانکی انداز میں فالتو گھاس پھوس نکالنے میں مصروف تھے۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ اندر چلے جائیں۔ یہاں دھوپ کی تپش بڑھتی جارہی ہے۔'' چنگ آ ک نے اپنا ہاتھ والد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا مگر انہوں نے چنگ کی پیش کش کو نظر انداز کر دیا اور آنکھ کے اشارے سے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔

''دوپہر کا کھانا میز پر رکھا ہے' کھا لیجے گا یہ نہ ہو کہ اپنی مصروفیت میں بھول جائیں۔'' اس کی والدہ نے اشارتاً بتایا بھی کہ انہیں باہر دیر بھی ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے محض ہاتھ لہرا کر گویا انہیں خدا حافظ کہہ دیا۔ چھتری کھولتے ہوئے چنگ کی والدہ نے آنکھیں جھپکا کر سورج کی حدت کا معائنہ کیا۔ ان کے ہاں سلیقے سے رنگے ہوئے تھے۔ سر میں نیلگوں اور چمکدار سٹیل پن بالوں کو مضبوطی سے تھامے موجود تھا۔ ان کے سر پر ایک بھی سفید بال یا کوئی الجھاؤ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ''وہ فقیر ہیں کیا؟'' بچے نے سوال کیا۔ اس نے اپنی ماں کے سکرٹ کا کنارہ نرمی سے پکڑا ہوا تھا اور اس کی نگاہیں ان جذامیوں کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں جو پڑوس کے دروازے کھٹکھٹا کر خیرات مانگ رہے تھے۔ چنگ آ ک نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔ اسے اپنی اس حرکت کا خود بھی علم نہیں تھا۔ بچہ اس حرکت کا مطلب نفی میں لیتا یا اثبات میں۔ یہ اس کی مرضی تھی۔ پریشان نہ ہو بھی کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ تاہم اس نے مزید استفسار نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ ان کے ساتھ قدم بڑھاتا رہا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی مگر اختتام ہفتہ اس کی وجہ نہیں تھا۔ بس میں سیاح نہ ہونے کے برابر تھے۔ زیادہ تر مسافر

مچھلی بیچنے والی عورتیں تھیں۔ ان کے خالی برتن بس کے اندرونی راستے میں بکھرے ہوئے تھے اور ان میں سے مچھلیوں کی بو بھی آ رہی تھی۔ ایسی صورت میں کھڑی سواریاں دوہری مصیبت میں مبتلا تھیں۔ ان مچھیرنوں کے لباس اور بالوں سے بھی بدبو پھوٹ رہی تھی۔ اس بندرگاہ کا نام سوچتے ہوئے...... جہاں سے اس بس کا روٹ شروع ہوتا تھا۔۔ چنگ آ ک نے اندازہ لگالیا کہ یہ مچھیرنیں اپنے کام کاج سے فارغ ہوکر واپس گھروں کا رخ کررہی ہیں۔ بحری مرغابی موج' تلاطم خیز اور سنہری لہر جیسے رومانی ناموں والی دخانی کشتیاں ابھی تک اسی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوں گی۔ ان کے اردگرد انجن آئل کی بو چھائی ہوگی اور پھر کسی وقت وہ وہاں سے مغربی سمندر میں واقع چھوٹے چھوٹے جزیروں کا رخ کریں گی۔ عورتوں کا شوروغوغا اور نامعقول باتیں جاری تھیں۔ ایسے ماحول کو برداشت کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہوگا۔ چنگ آ ک نے سوچا۔

چنگ آ ک نے دروازے کے قریب کی ایک سیٹ کے عقبی حصے کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اسے یہ خدشہ تھا کہ بس کا کوئی جھٹکا اس کا توازن خراب کرکے کسی چوٹ کا سبب بن سکتا ہے اور اس کا بچہ مسافروں کے ہجوم میں بری طرح پھنسا ہوا بھی اپنی ماں کے سکرٹ کو سختی سے تھامے ہوا تھا۔ وہ اسے یہ کہہ کر یقین دلانا چاہ رہی تھی۔ مجھے اتنی سختی سے نہ پکڑو میں تمہیں کبھی بھی گم نہیں ہونے دوں گی' لیکن کہہ نہیں پارہی تھی۔ بعض اوقات وہ پیچھے مڑ کر اپنی والدہ کو بھی ڈھونڈنے کی کوشش کرتی جو کہیں مسافروں کی بھیڑ میں دھنسے ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اچانک اسے ان کے ہاتھ کی پشت نظر آ گئی۔ سوجا ہوا ہاتھ چھت پر لگے راڈ کو پکڑے ہوا تھا اور اس میں زمرد جڑی انگوٹھی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ زمرد اتنا بڑا تھا کہ اس پر نقلی ہونے کا گمان ہوتا تھا اس کا فیروزی رنگ انتہائی گہرا اور ناقابل شناخت تھا۔ ''یہ سکرٹ آپ کا ہی ہے نا مم؟ یہ آپ ہی ہیں نا؟'' بچہ بھیڑ میں پھنسا ہوا بہت پریشان ہوگیا تھا۔ ممکن ہے اس نے کسی اور کا سکرٹ تھام رکھا ہو؟ اس نے اپنا سر پیچھے کو کیا اور اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ماتھے پر چند لکیریں پڑی نظر آ رہی تھیں۔ ان لمحوں میں وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ دار لگا۔ چنگ آ ک کے سامنے بیٹھے آدمی نے ترچھی نگاہوں سے اس کا چہرہ پڑھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بچے کو اپنی گود میں لینے کی کوشش کی لیکن بچے کا خوفناک موڈ دیکھ کر اس نے فوراً ہی اسے چھوڑ دیا۔ بچے نے چنگ آ ک کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بچے کی لمحاتی غضب ناکی اور اس سے

ہمدردی جتانے والے مسافر کی حیرت اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت نے کچھ دیر کو اچھی خاصی سراسیمگی پھیلا دی۔ چنگ آ ک نے انتہائی وحشیانہ انداز میں آدمی کی جانب دیکھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کو اور بھی نیچے کر کے اپنے گھٹنوں پر جمالیا۔ چنگ آ ک نے جس بازو سے عقبی سیٹ کو پکڑ رکھا تھا اسی پر انڈوں تربوزوں اور سافٹ ڈرنکس سے بوجھل بیگ بھی لٹکا ہوا تھا۔ بار بار کے جھٹکوں اور بوجھ سے اس کا وہ بازو شل ہو کر رہ گیا تھا۔ ''ہمیں چیک پوسٹ پر اترنا ہے۔'' اس نے حتی الامکان اپنی گردن لمبی کر کے بس کنڈیکٹر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی وہ پہلے بھی ایسی ہی کوشش کر چکی تھی۔

''ابھی کافی دور ہے تمہارا اسٹاپ۔'' نوجوان لڑکی نے اپنا سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ اتنے ہنگامہ خیز ہجوم میں بھی ایک رسالہ اس کی ناک سے جڑا ہوا تھا۔

بس کمپو کے دھان کے کھیتوں سے گزر رہی تھی۔ بس میں موجود مسافروں کے سروں کی فصل سے ذرا آگے بس سے باہر پیش منظر میں دھان کے سرسبز خوشے لہلہا رہے تھے۔ تازہ سرسبز ماحول چنگ آ ک کی نگاہوں میں بس گیا۔ لگتا ہے گذشتہ روز کی بارش نے سارے کھلیانوں کو اچھی طرح نہلا دھلا دیا تھا۔ اس وسیع و عریض سرسبز اور لہلہاتی مخملیں فضا میں اچانک سڑک کے تارکول کی خوشبو سمیٹے گرم اور چپچپی ہوا بس کی کھڑکی کے راستے اس کے چہرے سے آ ٹکرائی اور اس کے تخیّل میں پھیلتی رومانی کیفیت کو ہوا کر گئی۔ چنگ آ ک ایک بار پھر اس وقت بے چین ہوئی' جب بس میں تین جوان سوار ہوئے اور تقریباً اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ''کیا چیک پوسٹ اب بھی خاصی دور ہے؟'' اس نے خاصا چیخ کر کنڈیکٹر لڑکی سے پوچھا اور دوسرے ہاتھ سے ایک نوجوان کو یوں پیچھے دھکیل دیا جیسے اسے اسی جگہ اترنا تھا۔ کنڈکٹر نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اٹھا کر چنگ آ ک کو دیکھا۔ ''مجھے یاد ہے تمہیں کہاں اترنا ہے' تمہیں بار بار پوچھنے کی ضرورت نہیں' اگلا اسٹاپ تمہارا ہی ہے۔'' کنڈیکٹر لڑکی نے طنطناتے لہجے میں جواب دیا۔ ایک لمحے کو طیش اور خفت کے ملے جلے اثر سے اس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ چنگ آ ک نے فوراً ہی اپنے غصّے پر قابو پا لیا۔ وہ یہ سوچنے لگی۔ لوگ ایسی حرکتیں آخر کیوں کرتے ہیں؟ دراصل اسے لڑکی کی خباثت کے ساتھ ساتھ اپنی کم ہمّتی پر بھی غصہ آیا تھا اور وہ اس سے بخوبی واقف تھی۔ اس کا غصہ عموماً اسی طرح باہر نکلنے کے بجائے اندر جمع ہو کر لاوے کی طرح جمتا رہتا تھا مگر اس لاوے کے پھٹنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ ''والدہ! آگے آ جائیں۔''

اس نے وزنی بیگ سنبھالتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے بچے کا بازو ڈھونڈتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کی بلند اور واضح آواز نے خود اسے بھی حیران کردیا۔بس سے اترنے کے بعد چنگ آ ک نے بچے کے سکڑے ہوئے کپڑوں کو صحیح کیا۔اس کے جوگرز کے تسمے دوبارہ صحیح کر کے باندھے اور اس کے موزے اوپر چڑھائے۔

''یہی راستہ ہے شاید!'' چنگ آ ک کی والدہ نے کہا۔وہ بائیں جانب ایک کچے راستے کی جانب اشارہ کر رہی تھیں جو چیک پوسٹ کے قریب سے نکل رہا تھا۔دوراہے پر موجود ایک دکان کے نیچے تھڑے پر تربوزوں اور ٹماٹروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چنگ آ ک نے ماں کی بات کے جواب میں اثباتاً اپنا سر ہلا دیا حالانکہ وہ پہلی دفعہ اس علاقے میں آئی تھی اور اردگرد کے بارے میں قطعی لاعلم تھی۔اس نے اٹھتی ہوئی دھول سے بچنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی سیال محلول کے سپرے کے ذریعے اس کے تصوراتی ماحول کو دھندلایا جارہا ہو۔اس جگہ دھول ہی دھول تھی راستے کے اطراف میں موجود دکانوں پر ہر چیز دھول سے بری طرح اٹی نظر آرہی تھی۔لعنت ہے ہر طرف چاک کے رنگ کی راکھ بکھری دکھائی دیتی ہے۔لگتا ہے فضا میں کسی قسم کے ریڈیو ایکٹو اثرات جمع ہوگئے ہیں۔ چنگ آ ک نے سوچا۔فضا میں دھول اور راکھ کے ذرات کبھی کسی بھوت پریت کی شکل بناتے اور کبھی سورج کی شعاعوں کے درمیان غیر متحرک نظر آنے لگتے۔وہ اس خوابناک ماحول کو مچھیرنوں کے بدن اور لباس میں بسی بو کے ردعمل کے طور پر لے رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اسے اوپر تلے کئی چھینکیں آ گئیں۔

تاہم راستے پر اترتے ہی اداسی اور ویرانی کا تصور غائب ہوگیا۔مٹی میں قدم رکھا تو سڑک سے ذرا سی دور گرد غبار میں بری طرح اٹا ہوا بل ڈوزر دکھائی دیا۔مزدور اس راستے کو کشادہ اور پختہ کرنے کے لئے اس کی کھدائی میں مصروف تھے۔ان کی کلہاڑیوں سے چنگاریاں فضا میں بکھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔عورتیں سروں پر مٹی اور بجری کے ڈھیر اٹھائے آتی جاتی نظر آرہی تھیں۔بنتی ہوئی سڑک کے کنارے کچھ راستہ ٹریفک کے لئے بھی چھوڑا گیا تھا۔

چنگ آ ک نے سائڈ میں موجود کھیت میں سے نکلنے کا سوچا۔وہاں بھی بجری اور کنکر کے ڈھیر جمع تھے۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ بچے کی انگلی پکڑے اس ڈھیر پر سے چڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تو اس کی ایڑیاں زخمی ہوگئیں۔ کچی سڑک کے ایک حصّے پر ٹریفک کی ایک لمبی قطار چل

رہی تھی۔ ظاہر ہے مٹی کو نیچے بیٹھنے کی مہلت ہی نہیں مل رہی تھی۔ گاڑیوں میں کولر اور چٹائیاں رکھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ویک اینڈ ہے نا! چنگ آ ک نے گویا خود سے کہا۔ اسے اپنے دل میں نامعلوم سی چبھن محسوس ہوئی۔

کسی کار کی عقبی سیٹ پر ایک لڑکی خوبصورت منقش ہیٹ سر پر چڑھائے' اپنے آپ میں مگن بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ جلد ہی دھول اور مٹی کے غبار میں گم ہوگئی۔ چنگ آ ک پھر بڑبڑائی۔ ویک اینڈ ہے نا! غالباً وہ اس لفظ میں چھپی معنویت کا مزالینا چاہتی تھی۔ بچہ آگے آگے چل رہا تھا۔ اچانک وہ چلتے چلتے رک گیا اور شور مچانے لگا۔ چنگ آ ک آ ہستگی سے مسکرادی۔ وہ کافی دیر سے ایک قریبی دکان پر موجود آئس کریم کی جانب للچائی نگاہیں ڈال رہا تھا اور وہ اسے نظر انداز کئے جا رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر چنگ آ ک نے اسے سمجھایا اور دوبارہ والدہ کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ کچھ دور چلنے کے بعد اپنا سینڈل اتارتیں اور اس پر سے مٹی جھاڑنے لگتیں۔ وہ شاید پیچھے موجود بل ڈوزر کی آواز اور مسلسل اڑتی ہوئی مٹی اور دھول کو فراموش کر بیٹھی تھیں۔ انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ اس خاک آلود فضا میں موجود ذرات ان کے سر اور چہرے پر بھی اپنی تہیں جما چکے تھے اور اس وقت ان کا سر کسی تفریحی پارک میں اڑتے ہوئے غبارے کی طرح لگ رہا تھا۔

بچے نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ ایک فوجی قافلہ ادھر کا رخ کر رہا تھا۔ ٹرکوں کی ایک قطار دور تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ یہ منظر دیکھ کر سہم گیا۔ چنگ آ ک نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور سڑک سے پرے کھیتوں میں جاتی پگڈنڈی پر اتر گئی۔ تیزی سے بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کا ہجوم دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ شاید گاڑیوں کی جلتی بجھتی غیر موزوں تیز اور سرد ہیڈ لائیٹیں۔ عین دن دہاڑے۔ اس کی سراسیمگی کا باعث بنی ہوں۔

ٹرکوں پر سوار فوجیوں کے چہرے پتھرائے ہوئے تھے۔ ٹریکٹروں اور دوسری گاڑیوں نے فوجی قافلہ آتے دیکھا تو خاموشی سے ایک طرف ہوکر انہیں راستہ دے دیا۔ ٹرکوں کے بڑے بڑے پہیوں پر نہ جانے کہاں کہاں کی مٹی جمی ہوئی تھی۔ یہاں بھی وہ خاک اڑاتے اور زمین میں لرزہ پیدا کرتے اڑے چلے جا رہے تھے۔ بچہ ایک دفعہ پھر سراسیمہ سا راستے میں کھڑا ہوگیا اور منہ کھولے اس عظیم جلوس کو گزرتے دیکھنے لگا۔ اس کے بالوں میں بھری مٹی اب اس کی بھنوؤں پر گرنے لگی تھی۔ چہرے مہرے سے اس وقت وہ بہت قابل رحم دکھائی دے رہا

تھا۔ چنگ آ ک نے مڑ کر اسے دیکھا اور اپنی پشت پر سوار کر لیا۔ اس کی والدہ بھی رک کر انہیں دیکھنے لگی تھیں۔ ''بھئی اسے چلنے دو بلا وجہ اس کی ضدیں مانتے جاتی ہو'' انہوں نے درشتی سے کہا

''اور کتنا آگے جانا ہے؟'' چنگ آ ک نے بچے کو کمر پر سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

اس کی والدہ پہلے بھی ایکبار یہاں آ چکی تھیں۔ انہوں نے گومگو کی کیفیت میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر انہوں نے بیٹی کے شانوں پر جھولتا بیگ اس سے لے کر تھام لیا۔ اس کے ہاتھ واقعی شل ہو رہے تھے۔ ''یہیں کہیں سے ایک سڑک آگے کو نکلتی ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی قریب ہی ایک کھوکھے کی جانب مڑ گئیں۔ کھوکھے والے نے انہیں بتایا کہ یہی راستہ سو گز آگے جا کر ایک دوسری سڑک سے مل جاتا ہے' جہاں سے انہیں بائیں جانب مڑنا ہوگا۔ چنگ آ ک نے وہیں سے بچے کو کون آئس کریم دلا دی۔ ''ہمیں کوئی گھنٹہ بھر اور چلنا ہوگا۔ ادھر سڑک کی حالت یہ ہے جیسے کوئی سڑک ہی نہ ہو۔'' اس کی والدہ خاصی پراگندہ لگ رہی تھیں تاہم انہوں نے پھر قدم آگے بڑھانا شروع کر دیئے۔ ٹھیک ٹھاک گرمی تھی۔ اوپر سے کمر پر لدا ہوا بچہ۔ چنگ آ ک بڑی مشکل سے اس کا بوجھ اٹھائے ڈگمگاتے قدموں آگے بڑھ رہی تھی۔ بچے کے پسینے اور مٹی سے بھرے ہاتھ اس کی گردن کو دبا رہے تھے۔ پسینے میں تر بال بار بار ماتھے پر گر رہے تھے جس سے کسی کسی لمحے اسے آگے کا راستہ دیکھنا بھی دشوار ہو جاتا۔ غلط پاؤں رکھنے کی وجہ سے وہ کئی دفعہ گرتے گرتے بچی۔ ٹرکوں کا لامتناہی جلوس ابھی جاری تھا۔

ایک لڑکی' بچہ گود میں لئے کھیت کے بیچوں بیچ کھڑی' فوجی ٹرکوں کے قافلے کو دیکھ کر ہاتھ لہرا رہی تھی۔ ادھر ایک عورت سر پر مٹی کا بڑا سا تھیلا اٹھائے دو ٹرکوں کے درمیان پھنستی پھنستی بچی۔ وہ تیزی سے سڑک سے اتری اور کھیت میں آ گئی۔ عورت نے اپنے سر پر بندھا تولیہ اتارا۔ اپنے کپڑوں کو جھاڑا اور پھر لڑکی سے بچہ لے لیا۔ وہ وہیں کھیت میں بیٹھ گئی اور اپنے بچے کو دودھ پلانے لگی۔ لڑکی نے گھاس کے چند لمبے لمبے ٹکڑے اکھٹے کئے اور بچے کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگی۔ وہ گھاس لہراتے ہوئے اپنا سر بھی تیزی سے گھما رہی تھی اور ہنسے جا رہی تھی۔ بچے نے ماں کا دودھ پینا چھوڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور خوشی سے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ وہ ہلتی ہوئی گھاس کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس حرکت پر لڑکی پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ چنگ آ ک کی والدہ نے اپنی ناک اور منہ رومال سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ چلتے چلتے رکتیں اور تھوکنے لگتیں۔ ٹرکوں کے جلوس کے پیچھے پیدل فوجی دستہ کسی سانپ کی طرح لہریئے دار راستے پر چلتا

ہوانظر آنے لگا۔ ان کے چہروں پر ہیلمٹ سجے تھے اور ان کی سبز یونیفارم پسینے اور مٹی کے ملغوبے سے شرابور تھیں' یونیفارم پر موجود چمکدار ستارے اور نشانات خاک آلود ہونے کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سبز وردیوں میں ملبوس فوجی دستہ' اس کی خاموش مارچ پاسٹ' اڑتی ہوئی لامحدود دھول اور غبار اس کے سینے میں چھپے غبار آلود تفکرات کو مہمیز دینے لگے۔ اسے اپنا گھٹتا محسوس ہوا۔ اپنے خوف پر قابو پانے کی غرض سے وہ اپنی والدہ کی طرف بڑھی اور ان سے سرگوشی میں کہنے لگی۔ ''جانے یہ فوجی یونٹ کہاں جا رہا ہے؟'' جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے دوسرا سوال داغ دیا۔ اس نے یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس کی والدہ کو بھلا اس کا جواب کیوں معلوم ہونے لگا۔ ''کیا خیال ہے یہ کہاں سے آ رہے ہیں؟ غالباً صبح سویرے چلے ہوں گے۔'' بے شمار پروں والا پرندہ فولادی لباس پہنے تمام رات سورج کی تلاش میں اڑتا رہتا ہے اور صبح صادق کے ملگجے اور دھند لکے اجالے میں چھپنے لگتا ہے۔ ہر صبح اس کی آنکھ کھلنے سے پہلے نہ جانے کتنے ہی پاؤں اس کے سینے کو بیہمانہ کچلتے ہوئے گذر جاتے تھے۔

ایک سیاہ بادل آسمان پر نمودار ہوا۔ سورج اس کے پیچھے چھپ گیا۔ سرخی مائل خاکی سطح زمین کا اڑتا غبار' فوجیوں کا سبز دستہ' پہاڑی کے دامن میں موجود گھاٹیاں' باہم پیوست درختوں کے جھنڈ' غرض ہر شے پر دھند لاسا اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں بادل کا ٹکڑا تیرتا ہوا نظروں سے غائب ہوگیا۔ بچے کے کمر پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے چنگ آک پسینے سے بری طرح شرابور ہوگئی تھی۔ ''چلو اچھے بچے بنو اور کچھ دیر پیدل چلو۔''

وہ اتنے حیرت اور استعجاب سے فوجی دستے کی حرکات وسکنات دیکھنے میں محو تھا کہ چون چرا کئے بغیر ہی چنگ آک کی کمر سے اتر گیا۔ کون آئس کریم' جو دکاندار سے لیتے ہی پگھلنا شروع ہوگئی تھی' بری طرح بچے کی انگلیوں' ہاتھوں' چہرے اور کپڑوں پر چپک گئی تھی۔ چنگ آک نے رومال کی مدد سے اس کے ہاتھوں اور چہرے پر سے آئس کریم کے نشانات چھڑائے اور انہیں اچھی طرح صاف کرڈالا۔ بچہ اس دوران چیختا چلاتا رہا۔ چنگ آک کی والدہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ''اگر تم لوگ اسی طرح نخروں میں لگے رہے تو ہمیں راستے ہی میں رات ہوجائے گی۔'' ان کے چہرے کا سارا میک اپ پسینے اور غبار کی نظر ہوگیا تھا۔ کھوکے والے نے کہا تھا کہ پہلی جانب سڑک پر جانا ہے۔ انہیں اپنی یادداشت پر غصہ آ رہا تھا۔ وقت کے ہاتھوں ان کی نظر بھی خاصی کمزور ہوگئی تھی اور وہ پریشان تھیں کہ آیا بائیں طرف کو مڑنے والا راستہ بھی

وہ پہچان پائیں گی یا نہیں۔ تاہم انہیں زیادہ تنگ نہیں ہونا پڑا۔ سڑک کے پار ایک ورائٹی سٹور کے سامنے سبزیوں کے کھیت میں سے گزرتی بغلی سڑک کے کونے پر ایک بے ڈھنگا سا بورڈ لگا ہوا تھا: میموریل پارک کا داخلی راستہ۔

چنگ آ ک نے سٹور کے سامنے لگے ایک نلکے کے آگے بچے کو کھڑا کر کے اس کے ہاتھ منہ اور پیر اچھی طرح دھوئے۔ کپڑوں پر لگے دھبے صاف کیے۔ غرض اپنے تئیں اسے پوری طرح صاف ستھرا کر ڈالا۔

فوجی دستے کی مارچ ہنوز جاری تھی۔ شاید پورا دستہ پہاڑی سے اتر آنے کے بعد اس کا عقبی حصہ واضح ہوتا۔ فی الحال تو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ مارچ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ چنگ آ ک کی والدہ نے اپنے رومال سے اس کی گردن اور چہرے پر اٹی دھول کو صاف کیا۔ اس کے سینے میں مٹی اور پسینے کی بو کو صاف کرنے کی کوشش کی، پھر اس کا منہ پانی سے دھلوایا۔ چنگ آ ک نے جوگرز کے اندر ہی اپنے پاؤں پر بھی خوب پانی ڈالا۔ وہ اپنی والدہ سے کہنا چاہ رہی تھی کہ وہ بھی منہ ہاتھ دھولیں کیونکہ پانی بہت ہی ٹھنڈا اور فرحت بخش تھا مگر پھر وہ کہہ نہیں پائی۔ انہوں نے اپنے چہرے پر میک اپ بری طرح تھوپا ہوا تھا۔ ہونٹوں کی لپ سٹک مٹی کے غبار میں اٹی اپنی جگہ بہرحال موجود تھی۔ ان کے کالے سیاہ بال کسی کوے کے پروں کی طرح بکھرے تھے۔ بھلا وہ ان سب سے جان کیسے چھڑاتیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ مرتے وقت بھی سولہ سنگھار کی فرمائش کر کے جاتیں۔ چنگ آ ک اپنے الٹے سیدھے خیالات پر خود ہی شرمندہ سی ہوگئی۔

بچہ چنگ آ ک کے پیچھے چلتے چلتے دوبارہ منہ بسورنے لگا۔ اسے کئی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ مثلاً یہ فوجی دستہ اتنی شدید گرمی میں مٹی کیوں پھانکتا جا رہا ہے۔ اس کے ننھے پاؤں اس چلچلاتی اور مٹی سے اٹی دھوپ میں پتھریلی اور ناہموار زمین پر کیوں بلاوجہ تھکائے جا رہے ہیں۔

اسی دوران نوجوانوں کا ایک گروہ جینز میں ملبوس ہاتھوں میں گٹاریں سنبھالے پاس سے گزرا۔ مارچ کرتے ہوئے فوجی جوانوں کے کندھوں پر لٹکی بندوقوں پر پڑتی سورج کی شعاعیں دیکھ کر چنگ آ ک کے جسم میں ایک برفانی لہر سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ خوف سے زیادہ لاحاصلی لوگوں کو مار ڈالتی ہے۔۔۔۔ ایک دفعہ اس نے' کسی دہشت گرد کی طرح یہ الفاظ کہے تھے۔

''نانی کی سواری کرنا پسند کرو گے؟'' چنگ کی والدہ نے اپنی بیٹی کو تھوڑا بہت آرام دینے کی غرض سے کہا مگر بچہ اس اثنا میں دوبارہ اپنی ماں کی کمر پر سوار ہو چکا تھا۔ اس نے نانی کا منہ

چڑا دیا اور اس کے بعد اپنا چہرہ دوسری طرف کر کے بالکل ہی انجان بن گیا۔ ''عجیب لونڈا ہے۔ کیا نانی کی کمر پر کانٹے اگے ہوئے ہیں؟'' انہوں نے بظاہر غصیلے لہجے میں کہا۔ چنگ آ ک بچے کو الزام نہیں دی سکتی تھی۔ وہ اپنی نانی سے زیادہ مانوس نہیں تھا کیونکہ وہ سال میں زیادہ سے زیادہ دو تین بار ہی مل پاتے تھے۔

چنگ آ ک نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گھر سے چلے ہوئے انہیں دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ انجانے میں وہ گھنٹے سے زیادہ چہل قدمی تو ویسے بھی کر لیا کرتی تھی۔

وہ سوچ جا رہی تھی کہ پہاڑی کے اگلے موڑ پر واقع قبرستان میں بھی جائے گی۔

''تھوڑا سا ستا لیا جائے۔'' چنگ آ ک کی والدہ نے کہا اور سڑک کے ساتھ ہی درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ اپنے سینڈل سے نیچے موجود ریت کو ہلاتے ہوئے انہوں نے رومال سے چہرے کا پسینہ اور گرد صاف کرنے کی کوشش کی۔ چھتری کے باوجود سورج کی حدت سے ان کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ چنگ آ ک نے بھی اپنے گرد آلود اور جھلستے چہرے پر اپنی ہتھیلیاں ملیں۔ اس کے ہاتھ بچے کا بوجھ سنبھالے سنبھالے بری طرح سوج گئے تھے اور وہ اس ادھیڑ بن میں تھی کہ یہ کیسے ٹھیک ہوں گے۔

درخت خاصا گھنا تھا اور اس کے سائے میں تپش خاصی کم لگ رہی تھی۔ چنگ آ ک کی نظریں بار بار فوجی دستے پر پڑ رہی تھیں حالانکہ وہ اب کافی دور چلے گئے تھے اور ان کی شکلیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنی آنکھیں اور زیادہ کھول سکے تو انکی پیٹھ پر لدے ضروری راشن، بستر اور ہتھیار تک اسے صاف دکھائی دینے لگیں گے۔

وہ یوں گیا تھا جیسے جنگ چھڑنے والی ہے۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' یہ پوچھتے ہوئے چنگ آ ک کو اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے۔ صبح ہونے ہی والی تھی جب وہ گھر سے رخصت ہونے لگا۔ اس کے کاندھوں پر ایک بڑا سا تھیلا، مچھلیوں کا جال اور پتہ نہیں کیا الا بلا لدا تھا۔

''کہیں بھی، جہاں بہت ساری مچھلیاں مل سکیں۔''

''ٹھیک ہے چابیاں یہاں ہوں گی۔'' چنگ آ ک نے میل باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اگر اس کا ہاتھ ڈبے میں صحیح پہنچ گیا تو چابیاں نکل آئیں گی۔ اس نے سوچا۔ پھر ایک لمحے بعد کہنے لگی۔ ''کوئی آیا گیا پوچھے تو اسے کیا بتاؤں؟''

''افق کے پار یا دیوتاؤں کے جزیرے میں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ جواب اسے کسی استعارے کی طرح لگا۔ اپنے اوٹ پٹانگ جواب پر وہ خود ہی ہنس دیا جیسے اپنی خفت مٹا رہا ہو۔

''ممکنہ حد تک باہر سونے سے پرہیز کرنا' یہ تمہاری صحت کے لئے اچھا نہیں۔''

تمہارے لئے اچھا نہیں۔ ان لفظوں پر سوچتے سوچتے اس کے ہونٹوں پر ایک جبری مسکراہٹ آ گئی۔ تمبا کو تمہارے لئے اچھا نہیں سو اعتدال سے سگریٹ نوشی کرو۔ مٹھائی تمہارے دانتوں کے لئے اچھی نہیں۔ رات کو پڑنے والی اوس تمہارے لئے نقصان دہ ہے اسے محسوس ہوا کہ یہ عام سے فقرے' جن سے اسے عمومیت اور سکون کا احساس ہوتا تھا' دراصل بے سروپا اور استہزا آمیز معنویت کے حامل تھے۔

داخلے کا گیٹ آ گیا۔ گیٹ کی بالائی گرل پر درج تھا۔ آن شک میموریل پارک۔ اتنی لمبی تگ ودو اور انتظار کے بعد ایک دم ہی گیٹ نظروں کے سامنے تھا۔ منزل پر بالآخر پہنچ جانے کا احساس بہت ہی فرحت انگیز تھا۔

''یہ لو' پہنچ گئے ہم۔''

لیکن چنگ آ ک نے والدہ کی بات سنی ان سنی کر دی اور آ گے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

کیکر کے پیڑوں کے بیچوں بیچ ایک راستہ آ گے نکل رہا تھا لیکن اردگرد قبرستان کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ چنگ آ ک کو ذہنی طور پر دھچکا سا لگا۔ اس کا خیال تھا کہ جیتی جاگتی دنیا اور ابدی نیند سو جانے والوں کے علاقوں کے درمیان کوئی واضح تقسیم نظر آ ئے گی۔ ایک دم دوسری دنیا کا تصور ابھرے گا مگر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ راستہ سڑک سے ہٹ کر پہاڑی کے چڑھاؤ کی طرف گھومتا آ گے جا رہا تھا۔ اس نے تھوڑا سا غور کیا کہ کیا وہ یہاں واقعی محض آوارہ اور بھٹکتی روحوں کو دیکھنے آئی ہے یا وہ یہاں دنیا سے مختلف رنگوں' خوشبوؤں اور سکوت کی وہ صورتیں محسوس کرنا چاہتی ہے جن سے پہلے کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

راستہ آہستہ آہستہ پہاڑی کی بلندی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دو رویہ درختوں کے جھنڈ ختم ہوتے ہی راستہ کے ایک جانب لکڑی کی چھوٹی سی عمارت تھی جس میں ایک طرف کھانے پینے اور دوسری ضروری اشیا کی دوکان تھی اور دوسری طرف موجود آفس کوئی پراپرٹی ایجنسی لگ رہا تھا۔ شیشے کے دروازے سے لوہے کی ایک میز پر ٹیلی فون دکھائی دے رہا تھا۔ دیوار پر غالباً قبرستان کا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ باہر سے وہ کسی بڑے شہر کا تفصیلی نقشہ لگ رہا تھا۔ دو آدمی اندر بیٹھے

شطرنج کھیل رہے تھے۔ ایک آدمی خالی بنیان پہنے بیٹھا تھا جبکہ دوسرا خاکی رنگ کی شرٹ پہنے تھا۔ اس کے گریبان کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے اور گردن سے سینے تک کا سارا حصّہ کھلا ہوا تھا۔

''سنیے!'' چنگ کی والدہ نے انہیں مخاطب کیا۔ دروازہ کھلتے دیکھ کر دونوں ہی چونک گئے۔ ایک نے ان سے کہا۔ ''زمین کی فروخت عرصہ ہوا بند ہوچکی ہے۔'' اور دونوں دوبارہ شطرنج کی بساط پر جھک گئے۔ انہوں نے بیگ کھول کر اس میں سے ایک لمبا پتلا براؤن رنگ کا لفافہ باہر نکالا اور کہا: میں نے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا تھا۔ اس بات پر بنیان پہنے ہوئے آدمی نے کاہلی سے ان کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ''میں پہلے بھی ایک دفعہ یہاں آئی تھی مگر مجھے یقین نہیں کہ میں اپنی خریدی ہوئی جگہ تک پہنچ بھی سکتی ہوں۔'' چنگ کی والدہ نے بے چارگی سے کہا۔ انہوں نے کن آنکھیوں سے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا۔ وہ ابھی باہر کھڑی جوگرز پہنے پہنے اپنے پاؤں باہر لگے پانی کے نلکے سے دھونے اور صاف کرنے کی کوشش میں تھی۔

چنگ کی والدہ ڈیلر کی طرف زیرلب مسکراتی بڑھیں اور خرید کا معاہدہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''بلاک ڈی۔ یہ سب سے اوپر ہے۔ اوپر چلتی جائیں اور تیسرے موڑ پر مڑ جائیں۔ وہاں آپ کو کچھ زینے سے نظر آئیں گے۔'' خاکی لباس پہنے نوجوان آدمی نے انہیں بتایا۔ ہر لفظ منہ سے نکلتے ہوئے اس کی غیر فطری سیاہ بھنویں تیزی سے اچکتی محسوس ہورہی تھیں۔

''یہ خاص جگہ ہے۔ اڑتالیس مربع فٹ کی' میرے اور میرے شوہر کے لئے۔ کیا تمہارے پیارے شوہر......'' بنیان پہنے آدمی نے اچانک انتہائی ملائم اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ''نہیں میری بیٹی میرے پاس آئی ہوئی تھی سو میں نے سوچا کہ جگہ اسے دکھادوں۔ ہماری اس سے میل ملاقات ذرا کم ہی رہتی ہے کیونکہ اس کا گھر کافی دور کے دیہاتی علاقے میں ہے۔'' انہوں نے چنگ آک کی طرف نگاہ ڈالی۔ اور پھر جوان آدمی کی طرف مسکراہٹ بھری نظر سے دیکھنے لگیں۔ چنگ آک بچے کی جانب متوجہ تھی۔ وہ پانی کے نلکے سے کھیلتا ہوا خوش ہورہا تھا۔

''اگر خاندان کی کوئی میت آنی ہے تو ہمیں بتائیں تاکہ ہم اپنی تیاریاں کریں۔ یہاں مدد کا حصول بھی ایک کاردارد ہے۔ بہرحال ہم ہیں نا یہاں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''مجھے امید بھی یہی ہے۔ جگہ کی خرید میں پہلی شرط یہی تھی اور یقیناً قبر کی مناسب دیکھ بھال بھی تمہاری ذمہ داری ہوگی۔ ہم نے دیکھ بھال کے اخراجات علیحدہ سے دیئے ہیں۔''

''ساری خاص جگہیں اوپری سیکشن میں ہیں۔ خوش قسمتی سے آپ کو وہاں جگہ مل گئی۔ وہاں سے نیچے کا سارا منظر دکھائی دیتا ہے اس سے بہتر جگہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ آدمی زندہ ہو یا مردہ' اسے اس قابل تو ہونا چاہیئے کہ اپنے اردگرد پھیلا ہوا منظر آرام اور سکون سے دیکھ سکے''

''یہی تو اس کی خاصیت ہے۔ ہم نے سوچ سمجھ کر یہ جگہ خریدی تھی۔'' چنگ آک کی والدہ زمین کے بارے میں باتیں کیئے جارہی تھیں لیکن جب وہ دونوں آدمی اپنی بساط کی طرف متوجہ ہوگئے تو انہوں نے معاہدے کے کاغذات واپس اپنے بیگ میں رکھے اور بادل ناخواستہ آفس سے نکل آئیں۔

پہاڑی کے چکر کھاتے رستے پر چلتے چلتے چنگ آک اچانک حیرت سے ٹھٹک کر رہ گئی۔ دور دور تک اونچی نیچی قبریں ہی قبریں نظر آرہی تھیں۔ اسے لگا جیسے سورج سے ہر شے نقطہ کھولاؤ پر پہنچی ہوئی ہے اور قبروں کی تپتی اور جھلستی مٹی صابن کے جھاگ کی طرح ابل ابل کر آنکھوں میں گھس رہی ہے۔ قبروں کے درمیان باقاعدہ راستہ ہونا چاہیئے تھا مگر قریب پہنچ کر پتہ چلا کہ وہ انتہائی بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ہیں۔ ان پر گھاس پھوس اور جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ قبروں کی لوحوں کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا اور اگر کہیں لوحیں مل بھی گئیں تو ان پر کچھ بھی لکھا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ محض نا معلوم سی کھدائی ضرور محسوس ہوئی۔ قبروں کے درمیان ایک راستہ بھی بنایا گیا تھا اور پتھروں کے ذریعے اس کی نشان دہی بھی کی گئی تھی مگر غالباً گذشتہ دنوں کی خوفناک بارش نے سارا انتظام تہ و بالا کر دیا تھا۔ بعض نشان مٹی کے ڈھیر میں چھپ گئے تھے اور بعض ہوا کے زور سے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکے تھے۔

''یہ سارا زبانی گورکھ دھندا لگتا ہے۔'' چنگ آک کی والدہ بولیں۔ ''مجھے تو کوئی خاص دیکھ بھال کے آثار دکھائی نہیں دے رہے یہاں۔ ہم سے تو اخراجات فوراً منگوا لیتے ہیں۔'' اس وقت ان کا لہجہ کاٹ کھانے والا تھا' قبرستان کے داخلی دفتر والے لہجے سے بالکل برعکس۔

بچہ' اپنے اردگرد قبروں کا جال بچھا دیکھ کر اور غیر فطری سکوت کے ہاتھوں خاصا سراسیمہ نظر آرہا تھا۔ بولا وہ کچھ بھی نہیں' تاہم اس کے چہرے پر زردی اس کے خوف اور دہشت کا واضح اظہار تھی۔ دفتر کے آدمیوں کے مطابق وہ ایک زینے سے اوپر چڑھے۔ زینہ کیا تھا اونچائی کی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کے پرانے نشان تھے۔ ممکن ہے کبھی یہاں باقاعدہ زینہ بھی رہا ہو۔ دھوپ میں بے پناہ تمازت تھی۔ بچہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ راستے میں پڑی

سفیدی پر ایک جھینگر سینہ تانے بیٹھا تھا۔ زمین پر اس کی پھیلتی پرچھائیں موسیقی کے نوٹس کی طرح نظر آ رہی تھی۔

''یہ راستہ جاتا کہاں ہے؟'' بچے نے مشکوک ہوتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھا۔

''یہ راستہ! چنگ آ ک لمحے بھر کو ٹپٹا کر رہ گئی۔ بچہ اتنا بڑا نہیں ہوا تھا کہ اسے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھایا جا سکتا۔ آدمی مر جاتا ہے اور اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ جاتا ہے۔

''تم اتنے عرصے سے ہمیں ملنے کیوں نہیں آئے تھے؟'' چنگ آ ک کی والدہ نے اچانک اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ کل رات جب وہ اپنے والدین کے گھر پہنچی تھی تو اس کی والدہ نے سوتے ہوئے بچے کو اس سے لیتے ہوئے بھی یہی سوال کیا تھا لیکن چنگ آ ک کو اپنا جواب یاد نہیں رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے کہا ہو: گھر کی دیکھ بھال کے لئے کوئی اور تھا ہی نہیں یا میں بہت مصروف تھی۔ بہر حال اس کی والدہ نے آگے یہ نہیں پوچھا: مسٹر لی چھٹیاں منانے گئے ہونگے۔۔۔کہاں گئے ہیں وہ آج کل؟ شاید اس نے دوسرے سوال کا جواب دیا تھا۔ میں خاصی مصروف تھی۔ وہ اس وقت اپنی بھنوؤں سے پسینہ خشک کر رہی تھی۔ ورنل جھیل کے قریب اس کا گھر اور خالی میل باکس میں پڑی دو چابیاں ایک جھماکے سے اس کے ذہن کے خالی پردے پر دکھائی دیں۔ بچے کی ٹرائی سائیکل بھی کہیں گھر کے لان میں اوندھی پڑی ہوگی۔ چنگ آ ک اپنی والدہ کو کھل کر کچھ نہیں بتا سکی۔ اسے دراصل اپنے شوہر کی طرف سے کسی پیغام کا انتظار تھا اور اسی لئے وہ گھر چھوڑ کر یہاں نہیں آ رہی تھی۔ غیر یقینی صورت حال کے ہاتھوں وہ اتنی بددل ہوگئی تھی کہ بعض اوقات الٹی سیدھی افواہوں پر یقین آنے لگتا۔

جب بھی وہ گھر سے جا رہا ہوتا' وہ عادتاً پریشان ہوتی تھی مگر اس کی جلد بازی چنگ کو کبھی سمجھ نہیں آئی۔ اس وقت بھی سوچتے سوچتے وہ چکرا سی گئی۔ اسے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز ذہن کے کسی گوشے میں بجتی سنائی دی۔ شاید وہ گھنٹی اس وقت بھی خالی گھر میں گونج رہی ہو۔

''ہیلو' مسٹر لی سے بات ہو سکتی ہے؟''

''وہ گھر میں نہیں ہیں۔''

''آپ کو معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں؟'' وہ پرسکون اور صبر آزما آواز پھر سنائی دیتی۔ مردانہ دوستانہ لہجہ ہوتا تھا۔ وہ صرف خیر خیریت پوچھنے کی حد تک بات کرتا۔ اس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ اس کے فون کرنے کا مقصد کیا تھا۔ چنگ آ ک کبھی کبھی اس شخص کے مختصر اور پیشہ ورانہ

استفسار پر جھنجھلا جاتی۔

''میں مسٹرلی سے بات کرسکتا ہوں۔''

''وہ کسی تفریحی کلب کے ساتھ باہر گئے ہیں۔''

''آپ بتائیں گی' کون سے کلب کے ساتھ؟''

''میرے خیال میں ہوپ کلب ہے مگر ضروری نہیں کہ یہ درست ہو۔''

''آپ کو پتہ ہے انہیں کسی سے ملنے جانا تھا؟''

''دیکھئے وہ مجھے اپنی خارجی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے......''

اکثر اوقات وہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی ٹیلی فون پر بات کرنے سے انکار کردیا کرتا تھا۔

''کیا مسٹرلی دوبارہ کہیں نکل گئے ہیں؟ مجھے یہ احساس ہوتا ہے جیسے ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔''

وہ آدمی جب بھی بات کرتا اس کے لہجے میں سادگی ہوتی یا ہلکا سا تمسخر' بہر حال وہ نادیدہ آواز پوری تندہی سے اس کے شوہر کا کھوج لگانے میں مصروف رہتی تھی۔

''وہ نائی سے بال کٹوانے گئے ہیں۔''

''کس دکان پر؟''

''اس کا نام ہے زندگی کی بہاراں۔''

''اچھا نام ہے۔ہا' ہاہا۔''

اس دن' بال کٹوانے کے بعد گھر آ کر اس نے پہلی دفعہ یہ کیا کہ قینچی کی مدد سے ٹیلی فون کی تار کاٹ دی۔ تاہم اس کے جانے کے بعد چنگ آک نے لائن بحال کرالی تھی۔

''کسی ڈاکو نے یہ حرکت کی تھی کیا؟'' تار کی مرمت کے لئے آنے والے لائن مین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ٹیلی فون کی تار' بری طرح کٹی پھٹی' اس کے سامنے بکھری پڑی تھی۔

ٹیلی فون کی لائن بحال ہوتے ہی وہ آواز ٹیلی فون پر پھر گونج رہی تھی جیسے ریسیور کے اندر ہی قید ہو۔

''ہیلو' مسٹرلی سے بات ہوسکتی ہے؟''

''وہ مچھلی کے شکار پر گئے ہوئے ہیں۔''

''اوہ! مچھلی کے شکار پر؟''

''وہ اکثر مچھلی کے شکار پر جاتے رہتے ہیں۔'' چنگ آ ک ذرا بلند آواز میں اسے جتاتے ہوئے بولی۔''یہ ان کا پرانا شوق ہے۔''

''وہ کسی کے ساتھ گئے ہیں؟''

''دیکھئے' میں یقین سے نہیں کہہ سکتی' کبھی وہ اکیلے جاتے ہیں اور کبھی گروپ کے ساتھ۔''

''آپ کو پتہ ہے' وہ کہاں گئے ہیں؟''

''انہوں نے کچھ بتایا تو تھا۔کوئی دیوتاؤں کی جھیل جیسا نام۔میرا خیال ہے انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہیومن پارک کے آس پاس کسی علاقے میں موجود ہوں گے۔''

''اگر وہ ٹھیک ٹھاک مچھلیاں پکڑ لائیں تو خاتون شاندار طریقے سے انہیں پکائیے گا۔میں بھی کھانا کھانے آؤں گا۔''اس کی آواز میں دبا دبا قہقہہ بھی گونج رہا تھا۔

اگرچہ چنگ آ ک اس کی باتیں سنی ان سنی کر دیا کرتی تھی لیکن بعض اوقات اس کا دبا دبا قہقہہ کافی دیر تک اس کے کانوں میں گونجتا رہتا۔فون کرنے والا' بظاہر خوش مزاج لگتا تھا لیکن بعض اوقات یوں لگتا جیسے وہ اپنے مخصوص کھنکھناتے قہقہے کی آواز خود بھی سننا پسند کرتا ہے۔

چنگ آ ک کی سماعت میں گونجتا قہقہہ' اپنے شوہر کی جدائی کے دکھ کو ہلکا کر دیتا اور اس کی شکل بھی اس کے تصور میں دھندلانے لگتی۔بعض لمحوں میں اس کی جدائی اسے بری طرح ستاتی اور وہ گویا خود سے پوچھتی پھرتی۔کہاں ہو تم؟ اسے اپنی آواز خالی گھر میں گھومتی اور گونجتی محسوس ہوتی۔آخر وہ کہاں جا سکتے ہیں؟

''وہ بلاسبب مجھے کیوں ڈھونڈتے پھریں گے؟''ایک بار اس نے کہا تھا۔

تنگ راستے پر کنکر اور پتھر جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔چنگ آ ک کے پاؤں کی سوجن کچھ اور بڑھ گئی تھی۔وہ مخصوص زمین ایک انتہائی تنگ سی پٹی پر اوپری ڈھلان کے ساتھ ساتھ موجود تھی۔وہاں کوئی نمبر نہیں تھے۔چنانچہ چنگ آ ک کو اپنی والدہ کی ناقابل اعتبار یادداشت پر ہی بھروسہ کرنا پڑا۔وہ صحیح جگہ کی نشان وہی کی کوشش میں تھیں۔

چنگ آ ک نے بچے کو دوبارہ اپنی پیٹھ پر چڑھا لیا۔چڑھائی کا راستہ اتنا تنگ تھا کہ بیک وقت دو آدمی اوپر نہیں چڑھ سکتے تھے۔اس کی والدہ پھیلی ہوئی قبریں دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔پہلے یہاں قبروں کی ترتیب وار جگہ تھی' ہموار اور کشادہ۔تنگ آ کر' انہوں نے قبرستان کا نقشہ باہر نکالا اور شروع سے اس نقشے کے مطابق بڑھنا شروع کر دیا۔وہ قبروں اور نقشے میں

موجود جگہوں میں مطابقت تلاش کرتی آگے جا رہی تھیں۔ ایسے کرتے ہوئے' ان کے سینڈل مسلسل زمین سے مٹی اور کنکر اڑا رہے تھے۔

بالآخر بشاشت ان کی چہرے پر نمودار ہوئی۔ وہ اپنی مخصوص زمین ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ وہ جگہ' جہاں ان دونوں کو ابدی نیند کے لئے آنا تھا۔ مگر اچانک ان کی چہرے پر ناگواری پھیلنے لگی۔ یہ جگہ تو عام لوگوں کے لئے تھی۔ وہ کیسی جگہ مخصوص کرا بیٹھی تھیں۔

ان کا آبائی قبرستان شمالی کوریا میں واقع ایک پہاڑی پر تھا۔ چنگ آک کو بتایا گیا تھا کہ شمال میں' اگر کوئی شخص سردیوں میں مر جاتا تو اسے وقتی طور پر عارضی قبرستان میں دفنایا جاتا تھا اور برف پگھلنے کے بعد' اس کی لاش اصل قبرستان میں دفنانے کے لئے لے جائی جاتی۔ اس کی تدفین کی تمام رسوم باقاعدہ' دوبارہ ادا کی جاتی تھیں۔ ''یہاں تک آنے کے لئے تو پوری کور کا انتظام کرنا پڑے گا۔ دو چار آدمیوں کے بس کی بات نہیں' یہاں تک تابوت لانا۔'' چنگ آک کی والدہ نے ریتلی سطح پر' اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے جنگلی جھاڑیوں کی پھیلی شاخوں کو پکڑ کر آگے قدم بڑھایا۔ اس چڑھائی پر چڑھتے ہوئے ان کا سانس بری طرح پھولنے لگا۔ چنگ آک اپنی سانسوں پر قابو رکھنے کو کچھ لمحوں کے لئے وہاں رکی اور پیچھے کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ واقعی بہت لمبا اور دشوار گزار راستہ طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔ خاصا نیچے' وادی کے ایک کونے میں' سات آٹھ لوگ قبر کھودنے میں لگے ہوئے تھے۔ غالباً کوئی میت تدفین کے لئے آ رہی تھی۔

وہ ہمیشہ صبح سویرے پہاڑوں میں جایا کرتا تھا۔ چنگ آک اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہوتی تھی۔ اسے خبر بھی نہیں ہوتی تھی اور وہ گھر سے نکل جاتا۔ خواب کی سی کیفیت میں' وہ جب بھی گیٹ کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنتی' خوف سے کپکپانے لگتی اور سوچتی: شاید اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔ خواب کی حالت میں ہی وہ خود کو پرسکون کرنے کے لئے' تسلیاں دینا شروع کر دیتی۔ وہ کہیں گیا تھوڑا ہی ہے۔ میں تو خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہ سوچتی۔ دن کی روشنی ہوتے ہی' جب میری آنکھ کھلے گی' وہ گھر واپس آ چکا ہوگا اور ہمیشہ کی طرح باتھ روم میں دانت چمکا رہا ہوگا۔ اس کی صبح کی نیند بڑی مختصر ہوتی اور اس کے خواب بھی عجیب بکھرے بکھرے ہوتے۔ ایک دو بار اس نے' اس کے تعاقب کے متعلق بھی

سوچا مگر وہ اپنے ارادے کو حقیقت کی شکل کبھی نہیں دے سکی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ دن چڑھے تک بستر میں پڑے رہنے کی عادی تھی۔ ان کے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ صبح کے وقت، وہ اس کی سرگرمیوں میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ وہ سارا دن اونگتا رہتا یا مچھلیوں کے شکار پر چلا جاتا۔ شام گئے ہلکی پھلکی ورزش بھی ضرور کرتا تا کہ رات کو گہری نیند کے مزے لے سکے۔ گھر کے سیوریج کی صفائی یا بچے کے ساتھ کھیل کود جیسے کام بھی وہ شوق سے کرلیا کرتا تھا۔ اس نے لوگوں سے بھی صبح کی سیر کے بڑے فائدے سن رکھے تھے اور اس کے شوہر کو اس کی عادت بھی تھی، اس لئے وہ اس دوران، عموماً یہ ظاہر کرتی کہ وہ بے خبر سو رہی ہے۔ جب وہ گھر لوٹتا اور کمرے کا دروازہ کھلتے ہی، اس کے ساتھ ٹھنڈی ہوا اور روشنی کا ریلا اندر آتا تو وہ اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ جاتی۔ بچے کو کھلا پڑا دیکھ کر، اس پر رضائی اُڑھا دیتی اور پھر ناشتے کی تیاری میں لگ جاتی۔ آپ تھوڑی سی نیند اور لے لیا کریں۔ وہ دبے دبے لہجے میں اس طرح کہتی جیسے وہ گھر کے کسی بزرگ فرد سے مخاطب ہو، جو صبح سویرے اٹھ کر، گھر کے صحن اور گھر سے باہر کی صفائی میں لگے رہنے کے بعد تھک گیا ہے۔ پھر وہ مڑ کر بڑبڑانے لگتی۔ ''مجھے کیا پتہ؟ میں تو سیدھی سادی لاعلم عورت ہوں لیکن میں نے اس بات کو اپنی بدقسمتی ہرگز نہیں گردانا۔ میں ان عورتوں میں سے ہوں جو بارش کے بعد نرم اور حرارت بخش زمین میں پھولوں کے بیج بویا کرتی ہیں اور ان کی کونپلیں نکلتے اور پھول کھلتے دیکھ کر خوشی سے جھوم اُٹھتی ہیں۔ اگر مجھ میں یہ آرزو نہ ہوتو میں بھی دوسری دنیادار عورتوں کی طرح آرام سے اپنا وقت گزار دوں۔ میرا ایک مستقبل بھی ہے۔ میرا بیٹا۔ لیکن اگر وہ یہ سب سن لیں تو غالبًا ان کا جواب کچھ یوں ہوگا۔ تمہارا کہنا ہے کہ ہم کچھ بیج بو دیں اور سادہ سی زندگی گزار دیں لیکن تم یہ کرنا کیوں چاہتی ہو؟ اسی لئے نا کہ تم پھولوں کو دیکھنا چاہتی ہو۔ ہے نا یہی بات؟'' انہوں نے اپنے بچے کیلئے ایک دنیا تشکیل کی تھی۔ بقول چنگ آ ک کے: مستقبل کی دنیا۔ ایک ایسا زمان ومکان، جس میں وہ موجود نہیں ہوگی۔ تاہم اس کا خون اور اس کا جسم، کسی اور شکل میں وہاں ہوگا۔ خدا کی پناہ! کبھی یہ صاف اور خالی پہاڑی رہی ہوگی اور آج اتنے سارے لوگ یہاں آرام کر رہے ہیں۔ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اس کی والدہ نے نقشہ غور سے دیکھا، پھر قبروں پر نظر دوڑائی اور پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے زور سے بولیں۔ ''یہ رہی وہ جگہ۔'' مستطیل شکل کی خالی جگہ جھاڑیوں سے اٹی پڑی تھی۔ چنگ آ ک کو وہ جگہ اپنی توقع سے کہیں چھوٹی لگی۔ شاید اردگرد بنی ہوئی قبروں کی

وجہ سے ایسا محسوس ہو رہا ہو۔ ابھری ہوئی جگہوں میں' وہ ایک چھوٹا سا گڑھا لگا۔ اس کے برابر میں موجود قبر اسے بالکل تازہ لگی ۔ شاید مرنے والے کے لواحقین' حال ہی میں وہاں سے ہو کر گئے تھے۔ قبر پر پھولوں کے گلدستے موجود تھے' ایک صاف ستھرے کاغذ پر چینی حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک اخبار میں لپٹا ہوا بچا کھچا کھانا بھی تھا۔ شراب کی خالی بوتل' چائے کے کاغذی کپ اور نہ جانے کیا کیا کچھ وہاں بکھرا ہوا تھا۔ شاید اچانک بارش آ جانے کی وجہ سے' انہیں اردگرد بکھری چیزیں اٹھانے اور صفائی کرنے کی مہلت نہیں مل پائی تھی۔ گرمیوں میں ایسی بارش کا ہو جانا کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں۔ چنگ آ ک جگہ کو غیر متوقع طور پر چھوٹا اور ناکافی سمجھ رہی تھی۔ اس کی والدہ نے اس کا شک دور کرنے کی کوشش کی۔ ''اب اتنی بھی چھوٹی جگہ نہیں ذرا دیکھو' کسی بھی قبر سے اس کا موازنہ کرو' فرق صاف سامنے آ جائے گا۔ میرے خیال میں تو دو آدمی با آسانی یہاں دفن ہو سکتے ہیں۔'' خالی جگہ پر جھاڑیوں کا جھنڈ سا بنا ہوتھا اور چنگ آ ک کے لئے یہ تصور کرنا خاصا مشکل تھا کہ کبھی یہ جگہ جھاڑیوں کے تسلط سے نہ صرف آزاد ہو گی بلکہ اس میں مطلوبہ نعشوں کی تدفین بھی کی جائے گی۔ بچہ اتنی دیر میں نہ صرف اپنی حیرت پر قابو پا چکا تھا بلکہ اردگرد سے مانوس بھی ہو گیا تھا۔ چنگ آ ک نے سوچا: چلو اچھا ہوا' جان چھٹی' ورنہ اس کے الجھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے سوالات کا جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ ہم کہاں ہیں؟ یہ وہ جگہ ہے' جہاں مردوں کو دفنایا جاتا ہے۔ مردے؟ مرنا کیا ہوتا ہے؟ یہ مردے لوگ درحقیقت کون تھے؟ اس نے آخری سوال گویا خود سے کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے اپنے زمانے میں زندہ رہے تھے اور اسی کی طرح بہت سے واقعات کا' انہوں نے بھی مشاہدہ کیا تھا۔ البتہ یہ لوگ اس کے لئے انجان تھے۔ ممکن ہے کسی جگہ' سڑک کے کنارے' وہ ایک دوسرے کے پاس سے تیزی سے گزر گئے ہوں؛ شاید کہیں ان کی نگاہیں بھی ایک دوسرے سے ٹکرائی ہوں۔ یہ لوگ بھی صبح کو اٹھتے تھے اور رات کو سو جاتے تھے۔ انہی لوگوں کی ہمراہی میں' اس نے دھوپ' آندھی' برف باری اور بارش کا مشاہدہ کیا تھا۔ انہی لوگوں کی زندگی کے کسی خاص لمحے میں' وہ اس دنیا میں آئی تھی اور اس کی زندگی کے کسی گزرتے لمحے میں' وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ زندگی کے بہت سے تکلیف دہ لمحات' شاید ان پر یکساں کیفیات چھوڑ کر گزرے ہوں گے' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ اس متحرک اور پر ہجوم دنیا سے کنارا کر چکے ہیں۔ دارالحکومت کے مضافات' خاصی دور ہونے کے باوجود' دکھائی دے رہے تھے۔ دن خاصا

صاف شفاف تھا پھر بھی شہر کا منظر بہت مدہم اور دھندلا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک خنک ہوا چلنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چنگ آ ک کی پیشانی سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دوش پر لہریئے کھاتا ہوا' شہر کا منظر بھی' دوبارہ اس کی آنکھوں میں آ کھڑا ہوا' ہوا کا شور اس کے کانوں کے آس پاس سے گزرتا اور کبھی غائب ہوتا محسوس ہوا۔ شاید دور کہیں کسی ڈھول کے بجنے کی آواز تھی یا محض ساعتوں اور فاصلوں کی درمیانی گونج تھی۔ عجیب انجانی اور غیر یقینی سی کیفیت تھی۔ بہر حال خنکی کا ریلا آیا اور پھر غائب بھی ہو گیا۔ گونج آنا بند ہو گئی اور شہر کا منظر نسبتاً واضح ہو گیا۔ دھوپ دوبارہ چنگ آ ک کو پریشان کرنے لگی۔ اس نے اپنی والدہ کی جانب دیکھا جو زمین پر ایک اخبار بچھائے' آرام سے اس پر پاؤں پسارے بیٹھی تھیں۔ شاید چیونٹیاں ان پر چڑھ بھی رہی تھیں۔ وہ کچھ متحیر سی ہو گئی۔ ''کاش یہاں تھوڑی سی چھاؤں ہو سکتی!'' اس کی والدہ نے کہا۔ لیکن اس خواہش کی تکمیل خارج از امکان تھی۔ اس چٹیل پہاڑی پر کسی گھنے درخت کی موجودگی ممکن ہی نہیں تھی۔ شاید ایسے درخت کبھی اگانے کا سوچا بھی نہ گیا ہو کیونکہ ان درختوں کی جڑیں زمین کے اندر مدفون مردہ انسانوں کے گرد اپنا جال پھیلا کر انہیں پریشان بھی کر سکتی تھیں جو کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اس لئے یہاں صرف قبریں اگانے کی حد تک غور و فکر کیا گیا تھا۔ سورج عین ان کے سروں پر تھا۔ ان کے سائے بھی سمٹ کر' ان کی پیروں تلے چھپنے کی کوشش میں تھے۔ ان کے جسم کے کھلے حصے دھوپ کی تمازت سے لال گلال ہو رہے تھے۔ تھیلے میں کپڑے کی لائننگ کچھ گیلی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے اندر کوئی چیز لیک ہو رہی ہو۔ چنگ نے تھیلا خالی کر دیا۔ ایک سفید تولیا زمین پر پھیلا کر کھانے پینے کی چیزیں' تربوز اور سوفٹ ڈرنکس سجا دی گئیں اور اسطرح ایک خوش نما پکنک ٹیبل ترتیب پا گئی۔ کیا اس لئے ہم یہاں آئے تھے؟ چنگ آ ک نے خود سے کہا۔ ناشتے کے دوران' جب اس کی والدہ نے قبرستان جانے کے بارے میں اس کا ارادہ معلوم کیا تھا تو اس نے فوراً ہی حامی بھر لی' شاید اس لئے کہ وہ اپنے تصور میں موجود تنہائی اور پرسکون ماحول کا حقیقی نظارہ کرنا چاہ رہی تھی' وہ ان لوگوں کی دنیا دیکھنا چاہ رہی تھی جو اب اس کی دنیا سے دور جا چکے تھے۔ ظاہر ہے' وہ کسی تفریح کے لئے' اس چلچلاتی دھوپ مٹی اور دھول میں اٹے راستے پر' اپنے چھوٹے سے بچے کو ساتھ لے کر ہرگز نہ آتی۔ اس نے بوتلیں کھولیں' کاربن ڈائی اکسائڈ کا تیز ابال آیا اور اس کے جھاگ ابل کر زمین پر گرنے لگے۔ پورے پرسکوت ماحول میں' بوتلوں سے بلبلے نکلنے کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی ہی نہیں

دے رہی تھی۔ بوتلوں سے نکلتا جھاگ زمین میں جذب ہوکر' شاید مردوں کی پیاسی زمین یا بھٹکتی روحوں کی پیاس بجھا سکے۔ ایسی ہی اوٹ پٹانگ سوچوں کے درمیان' اس نے بوتل کے ایک دو گھونٹ لئے اور باقی بوتل اپنے بیٹے کی طرف بڑھادی۔ ''ہمیں کوئی سایہ دار جگہ ڈھونڈنی چاہئے۔'' چنگ آ ک کی والدہ پھر بڑبڑائیں۔ لیکن ان کا کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہاں کہیں کوئی سایہ نہیں تھا اور چھتری کے سوا' کوئی اور سایہ کرنے کی چیز ان کے پاس نہیں تھی۔ چنانچہ سورج کے رخ پر چھتری کو کسی طرح نصب کرکے' نانی نے بچے کو پیار سے آواز دی۔ ''یہاں سائے میں آ کر بیٹھو۔'' بچے کا چہرہ کسی پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بوتل کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور پیاس بجھنے کے فرحت انگیز احساس کے ساتھ' اپنے ہونٹ چاٹنے لگا۔ ''ننھے بدمعاش! لگتا ہے بڑے ہوکر زبردست پینے والے بنوگے' تمہارے ڈیڈی بھی پیتے ہوں گے؟'' بچے کی نانی نے زوردار قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔ چنگ آ ک بھی ہنسنے لگی۔ بچے نے جب یہ دیکھا کہ اس کی حرکت سے اس کی ماں اور نانی محظوظ ہوئے ہیں تو وہ ہنستے ہوئے اور تیزی سے چٹخارے لینے لگا۔ ''کافی بڑی جگہ ہے۔'' چنگ آ ک نے کہا۔ ''میرا خیال ہے' یہ جگہ دو آدمیوں کے لئے ہی ہوگی۔ محل وقوع بھی اچھا ہے۔'' اس نے اپنی رائے کے بالکل برعکس یہ جملے' محض اپنی والدہ کے اطمینان اور تسلی کے لئے ادا کئے۔ انہوں نے اس جگہ کے حصول میں خاصی محنت کی تھی اور انسانی فطرت کے عین مطابق' وہ اپنی محنت کی داد بھی یقیناً چاہتی ہوں گی۔ ''یہ جگہ بڑی ہے؟ مذاق کررہی ہو؟ دو آدمیوں کیلئے تو یہ بہت ہی تنگ ہے۔ انہیں دو آدمیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جگہ کھودنی ہوگی جس کے لئے انہیں اس جگہ سے دوگنی جگہ چاہئے۔'' اس کی والدہ نے نفی میں اپنا سر ہلایا: ''اس سے کام نہیں چلے گا۔'' بڑی جلدی' ان کی سوچ کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ چنگ آ ک نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''تمہیں تو پتہ ہے' جب وہ دو آدمیوں کو دفن کرتے ہیں تو قبروں کے درمیان سوراخ کرتے ہیں۔ اس طرح طرفین باہم منسلک ہوجاتی ہیں۔ پھر اوپر قبر بناتے ہیں۔ تمہارے دادا کی تدفین کے وقت بھی' اسی طرح کیا گیا تھا۔ جب ان کی موزوں جگہ پر تدفین کے لئے' ان کی نعش باہر نکالی گئی تو دونوں قبروں کے مابین سوراخ ایک کشادہ راستے کی شکل بن چکا تھا۔ سمجھ رہی ہونا' وہ دونوں بڑوسی آرام سے ایک دوسرے سے مل سکتے ہوں گے۔'' ایک شرمیلی مسکراہٹ ان کے چہرے پر آئی۔ ان کا یہ انداز اس یقین کا مظہر تھا کہ اس دنیا میں اکٹھا رہنے کے بعد' ان کا مقدر' اگلی دنیا میں بھی اپنے

شوہر سے ہی نتھی رہے گا۔ لڑکپن میں چنگ آ ک اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک خفیہ کھیل کھیلا کرتی تھی غالبًا لوک کہانیوں کی کسی کتاب سے انہیں اس کھیل کا علم ہوا تھا۔ ایک کہانی کے مطابق اگر کوئی لڑکی اپنی قسمت کے محافظ..........چاندی کے منقش چاقو..........کو اپنے ماتھے پر لگا لیتی اور پھر چاند کی آخری تاریخوں میں گول آیئنے میں اپنی شکل دیکھتی تو اسے یقیناً وہاں اپنے مستقبل کے شوہر کا چہرہ دکھائی دیتا۔ لڑکیوں کو توہمات پر یقین ہو نہ ہو وہ اس طرح کی سرگرمیوں میں بھر پور طریقے سے حصہ لیتیں تا کہ انہیں اپنے مستقبل کے ساتھی کا چہرہ نظر آ جائے۔ یہ اور بات کہ آیئنے میں کبھی بھی کسی کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ چنگ آ ک نے بھی یہ کھیل کافی عرصہ تک کھیلا رات کو سونے سے پہلے وہ کمرے کی لائٹیں بجھا دیتی اور تاریک کمرے کے تاریک تر آیئنے میں بستر میں لیٹے ہوئے اپنی نظریں جما دیتی کہ شاید کسی لمحے اس کے ہونے والے شوہر کا چہرہ آیئنے میں نمودار ہو جائے۔

شادی ہونے کے بعد ان میں کوئی اجنبیت باقی نہیں رہی اور وہ اس سے اور اس کے چہرے کے نقوش سے اتنی زیادہ مانوس ہوگئی جیسے وہ اسے جنم جنم سے جانتی تھی۔ ناکامی کے موہوم سے شکوک نے اس کے قدموں کو روکنا چاہا تھا مگر اس نے اپنے شوہر کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ایک باوفا بیوی رہنے کا عہد کیا تھا۔ مخلص اور سچا ساتھی رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ میاں اور بیوی کا اٹوٹ رشتہ نباہنے کا اقرار کیا تھا۔ اس کے بعد ایک سیاہ تاریک رات میں تیرہ آیئنے کے سامنے اس نے اپنے شوہر کا چہرہ پہچانا تھا۔

پہلی بار وہ سڑک کے ساتھ دھول اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ چلچلاتی دھوپ سے اس کا چہرہ جل رہا تھا اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ پیاس بجھانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جھیل کی تلاش میں دور دور تک نظر ڈالی مگر بے سود۔ وہ کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر ہولیا۔ تا حد نظر کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا نہ درختوں پر کوئی کچا پکا پھل لٹکا تھا اور نہ ہی دھان کے خوشے۔ صرف چھوٹی چھوٹی کونپلیں تھیں جو سورج کی حدت سے خود بھی مرجھائی ہوئی تھیں۔

وہ حیرت زدہ تھا کہ پانی کی جھیل آخر گئی کہاں۔ اس وقت تو کاندھوں پر لٹکا ہوا مچھلیوں کا جال اور تھیلا بھی اسے زہر لگ رہا تھا۔ ان کے تسمے اسے اپنے گوشت میں چبھتے ہوئے لگ رہے تھے۔ سرائے والی لڑکی نے بتایا تھا کہ جھیل کا فاصلہ لگ بھگ پانچ میل کا ہے۔ یہ بتاتے

ہوئے وہ چور نظروں سے اس کے نئے جال کو تکے جا رہی تھی۔ خدا جانے اس کے چہرے پر موجود شک وشبہ کسی حقیقت کا غماز تھا یا محض اس کے تصور کی کارفرمائی۔

اس روز وہ کوئی دس بجے جاگا تھا۔ دھوپ اس کے کمرے تک میں گھس آئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی وہ عموماً باہر ہوتی نقل وحرکت کی آواز سننے کی کوشش کیا کرتا تھا اور پھر اٹھا کرتا تھا۔ ریڈیو پر گانوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک لڑکی برآمدے کا فرش دھو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ رات سرائے میں ٹھہرنے کے بعد یہی لڑکی اس کے لئے رات کا کھانا لائی تھی۔

''ناشتے کیلئے کچھ لے آؤں؟''

اس نے اپنا سر ہلا دیا اور دانتوں کو برش کرتا ہوا برآمدے میں نکل گیا۔ لڑکی فوراً ہی اس کے پاس آئی اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے اسے پانی بھرا لوٹا پیش کیا۔ رات بھی اسی طرح اس نے اس کا منہ ہاتھ دھلوایا تھا۔ ''آج چلے جاؤ گے یہاں سے؟''

''میں ہوں کہاں؟ ذرا یہ تو بتاؤ۔'' اس نے اس کے دہکتے ہوئے رخساروں پر نگاہ ڈالتے ہوئے خود ہی سوال کر ڈالا۔ تھی تو عجیب بات لیکن وہ گھر سے نکلنے کے بعد زمان ومکان سے لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ وہ کہاں ہے' اسے کس کس جگہ اور کس سمت کو جانا ہے' اسے ہر جگہ ایک جیسی لگ رہی تھی۔ شاید یہی بات تھی لیکن سو کر اٹھنے کے بد جب وہ سرائے کا اجنبی ماحول دیکھتا تو خوف کی ایک سرد لہر اس کے رگ وپے میں دوڑ جاتی اور وہ اپنے قرب وجوار کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ یہ چنائے اوپ ہے' کیا تمہیں پتہ نہیں؟'' لڑکی نے جان بوجھ کر اس پر نظریں جما دیں۔ لڑکی کے چہرے پر شک کی پرچھائیں آتی دیکھ کر اس نے اپنا سوال بدل دیا۔

''میں پوچھنا یہ چاہ رہا تھا کہ یہاں اردگرد کہیں مچھلیوں کی شکارگاہ بھی ہے کہ نہیں۔''

''کوئی پانچ میل دور سڑک کے قریب ہی ایک خاصی بڑی جھیل ہے مچھلیاں ہی مچھلیاں ہوں گی وہاں۔'' اس نے فوراً ہی نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''سنا ہے وہ شکاری کو گھسیٹ کر پانی میں لے جاتی ہیں۔'' ''بہت سے شکاری وہاں ڈوب چکے ہیں۔'' اس نے بظاہر کپکپاتے ہوئے کہا۔ تاہم وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ اس اثنا میں قریب کے کسی سینما سے لاؤڈ سپیکر پر نئی فلم کا اعلان کیا جانے لگا۔ اس نے سوچا بجائے مچھلی کے شکار کے کیوں نہ یہ فلم دیکھی جائے۔ اس لڑکی کو ساتھ لے جانے سے لوگوں کی نگاہوں میں آنے کا امکان بھی نہیں رہے گا۔

............اس خواب کے کیا معنی ہیں جس کے متعلق تم ہمیں بتا رہے تھے۔ جیسے خواب ہم دیکھتے ہیں' وہ ان سے مختلف تھا۔اسے سمجھنا خاصا مشکل ہے ہمیں لمبی چوڑی وضاحت نہیں چاہیئے۔ اچانک آواز میں نرمی اور ٹھہراؤ آ گیا۔'' آسان لفظ استعمال کروتا کہ ہم سب سمجھ سکیں۔'' انہوں نے ایک زوردار قہقہہ مارا اور اس کے شانوں کو تھپتھپایا لیکن انکی آنکھوں میں ہنسی کے بجائے خون نظر آ رہا تھا۔اس نے بے بسی سے اپنے ہاتھ سمیٹنے کی کوشش کی۔اسے پتہ تھا کہ وہ اس صورت حال سے نجات نہیں پا سکتا۔اس کے گرد موجود زنجیریں مزید کسی جائیں گی جو اس کے شانوں کو پیس کر رکھ دیں گی۔

''فلم دیکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''سرائے کا مالک میری جان کو آ جائے گا اگر میں کسی مہمان کے ساتھ باہر نکلی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور ساتھ ہی ریڈیو کی آواز کچھ اور اونچی کر دی۔

فلم کے پہلے شو کے لئے اسے تقریباً گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑا اور اس کے بعد کے چند مناظر ہی اس کے ذہن میں رہ سکے مثلاً ایک تیز رفتار کار کا ٹکرانا اور شعلوں میں نہاتے ہوئے سمندر میں گر کر غائب ہو جانا' کابوکی اداکاراؤں کے کلوز اپ۔ ان کے پاؤڈر میں لتھڑے ہوئے چہرے وغیرہ۔اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوران فلم کچھ اور ہی سوچتا رہا تھا۔اس کے باوجود' فلم دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آئے تھے۔کیوں؟ وقفہ ہوا' لائٹیں جل گئیں۔تمباکو نوشی منع ہے کے سرخ بورڈ کے ساتھ موجود گھڑی دو بجا رہی تھی۔اس نے وہیں بیٹھے رہنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس وقت بھی سورج کی تمازت جوبن پر ہوگی۔ ناشتہ نہ کرنے کی وجہ سے اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔اس نے سنیک بار سے کچھ پیسٹریاں اور برگر خریدے پیسٹریوں سے ہیک آ رہی تھی۔

دوسرے شو میں بھی اسی منظر پر دوبارہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔رنگ برنگی پتنگیں فضا میں اڑ رہی تھیں۔ پھر مختلف رنگوں کے غبارے اڑ اڑ کر فضا میں پھیلنے لگے۔حبشی اور قازق لوگ' ہیٹ پہنے' ہاتھوں میں اژدھے کے منہ والی لالٹینیں لئے' انتہائی جوش و خروش سے نعرہ بازی کر کے ماحول کو گرما رہے تھے۔ان کے چہروں پر مسکراہٹ امڈ رہی تھی۔اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔منظر میں ایک عورت بازار حسن کی ایک سڑک پر زچگی کے عالم

میں بری طرح تڑپ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف موجود گھروں کی بالکونیوں پر پھٹے پرانے کپڑے اور چیتھڑے، سکھانے کے لئے، لٹکے نظر آ رہے تھے۔

سینما کے پرانے پردے کی وجہ سے فلم کے رنگ صاف اور اچھے نظر نہیں آ رہے تھے، سب ٹائٹل تو سرے سے پڑھے ہی نہیں جا سکے۔ کونے میں بیٹھی کوئی بچی بری طرح خوف زدہ ہو کر چیخ پڑی۔ تاریک اور خالی ہال میں اس خوف زدہ چیخ نے مزید دہشت پیدا کر دی۔

فلم کے دوسرے شو کے وقفے میں، وہ سینما سے باہر نکل آیا۔ سورج بظاہر اسی شدت سے اپنی تمازت زمین پر پھینک رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن کے گرد لپٹی دھند سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنے سر کو بار بار جھٹکتا ہوا، مغربی سمت کو چل پڑا۔ عجیب غیر یقینی کیفیت اس پر طاری تھی۔ چھجے دار ہیٹ پہنے حبشیوں کا وحشیانہ رقص، سر بازار دوران زچگی تھکن سے چور عورت اور بچی کی دہشت انگیز چیخ۔ کیا یہ مناظر اور آوازیں گزرے ہوئے کل کی تھیں؟ انہی گزرتے لمحوں کی یاد آنے والے کل کی؟

ایک انجان راستے پر چلتے ہوئے وہ ادھار میں لی ہوئی اس زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو گزر چکی تھی۔ گذرا ہوا کل، اس سے پچھلا یا ماضی میں بیتے ہوئے بہت سے دن، ہفتے، مہینے، سال۔ اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ اسے اب سمجھ آیا کہ وہ فلم دیکھتے ہوئے کیوں رو پڑا تھا، اس کی وجہ اس کا بیٹا تھا۔ زندگی کی وہ خوبصورتی، جسے دکھانے اور دیکھنے کے لئے لوگ زندہ رہنا چاہتے ہیں حالانکہ اس کا بیٹا بھی اپنے لئے جس زندگی کا خواہاں ہوگا، امن اور سکون کی زندگی، اپنے باپ کی طرح، آخر میں وہ بھی اسے حاصل نہیں کر پائے گا۔

چنگ آک کی والدہ دوسرا تربوز کاٹ رہی تھیں۔ ایک نیل کنٹھ اڑتا ہوا آیا اور ان کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ سورج کی حدت اور ماحول کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کرنے والے اس سیاہ وجود کو دیکھنے کے لئے، لمحے بھر کو وہ بھی رک گئیں۔ چنگ آک کی نگاہیں فطرتاً اپنے بچے کی جانب مڑیں۔ وہ بوریت کے عالم میں خالی بوتل میں پھونکیں مار مار کر پرسکوت فضا میں تھوڑا بہت شور پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اب بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور اس کی حیرت سے پھیلی آنکھیں نیل کنٹھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وادی کے دوسرے سرے سے، اب بھی ہوا کے دوش پر دھیمی دھیمی آوازیں سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ چنگ آک بالآخر پہچان گئی یہ آوازیں گانگ اور جھانجھروں کی تھیں مگر اتنی مدہم اور دور افتادہ کہ خود وہ بھی حیران رہ گئی۔ عام

حالت میں وہ انکی شناخت کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

چنگ آ ک کی والدہ نے نیل کنٹھ کو ترچھی نگاہ سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔ بچہ آہستہ آہستہ نیل کنٹھ کی طرف بڑھنے لگا۔ غیر متوقع طور پر' بچے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر' نیل کنٹھ نے اپنا غصّہ چھپانے کی قطعی کوشش نہیں کی اس کے مضبوط اور خوشنما پروں پر نیلگوں چمک تھی اور پیٹ کا نچلا حصّہ برف کی طرح بالکل سفید تھا۔ اس نے اپنی خونخوار نظریں بچے پر جمادیں حالانکہ بچے نے کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کی تھی ۔ بچے نے بھی پرندے کی غضبناکی محسوس کرلی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں پریشانی اتری مگر فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔ اس کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ بے آواز قدم بڑھاتا ہوا پرندے کے قریب جانے لگا۔ جب ان کا درمیانی فاصلہ بمشکل ایک ڈیڑھ فٹ کا رہ گیا تو نیل کنٹھ اپنے پر پھڑ پھڑاتا ہوا اڑا اور دور کہیں فضا میں گم ہوگیا۔ مایوس بچے نے ماں کی طرف شکایتاً دیکھا۔ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیئے تھوڑی ہی دیر میں نیل کنٹھ دوبارہ ان کی نظروں کے سامنے تھا شاید جلتے سورج کی تمازت میں اس کے سیاہ پر پرواز کا مزا نہیں لے پا رہے تھے۔ وہ پھر کسی قبر پر آن بیٹھا۔ بچہ خوش ہوگیا اور اپنے تئیں انتہائی دبے پاؤں پرندے کی طرف بڑھنے لگا لیکن وہ جونہی اس کے قریب پہنچتا۔ پرندہ پھدک کر ذرا فاصلے پر موجود دوسری قبر پر جا بیٹھتا۔ بچے نے اپنے قدموں کی چاپ ہر ممکن حد تک کم کرکے اس تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن نیل کنٹھ انتہائی ہوشیاری اور مستعدی سے اپنے حریف پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ لمحے بھر کی دیر کیئے بغیر ہوا میں غوطہ لگاتا اور کسی دوسری جگہ جا کر بچے کو للکارنے لگتا۔ تھک ہار کر بچے نے اپنی کوشش ترک کردی تو پرندہ اس کے بالکل قریب آ بیٹھا تاکہ تجے میں نئی امنگ پیدا ہو اور ان کا کھیل چلتا رہے۔ پرندہ بچے پر حاوی نظر آ رہا تھا اور اسے گویا اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں تھا۔ گرد و غبار کے بادلوں میں چھپی سفید رنگ کی ایک بس سڑک پر نمودار ہوئی اور ان کے نیچے کی جانب ہی کسی موڑ پر مڑ گئی۔ دوبارہ نظر آنے پر وہ مخالف پہاڑی کے دامن میں کھڑی تھی۔ اس میں سے کچھ لوگ ایک میت لئے نیچے اترے۔ بعد میں اور بہت سے غم زدہ لوگ غالباً آنجہانی کے دوست اور رشتہ دار بھی بس سے باہر آئے اور وہ سب اسی جانب بڑھنے لگے' جہاں کچھ دیر پہلے چنگ آ ک کی کافی نیچے' نئی قبر پر نگاہ پڑی تھی۔

بچہ مسلسل نیل کنٹھ کے تعاقب میں قبروں اور پتھروں کے درمیان بھاگتا دوڑتا

پھر رہا تھا۔ بعض اوقات پرندہ فضا میں عین اس کے سر کے اوپر اڑنا شروع کر دیتا۔ یوں لگا جیسے دونوں ہی اپنی اپنی زندگی کے ان لمحات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ عورتوں کو پتہ بھی نہیں چلا اور وہ اپنے جوگرز اور موزے دونوں اتار کر پہاڑی کے پتھریلے راستوں پر ننگے پاؤں پھر رہا تھا۔ پھر اس نے ایک نیا کھیل نکالا۔ وہ قبروں پر موجود تعویذ کے گرد انہیں مضبوطی سے پکڑ کر چکر لگانے لگا۔ لٹو کی طرح گھومنے کا اپنا مزا تھا۔

چنگ آ ک نے بچے کی جانب دیکھا۔ وہ اسے نیل کنٹھ سے کھیلتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی وہ کسی اور دنیا کا بچہ لگ رہا تھا۔ نہ آگ برساتے سورج کا خیال تھا اور نہ جھلستی پتھریلی نوکیلی زمین کا۔ اس وقت وہ غالباً اپنی ماں اور نانی کے وجود تک فراموش کیے بیٹھا تھا۔ پہلی دفعہ چنگ آ ک نے اپنے بچے کو خود سے اتنی دور دیکھا جیسے وہ کسی اور بچے کو دیکھ رہی ہو۔ ٹی شرٹ اور نیکر پہنے معصومانہ انداز میں بھاگتا دوڑتا ہوا یہ بچہ کون ہے؟ کیا یہی وہ بچہ ہے جسے اس نے حاملہ ہونے سے بہت پہلے اپنے خوابوں خواہشوں اور تخیل کے دریچوں سے دیکھا تھا۔ حاملہ ہونے سے پہلے چنگ آ ک اکثر تصور میں بچوں کو اپنے اردگرد دیکھا کرتی تھی۔ اس کے ذہن میں اپنے بچے کا کوئی خاص چہرہ یا خدوخال بہر حال نہیں تھا پھر بھی اس کے بچے کے خدوخال خوابوں میں در آنے والے بچوں میں سے کسی سے بھی نہیں ملتے تھے۔ بعض بچے بے دلی کے عالم میں اس کے پاس آتے تھے اور بعض انتہائی جوش وخروش سے۔ میرا بچہ ان میں سے کون سا ہے؟

سہ راہے پر پہنچ کر اس نے سوچا کہ اگر وہ سیدھا چلتا گیا تو جلد ہی قصبے میں پہنچ جائے گا۔ بائیں موڑ پر ایک بورڈ لگا تھا جس پر بدھ مت کا نشان سواستیکا بنا ہوا تھا اور اس کے نیچے ''باٹا مندر' چھ میل'' لکھا تھا۔ مچھلیوں سے بھری جھیل کا راستہ غالباً دائیں جانب کو جاتا تھا۔ وہ تذبذب کے عالم میں وہاں رکا رہا۔ اچانک ایک جانب اس کی نظر ورائٹی سٹور پر پڑی۔ اس کے شیشے کے دروازے پر نوڈلز کا اشتہار لگا ہوا تھا۔ اگر چہ سینما میں کھائی ہوئی ہیک دار پیسٹریاں ابھی تک اسے ہضم نہیں ہوئی تھیں اور کھٹی ڈکاروں نے اسے پریشان کیا ہوا تھا' تاہم کچھ کھانے کی خواہش اپنی جگہ موجود تھی۔ اندر دو لمبی میزیں پڑی تھیں۔ اس کے اندر آنے کی آواز سن کر دکان کے پیچھے موجود کمرے سے ایک جوان عورت برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں خمار کی سی کیفیت تھی' شاید وہ سوتی سوتی اٹھ کر آئی تھی۔

''کیا مجھے پنیر کے سینڈوچ مل سکیں گے؟''اس نے مینو پر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔
عورت اپنے بلاؤز کے بٹن بند کرتے ہوئے بولی۔''اس میں انڈا بھی پسند کرو گے؟''
پھر وہ میز کی صفائی کرنے لگی ۔نہ جانے اسے کیا خیال آیا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف مڑا اور کہنے لگا ''بہت ہی مناسب ہوگا۔ اگر مجھے نوڈلز کا سوپ مل جائے۔'' جونہی اسے یاد آیا کہ وہ دروازے پر نوڈلز کے اشتہار دیکھ کر اس دکان میں آیا تھا' نوڈلز کی اشتہا تیزی سے چمک اٹھی اور اس نے اپنے آرڈر میں تصحیح کردی ۔ جواب دیئے بغیر وہ الماری کی طرف متوجہ ہوگئی۔اس اثنا میں اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اکٹھا کر کے اس میں ہیر پن لگا لیا تھا۔الماری میں سے اس نے نوڈلز کا بنڈل نکالا۔ الماری میں مختلف چیزوں کے ڈبے' شراب کی بوتلیں' سافٹ ڈرنکس' غرض ہر شے مٹی میں اٹی ہوئی دکھائی دی۔ کھانے کی تیاری کے دوران وہ سگریٹ پیتے ہوئے دیواروں پر لگے پوسٹر پڑھتا رہا۔کہیں نئی دیہاتی تحریک کا نعرہ درج تھا اور کہیں خوراک کی پیداوار میں اضافے پر زور دیا گیا تھا۔بعض پوسٹروں میں ایسے مجرموں کی تصاویر ان کے جرائم کی تفصیل اور ان کی گرفتاری کے لئے حکومتی انعامات درج تھے' جن کی حکومت کو تلاش تھی۔ پوسٹر پڑھتے ہوئے وہ اپنے جوگرز فرش پر آہستہ آہستہ ٹکرا کر انکی مٹی بھی صاف کرتا رہا۔ دکان کے باہر ایک ٹریکٹر آ کر رکا اور اس کے ساتھ ہی عورتوں کا ایک ریلا سا دکان میں گھس آیا۔ان کے سروں پر خاصی بھاری گٹھریاں رکھی ہوئی تھیں۔انہوں نے موم بتیاں اور اگر بتیاں خریدیں۔سہ پہر کے پرسکوت ماحول میں مینڈکوں کے ٹرانے کی گونج عجیب سی لگی مگر شاید وہ رات گئے بارش ہونے کی نوید دے رہے تھے۔اور پھر اس کا کھانا بھی آ ہی گیا۔عورت نے انتہائی چابک دستی اور صفائی سے پہلے ضروری برتن اس کے سامنے سجائے اور پھر نوڈلز سوپ کا بڑا پیالہ بمع لوازمات اس کے آگے رکھ دیا۔ ایک بوڑھی عورت ایک جوان عورت کے ساتھ ماتمی لباس میں دکان کے اندر داخل ہوئی۔ان کے پیچھے چار پانچ سالہ ایک بچہ بھی اندر آیا۔
ہمیں کچھ موم بتیاں چاہئیں۔دکاندار نے ایک ہلکی مگر مانوس مسکراہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا:
مندر جا رہی ہیں آپ؟

''ہاں آج انچاسواں دن ہے سو آخری رسم بھی ہو جائے گی۔'' بوڑھی عورت نے نوجوان عورت کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔دوکاندار عورت نے الماری کے مختلف شیلف اچھی طرح دیکھنے کے بعد معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ختم ہوگئیں۔ بوڑھی عورت نے چاول سے کشید کردہ

شراب کا ایک پڑا اور کچھ اگر بتیاں خریدیں اور اپنی پریشانیوں میں گم وہاں سے نکل گئی۔ ماتمی لباس پہنے جوان عورت اپنے بچے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔
''اگر انہیں آج کے میلے کا علم تھا تو انہوں نے موم بتیوں کا سٹاک پہلے سے کیوں نہیں منگایا؟'' دوکاندار عورت نے شوہر پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کے پاس اور کام کیا ہوتا ہے پتہ یہ چلا کہ مندر سے متعلق کاروباری صورت حال پر زیادہ توجہ نہیں دی جارہی تھی۔ ''سو مندر میں کوئی پوجاپاٹ چل رہی ہے۔'' اس نے خجالت آمیز لہجے میں عورت سے سیاہ مرچیں مانگتے ہوئے کہا غالبًا وہ لاشعوری طور پر اس سے باتیں کر کے اپنے ذہن کو ہلکا کرنا چاہ رہا تھا۔ دور جاتی ہوئی نوجوان عورت کا سفید سکرٹ فاصلے کے ساتھ ساتھ دھندلا ہوتا جارہا تھا۔ تاہم اس کی نگاہیں خاصی دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ آج بدھ مت کے پیروکاروں کا یوم ارواح ہے۔ دکاندار عورت نے جواب دیا۔ ''چنانچہ یہ سب لوگ پہاڑی پر واقع باٹا مندر کا رخ کررہے ہیں۔'' اس کی نظریں دور جاتی جوان عورت پر جمی دیکھ کر اس نے مزید کہا میرا خیال ہے آج ان کی رسوم کا آخری دن ہے۔ یہ بالائی گاؤں میں رہتے ہیں۔ بچے کا باپ چند ہفتے پہلے جھیل میں ڈوب کر مرگیا تھا۔''

اس نے تھوڑا سا گرم مصالحہ سوپ پر چھڑکا تو پسے ہوئے چاول کی طرح کے چھوٹے چھوٹے کیڑے اس کی سطح پر تیرنے لگے۔ ایک لمحے کو وہ ٹھٹکا مگر پھر ہنس پڑا۔ یہ سراسر نظر کا دھوکا تھا۔ دوکان کے پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ عورت فارغ بیٹھی' دکان سے باہر کسی چیز کو دیکھے جارہی تھی۔ ایک دو دفعہ اس نے بچے کے رونے کو نظر انداز کیا مگر جب وہ چیخنے لگا تو وہ کاہلی سے اٹھی اور دکان کی عقبی جانب بچے کو دیکھنے چلی گئی۔ نوڈلز میں خوشبو بالکل نہیں تھی تاہم مقدار میں وہ کافی تھے۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ بھوک کا احساس ذرا بھی باقی نہیں رہا۔ اس نے دودھ پلاتی عورت کو کھانے کی رقم ادا کی اور وہاں سے نکل آیا۔

''لگتا ہے وہ کفن کو دوبارہ کھول رہے ہیں۔'' چنگ آک کی والدہ نے نیچے ہوتی سرگرمی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ سفید لٹھے کی چادر ایک مخصوص انداز میں سیاہ تابوت کھول کر لعش کے گرد لپیٹا جارہا تھا۔ ''وہ اسے کھول کیوں رہے ہیں؟'' چنگ آک نے سوال کیا۔

''تا کہ متوفی کی ہڈیاں سفید ہی رہیں۔ جنوبی علاقے میں اسی طرح ہوتا ہے۔ ظاہری وجہ تو ہے کہ لکڑی میں موجود نمی ہڈیوں کو پیلا کردیتی ہے۔'' اس سے بچاؤ کیلئے سفید چادر............''

اس کی والدہ رک گئیں۔ انہیں اچانک محسوس ہوا کہ انہیں بغور دیکھا جا رہا ہے۔ چنگ آ ک انہیں تکے جا رہی تھی۔ ان کا میک اپ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ چہرے پر پڑی لائنیں اور جھریاں دھوپ کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ آنکھوں پر لگایا گیا نیلا شیڈ البتہ اب بھی موجود تھا۔ ان کے چہرے پر روشنی نمایاں ہوگئی۔ چنگ آ ک ان کے تاثرات تبدیل ہوتے دیکھ کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاتھ بلند کر کے دو چار گہرے سانس لینے کے بعد اس نے دوبارہ نیچے ہوتی تدفین کی جانب دیکھا جواب پہلے سے بھی زیادہ واضح نظر آنے لگی تھی۔ ایک بڑے سے تختے پر نعش کو رکھ کر قبر میں اتارا جا رہا تھا۔ اردگرد موجود متوفی کی رشتہ دار عورتیں زورزور سے رونے اور چیخنے چلانے لگی تھیں۔ مرد چہروں پر غم اور دکھ کے تاثرات لئے چپ کھڑے تھے۔ پھر مٹی ڈالنے کی رسم شروع ہوئی اور ہر رشتہ دار قبر کے پاس آ کر تھوڑی سی مٹی قبر میں ڈالتا اور پیچھے ہٹ جاتا۔ اس رسم کے بعد لوگ پیچھے ہٹ گئے اور گورکنوں نے مٹی قبر پر ڈالنے کا کام شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھ اٹھائے اور سر جھکائے کوئی دکھ بھرا گیت گا رہے تھے۔ گیت ختم ہوتے ہی عورتوں نے پھر رونا پیٹنا اور چلانا شروع کر دیا۔ سیاہ ماتمی لباس میں ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے قبر کے آگے تعظیماً اپنا سر جھکایا اور غالباً کوئی دعائیہ کلمات کہنے لگا۔ چنگ آ ک ان کی حرکات وسکنات دیکھنے میں بری طرح محو تھی۔ موسیقی کے آلات اور گانگ کے بجنے کے ساتھ ہی رسوم اپنے اختتام کو پہنچیں۔

چنگ آ ک ہڑبڑا کر چونکی۔ وہ اپنے والدین کی جگہ سے ذرا آگے چلی۔ قبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ان کے تعویذوں پر لکھے نام اور تاریخ وفات دیکھتی اور پڑھتی جا رہی تھی۔ بعض لوگ سو سال تک اس دنیا میں جئے تھے اور بعض کو دس سال بھی یہاں رہنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ حیرت زدہ تھی۔ شاید اپنی سخت جانی پر۔ اس کے اردگرد ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے زندگی میں ہی اپنی تدفین کے لئے جگہ مخصوص کرالی تھی اور بعض عالم شباب میں رخصت ہوگئے تھے۔ عمر کے بدلنے کے ساتھ ساتھ موت کا چہرہ بھی بدلتا گیا تھا مگر یہ ساری یادیں اپنی جان پہچان کے اور قریبی لوگوں کے دلوں میں پرچھائیں کی مانند تھیں جو وقت کے ساتھ دھندلی ہوتی ہوتی غائب ہو جاتا تھی۔ اگلی دفعہ جب چنگ آ ک یہاں آئے گی تو اس کا بچہ کتنا بڑا ہو چکا ہوگا۔ کیا اسے اس وقت آج کا دن یاد ہوگا؟ کیا ماضی کے ایک شدید تمازت زدہ اور جھلستے دن اسے زبردستی پیدل چلنا اور گرد وغبار میں بری طرح اٹ جانا اچھی طرح

یاد رہے گا؟

چنگ آ ک ایک قبر پر سیلوفین کے لفافے میں لپٹے خوبصوت گلابوں کا دستہ رکھا دیکھ کر رک گئی۔ تروتازگی کے عالم میں یہ گلاب یقیناً اپنی خوبصورتی اور خوشبو میں انتہائی سحرانگیز رہے ہوں گے۔ جھلستی دھوپ کے ہاتھوں اس وقت بری طرح مرجھائے ہوئے تھے تاہم پیکٹ میں موجودتھوڑے بہت پانی کی وجہ سے اس کے پتے ابھی تک سرسبز اور تازہ لگ رہے تھے قبر پرکل کسی وقت چھڑ کے گئے پای کی نمی ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ قبر کے ساتھ نرم زمین پر اونچی ایڑی کے کسی زنانے جوتے کے نشانات بھی موجود تھے۔ کل جب وہ اپنے گھر میں موجود تھی تو اچھی خاصی بارش ہوئی تھی۔ وہ اپنے بچے کو سلانے کی کوشش میں اسے لوری سناتے ہوئے 'برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ بارش کے دوران ایک عجیب سے تصور نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔۔ پھراس نے اپنے ذہن کوایک جھٹکے سے اس تصور سے آزاد کیا۔ان دنوں بارش ہونا عام معمول تھا۔ برسات اگرچہ گزر چلی تھی پھر بھی بادلوں کا اچانک آسمان پر چھاجانا زوردار گرج چمک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کچھ لمحوں کی تیز بارش اور پھر آناًفاناً آسمان کا صاف ہوجانا .... یہ سلسلہ اب بھی چل رہا تھا۔شاید کل بھی بارش ہوئی ہو۔۔ چنگ آ ک نے سوچا۔

............اس طوفانی بارش میں وہ شاید ہی بچ سکا ہوگا۔ تھانے میں موجود ایک افسر نے کہا۔ چنگ آ ک کو اس کے شوہر کی اشیاء۔۔ مچھلیوں کا جال' فولڈنگ کرسی' کپڑوں کا تھیلا وغیرہ ۔۔ واپس کی گئیں تو اس وقت بھی وہ خاصی گیلی تھیں۔ اس کی جیکٹ میں موجود ڈائری اور اس کے شناختی کارڈ پر سیاہی بری طرح پھیل گئی تھی۔ شناختی کارڈ پر لگا ہوا فوٹو' اس کی شناخت میں کوئی مدد نہیں دے سکتا تھا۔ بھولے بسرے ماضی کے کسی چہرے کی طرح وہ بالکل نامانوس اور غیر واضح تھا۔ اس کی شخصیت کا کوئی پرتو اس میں جھلکتا ہی نہیں تھا۔ اس تصویر میں اس کے بال چھوٹے چھوٹے تھے اور اسے دیکھ کر ہی اسے جھرجھری آ ئی تھی۔ اس نے یہ تصویر ان دنوں بنوائی تھی جب ابھی لمبے بالوں کا فیشن شروع نہیں ہوا تھا۔

پولیس افسر نے چنگ آ ک کا اس طرح جائزہ لیا جیسے وہ اس سے تفتیش کرنا چاہتا ہو۔ اس نے اس کے بچے کی طرف دیکھا جس کے لمبے بال اس کے کانوں اور ماتھے پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ تھوڑا سا گڑ بڑایا پھر بولا۔ یہ تمہارا لڑکا ہے؟ چنگ آ ک نے اپنا سر جھکایا۔ جی ہاں...... پھر اس نے پولیس والے کے ان کہے سوال کو سمجھ کر اضافہ کیا۔ دراصل ہمارا ایک ہی

بچہ ہے۔ بچے کی نگاہیں مسلسل پولیس افسر کے ساتھ رکھی بندوق پر جمی ہوئی تھیں۔

بارش ہونے کے بعد' دریا میں طغیانی آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی ....جزیرہ خشکی سے بالکل کٹ جاتا ہے اور پھر جلد ہی پانی کی تہوں میں گم ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے' وہ تیرتا ہوا کہیں ادھر ادھر نکل گیا ہو۔ ہماری تلاش بہر حال ابھی جاری ہے۔ غیر مقامی لوگ وہاں جا کر باآسانی مشکلات کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ہاں اگر بارشیں نہ ہو رہی ہوں تو جزیرہ بالکل محفوظ ہوتا ہے اور وہاں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ پھر وہ کنارے سے زیادہ دور بھی نہیں۔ اور پانی مشکل سے چھاتی تک آتا ہے............پچھلے سال ایک آدمی نے اپنے بچوں سمیت وہاں کیمپنگ کی تھی اور وہ بھی آدھی رات کو طوفانی بارش میں پھنس گئے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بارش کے ساتھ ہی یہ جزیرہ پانیوں میں گم ہوجاتا ہے۔ پولیس افسر کی وضاحت طویل سے طویل تر ہوتی جارہی تھی جوان بیوہ سے گفتگو کرتے ہوئے' اس کے لہجے میں نرمی اور ہمدردی امڈ آئی تھی۔ چنگ آک' جب ایک ایک کر کے' اپنے شوہر کا سامان اکٹھا کر رہی تھی تو اس کے بیٹے کی نظر اس پر پڑی اور وہ خوشی سے چیخ پڑا............ارے! یہ تو میرے ڈیڈی کی چیزیں ہیں' پچھلے سال' وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے............اسے اپنے ڈیڈی کے ساتھ مچھلی کے شکار پر جانا اچھی طرح سے یاد تھا۔ اس کے بعد بچہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ دوبارہ شکار کھیلنے نہیں گیا۔ چنگ آک' پولیس والوں کے ساتھ' جائے حادثہ پر بھی گئی۔ وہ جزیرہ تو کیا تھا' دریا کے کنارے پر موجود جھیل میں ریت کا ایک ٹاپو سا تھا' کسی مچھلی کی شکل کی طرح کا۔ پانی کے بیچوں بیچ خشکی کا ریتلا ٹکڑا' جو اس وقت دھوپ میں اپنی آب و تاب دکھا رہا تھا۔۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رات کی بارش میں وہ اپنا وجود ہی کھو بیٹھا تھا۔

مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے آدھی رات کے وقت' اس ٹاپو پر' لالٹین کی روشنی دیکھی تھی اور اس کے بعد' اچانک تیز موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی۔

ایک شخص مچھلیوں کا شکار کھیلنے یہاں آیا تھا۔ وہ اپنا سارا ساز وسامان ٹاپو پر لے گیا تھا۔ اس کے لئے اسے کمر تک کے پانی میں سے کئی بار گزرنا پڑا۔ جھیل کے کنارے پر اس نے ایک لڑکے کو کچھ رقم دے کر سگریٹ خرید لانے کے لئے بھی کہا تھا۔ اگلی صبح' وہ اپنے جال کے لئے فکر مند ہو رہا تھا' جو اس نے رات کے وقت جھیل میں کسی جگہ مچھلیاں پکڑنے کے لئے ٹکایا تھا۔ بہر حال کچھ لڑکے اسے دریا کی سمت سے ڈھونڈ کر نکال لائے تھے۔ تیز ہوا میں اس کی جیکٹ

بھی کہیں اڑ گئی تھی ۔۔۔۔جھیل کے قرب وجوار میں رہنے والے لڑکوں نے اسی طرح کی کہانی کم وبیش بیسیوں بار سنائی ۔کبھی اپنے گھر والوں اور دوستوں کو' کبھی پولیس والوں کو اور کبھی تماشہ دیکھنے کے لئے رک جانے والے راہگیروں کو۔

مچھلیاں پکڑنا تو دور کی بات رہی' اس نے مچھلی کا کوئی بچہ تک نہیں پکڑا۔ہم نے اسے بتایا بھی تھا کہ یہاں کی تندوتیز لہروں میں مچھلیاں پکڑنا بہت مشکل ہے' لیکن اس نے ہماری بات ہنسی میں اڑادی۔

اگلے دن ایک تجربہ کار جوان جھیل اور دریا کے سنگم پر واقع دہانے تک تیرتا ہوا گیا اور وہاں ایک چٹان میں پھنسی ہوئی فولڈنگ کرسی نکال لایا ۔ وہیں دوسرے لڑکوں کو اس کی کچھ چیزیں بھی مل گئیں ۔ بڑا خوفناک طوفان تھا............تندوتیز ہوا اور اس پر شدید ژالہ باری' ہم اپنی چھتریاں سروں پر ٹکا نہیں پار ہے تھے۔ کسی اور نے کہا۔''میں خاصی رات تک باہر ہی تھا۔ گھر واپسی پر آتے ہوئے میں نے ٹاپو پر ٹمٹماتی ہوئی روشنی دیکھی تھی۔''

قرب وجوار کے بعض باشندوں نے ایک کشتی لی اور جھیل کا سارا نچلا علاقہ چھان مارا۔ لمبے لمبے بانس جھیل کی تہ تک لے گئے اور اس کی لاش ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہے۔

چنگ آ ک نے مختلف کاغذات پر دستخط کئے اور اپنے شوہر کی اشیا پولیس سے لے لیں۔

''میرا خیال ہے' وہ کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''کیا وہ اکثر گھر سے اسی طرح غائب ہوجایا کرتے تھے؟''

''دیکھئے نا' گرمیوں کی چھٹیاں جلدی شروع ہو گئی تھیں ۔۔۔اور مچھلی کا شکار ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کالج میں پڑھانے کا یہی تو سب سے بڑا فائدہ ہے۔ آدمی جب چاہے جو چاہے' کرسکتا ہے' اسے اس کی بھی کوئی خاص فکر نہیں ہوتی کہ کلاس میں ہورہی ہیں یا نہیں۔لیکن عجیب بات ہے' یہاں سے دونل جھیل کافی دور واقع ہے یا شاید ہمیں مچھلی کے شکار کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں............ دراصل پولیس افسر' انتہائی گرم موسم میں یہاں آنے والے اجنبی کے غائب ہوجانے کی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش میں تھا۔اس وقت چنگ آ ک کا جی چاہا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے' اپنے ذہن میں موجود تمام حقائق اس کے سامنے اگل دے۔لفظوں کا ایک طوفان تھا جو اس کے ہونٹوں پر آنے کے لئے بری طرح مچل رہا تھا۔''وہ صوبائی کالج میں

پڑھاتا ہے اور ہماری شادی کو پانچ سال ہو رہے ہیں ۔ کچھ عرصہ پہلے' ہر چیز اس سے چھٹ گئی ۔ وہ کچھ اس طرح کا آدمی ہے جسے قانونی طور پر ناکارہ قرار دے دیا گیا ہو ۔ نہ اس کے کوئی حقوق ہیں اور نہ ہی ذمہ داریاں ۔ اسے باقاعدگی سے چیک اپ کرانا پڑتا ہے' آتشک کے مریض کی طرح ۔ اسے صرف غنودگی یا طویل خوابیدگی کے دوران سفر کرنے کی اجازت ہے اسی لئے اس نے ہر وقت سوتے رہنا شروع کر دیا تھا ۔ منہ کھولے' جس طرح وہ سوتا ہے' کبھی کبھی بالکل مردہ لگتا ہے ۔ میں اکثر اوقات خوف زدہ ہو جاتی ہوں اور کئی دفعہ' اسی خوف کے ہاتھوں میں نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کر اٹھایا ہے ۔''

لیکن ان تمام الفاظ کو' ہمیشہ کی طرح' اس نے ذہن کے ایک گڑھے میں ڈال دیا اور پوچھا ۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ افق کے پار اور دیوتاؤں کی جھیل کے مقامات کہاں واقع ہیں؟''

پولیس والے نے ایک لمحے کو اس کے سوال پر غور کیا اور پھر نفی میں اپنا سر ہلا دیا ۔ ''کبھی نہیں سنے یہ نام مجھے یقین ہے یہاں آس پاس ایسے کوئی علاقے نہیں جن کے نام اس طرح کے ہوں ۔''

''یہ علاقے یہاں نہیں ہیں تو پھر کہاں ہوں گے .... افق کے پار اور دیوتاؤں کی جھیل ....'' چنگ آک حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی ۔

اپنے شوہر کے چلے جانے کے بعد' اس نے نہ جانے کتنے نقشے دیکھ ڈالے ۔ ہر نقشے میں شہروں' قصبوں اور دیہاتوں کے ناموں کو بار بار غور سے پڑھا لیکن افق کے پار اور دیوتاؤں کی جھیل جیسے نام اسے کہیں بھی نظر نہیں آئے ۔ وہ زیادہ حیرت زدہ اسلئے نہیں ہوئی کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ان ناموں کی حقیقت کے متعلق پہلے سے ہی شبہات موجود تھے ۔ شاید' اس صبح کی نیلگوں فضا میں' ان ناموں کی سماعت سے اس کے ذہن میں ایسی ڈھلوان پہاڑی کی بلند چوٹی کا تصور پیدا ہوا ہو' جس پر آسمان سہارا لئے کھڑا ہے اور جس پر چڑھنے کے لئے' نہ وہ کہیں پیر جما سکتا ہے اور نہ ہاتھ ۔ ممکن ہے وہیں کہیں وہ برف آگیں جھیل بھی موجود ہو جہاں دنیا کے سارے شوریدہ سر جانور آ کر' اپنی متلاطم' خونیں فطرت کو سرد کر سکتے ہوں ۔

قدموں کی چاپ' لوگوں کی باہم گفتگو اور فضا میں موجود جھلستی ہوا ۔۔ اچانک ان سب کی آوازیں پہلے سے زیادہ تیز سنائی دینے لگیں ۔ گورکن قبر کی تیاری میں ہاؤ ہو کر رہے تھے ۔ مٹی کی

تہ جمانے کے بعد' اب وہ اس پر سنگ مرمر لگا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا ناچ اور گانا بھی جاری تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ گانے کے بعض الفاظ سنائی بھی دینے لگے تھے۔ گورکنوں کے علاوہ' باقی سب لوگ دھوپ کی حدت سے بچنے کے لئے' قریبی خیمے میں جا گھسے تھے۔

وہ جھیل کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے جوگرز اتارے اور اپنے پاؤں جھیل کے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیئے۔ انتہائی فرحت انگیز اور تازگی سے بھرپور احساس تھا یہ بھی۔ پھر وہ جھک کر' جھیل کی تہ میں بیٹھے پتھروں اور سنگ ریزوں کی شکلوں اور رنگوں کا بغور جائزہ لینے لگا۔ پانی میں اس کا اپنا عکس بیچ بیچ میں رکاوٹ بننے لگا۔ چند سنگریزے پانی میں نئے رنگوں کو جنم دے رہے تھے۔ اس نے کچھ سنگریزے پانی سے باہر نکالے لیکن پانی میں سے باہر نکلتے ہی ان کی آب و تاب ختم ہونے لگی اور ان کا رنگ مدہم پڑنے لگا۔ ''پھولدار لباس پہنے ایک چھپکلی نے چوہے کے بچے سے کہا: پورن' ماشی کی رات' تم کہیں سے اودے رنگ کا پتھر ڈھونڈ کر لانا۔ خیال رہے پتھر کا رنگ اودا ہی ہو پھر میں تمہاری خواہشوں کو حقیقت کا رنگ دے دوں گی۔ چوہے نے بہت کوشش کی لیکن اسے اودے رنگ کا پتھر نہیں ملا ....'' نیم غنودگی کی کیفیت میں چنگ آ ک کی بیزار کن اور میکانکی آواز' اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی وہ غالباً اپنے بچے کو کوئی کہانی سنا رہی تھی اس نے سوچا: اودا پتھر .... اودا پتھر ہی ہو' کوئی قیمتی موتی نہیں۔ اگر موتی ہوتا تو کتنا خوبصورت اور شاندار ہوتا............ ''اور پھر؟ پھر کیا ہوگا؟'' بچے نے ٹانگیں زور سے ہلاتے ہوئے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ چنگ آ ک' بلادلچسپی کے میکانکی انداز میں کہانی پڑھے جا رہی تھی۔ شاید پہلے بھی وہ یہ کہانی بچے کو سنا چکی ہوگی .... پتہ نہیں' ننھے چوہے کو وہ اودا پتھر ملا کہ نہیں۔ یہ سوچتے سوچتے اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ تاہم کہانی کا اختتام اس کی سمجھ میں آ ہی گیا۔ چند ناممکن ایڈونچرز' قربانیوں اور خاصی تگ و دو کے بعد' وہ اودا پتھر چوہے کو مل گیا ہوگا اور اس کی خواہشات پوری ہوگئی ہونگی۔ بچوں کی کہانیوں کا انجام عموماً اسی طرح کا ہوتا ہے۔

پانی میں سے نکالے ہوئے پتھروں کو اس نے ایک جگہ جمع کیا۔ خشک ہوتے ہی ان کا رنگ و روپ شاید ہوا میں اڑ گیا۔ اب دیکھیں تو وہ بالکل عام سے پتھر تھے۔

ورنل جھیل میں واقع ان کے گھر کے باغیچے میں ایسی ہی ایک چٹان تھی جسے رنگ اور شکل کے لحاظ سے کسی درخت کی جڑوں سے مشابہ سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک بار مچھلی کے شکار سے لوٹا تو وہ

اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔اس نے اسے گھر کے باغیچے کے ایک کونے میں ڈال دیا تھا۔اس کے بعد سے ابتک اس کے سائز اور حجم میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ بچے کے خیال میں وہ چٹان ہررات تھوڑی بہت پھیلتی جاتی تھی۔ ننھے شیطان کے ذہن میں لاتعداد کہانیاں اور جادوٹونے کے قصے بھرے ہوئے تھے۔اسے یقین تھا کہ زمین کی گود میں دفن مردہ لوگ محض بعض جادوئی الفاظ کے ذریعے دوبارہ زندہ ہوکر' جیتی جاگتی دنیا میں آسکتے ہیں۔ بچے کی یہ چھوٹی چھوٹی معصومانہ باتیں'اسکی شوخ حرکتیں اور شرارتیں جنہیں وہ اکثر اوقات نظرانداز کردیا کرتا تھا'اس وقت اسے بری طرح یاد آئیں۔

''تم تو صورت حال کو اور زیادہ غیر واضح اور دھندلا کررہے ہو............تم کہیں شاعر تو نہیں؟'' انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔وہ اپنے تئیں'اس کا پوشیدہ ہتھیار سمجھ چکے تھے لیکن وہ غلطی پر تھے وہ تو صرف عمومی سوجھ بوجھ کا پرچارک رہنا چاہتا تھا۔شاعری تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔

اس نے پانی سے نکالے ہوئے پتھروں کو دوبارہ پانی میں پھینکنا شروع کردیا۔وہ پانی میں ابھری ہوئی ایک چٹان پر جالگتے۔بعض اوقات مدہم سی چنگاریاں ابھرتی نظرآتیں اور پھر وہاں معمولی سا دھواں دکھائی دینے لگتا۔آخری پتھر پانی میں جاگرا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔سورج افق کے بالکل نزدیک تھا۔اگر وہ شعوری طور پر چاہتا تو غالباً اندھیرا ہونے سے پہلے ہی' جھیل کے مخصوص پڑاؤ تک پہنچ سکتا تھا۔اگر وہ راستے میں نہ رکتا تو جھیل میں غروب ہوتے سورج کو آگ کے گولے کی شکل میں دیکھ لیتا۔سورج کے چھپنے کا منظر'اپنی جگہ' خاصا دل آویز ہوتا ہے۔ایسی کھلی جگہوں پر دن اور رات کا باہمی ملاپ'یقیناً تخیل کو نئی جہتیں دیتا ہوگا۔

انتہائی تیزی سے سطح زمین پر ایک اور قبر ابھر آئی۔اس کی تیاری میں بمشکل بیس منٹ لگے ہوں گے۔ بچہ کافی دیر سے گہری نیند میں تھا۔ بچے کے پیٹ پر سے تولیے کے ذریعے پسینہ صاف کرتے ہوئے چنگ آک کو اچانک خیال آیا کہ سردی کے آخری دنوں میں لانڈری کے لئے دیئے ہوئے کپڑے'ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔گرمی کے اختتام سے پہلے پہلے

'موسم خزاں کے لئے' اسے اپنے شوہر کے سارے کپڑے ٹھیک کر کے رکھنا ہوں گے۔ اس نے گھر کو بند کیا' چابیاں میل باکس میں ڈالیں اور لانڈری شاپ چل دی۔ اس نے اپنے کپڑے لئے اور وقت ضائع کئے بغیر گھر واپس آ گئی۔ کچھ لمحے وہ باہر دیوار کے پاس کھڑی یہ دیکھنے کی کوشش میں رہی کہ کہیں اس کا بچہ چلا تو نہیں رہا ہے۔ لیکن اندر مکمل سکوت طاری تھا۔ پھر وہ میل باکس کے پاس گئی۔ چابیاں اندر ہی تھیں مگر اسے ایک عجیب اور مختلف سا احساس ہوا۔ جسے وہ لفظوں کی شکل نہیں دے پائی۔ بس یوں لگا جیسے کوئی مانوس سی سنسناہٹ اس کے ہاتھ کی پشت کو چھو گئی ہو۔ اس نے چابیاں باہر نکالیں۔ ان کے رنگ پر اسی طرح شیر کا چہرہ کھدا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے ان کا بغور جائزہ لیا۔ چابیاں صحیح حالت میں تھیں۔ دروازہ کھول کر' اندر آنے پر' اسے اور زیادہ محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اندر آیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ دروازہ کھلا پڑا تھا یا جوتے الٹے پلٹے ہوئے پڑے تھے۔ بظاہر کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ بچہ اسی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ اب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ البتہ اس کے پیٹ پر پڑا ہوا تولیہ' اس سے ذرا دور پڑا تھا۔ پورے گھر کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد' اسے پتہ چلا کہ یہ تمبا کو کی انتہائی مدہم سی بو تھی' جو اسے محسوس ہوئی تھی۔ اس نے کپڑے ایک طرف ڈالے اور تیزی سے کچن کی طرف دوڑی۔ پتہ نہیں کیوں؟ لیکن جب سے وہ گھر سے گیا تھا' وہ جب بھی اس کے بارے میں سوچنے لگتی' اس کی بھوک کا خیال سب سے پہلے آتا تھا۔ کچن میں کسی چیز کو چھیڑا نہیں گیا تھا۔ لیکن باتھ روم کے باہر' اسے اس کے کپڑے لٹکے ہوئے دکھائی دیئے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا شوہر واپس آ گیا ہے اور اس وقت نہا رہا ہے۔ کہاں ہیں آپ؟ کہاں ہیں؟ اس نے سرگوشیانہ لہجے میں آواز دی۔ جیسے اسے یہ خوف ہو کہ اس کی آواز کسی اور کے کانوں میں پڑ جائے گی حالانکہ اس کا شوہر وہاں بھی نہیں تھا اور وہ بخوبی یہ بات سمجھ رہی تھی۔ بالآخر اس نے ٹیلیفون کا رسیور اٹھالیا۔ اس سے مسلسل ڈائل ٹون آ رہی تھی' جس سے اس کے کان بجنے لگے۔ اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ کیا ڈھونڈنے کے لئے کوشاں تھی۔ پھر اس کی نظر ایش ٹرے میں پڑے سگریٹ کے ٹوٹوں پر پڑی۔ جن کے سرے ابھی تک پینے والے کے لعاب سے مرطوب تھے۔ اس نے کسی تجربہ کار تفتیش کرنے والے کی طرح ان کا بغور معائنہ کیا۔ کپڑے دھونے سے پہلے' حسب معمول' اس نے اس کے کپڑوں کی جیبیں ٹٹولیں' انہیں جھاڑا تا کہ ان میں سفر کی مٹی اور گرد باقی نہ رہے۔ پتہ نہیں' ان کپڑوں میں' اس نے کہاں کہاں کی خاک چھانی تھی'

کن کن لوگوں سے ملا تھا' کس کس علاقے کی دھوپ' گرد اور شبنم ان میں جذب ہوئی تھی۔ ان باتوں سے وہ قطعی لاعلم تھی۔ البتہ ان سب کی ملی جلی بو' وہ ان کپڑوں میں' ضرور محسوس کر سکتی تھی۔ جیبوں میں اسے کسی فلم کا مرا تڑا ٹکٹ' کسی تفریحی پارک کے داخلے کا ٹکٹ' گندا میلا کچیلا رومال اور سگریٹ سے چھڑا ہوا تمبا کو اور اس کی باسی بو کے علاوہ اور کچھ نہ مل سکا۔ کوئی نشان تو اسے چھوڑنا چاہئے تھا؟ پھر اسے' اپنے سوئے ہوئے بچے کے گالوں پہ اس کے پیار کا نشان دکھائی دیا۔ اب مزید کسی تفتیش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کے لئے جا چکا تھا۔ رات کی تیز بارش میں غائب ہو جانے والی سنہری ریت پر اس نے اپنا خول چھوڑا اور خود کہیں جا چھپا۔ اس نے محض اپنا لباس بدلا تھا اور نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔ اس واقعے کو زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگے ہونگے لیکن دنیا کی نظروں سے بچنے کے لئے یہ وقت بہت تھا۔ چنگ آ ک نے بچے کے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھے تو اس نے تلملاتے ہوئے' اپنی آنکھیں ملیں' تھوڑا سا پیچھے ہٹا اور کروٹ لے کر دوبارہ سو گیا۔ سرخی مائل مٹیالی سطح زمین پر اب گھاس لگائی جا رہی تھی۔ چنگ آ ک کی والدہ اس ساری کارروائی کا بغور مشاہدہ کر رہی تھیں تا کہ تدفین کا سارا عمل ان کے تصور میں محفوظ ہو جائے اور وہ مستقبل میں اس کا صحیح ادراک کر سکیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے ٹخنوں سے ذرا اوپر اٹھا رکھے تھے تا کہ مٹی سے خراب نہ ہوں۔ ان کی کھلی ٹانگیں انتہائی شان اور غرور سے پاؤں تلے دبی گھاس کی بے چارگی پر گویا مسکرا رہی تھیں۔ بچہ ایک نیم دائرے کی شکل کی دیوار میں موجود کچھ قبروں کے درمیان سے ہانپتا کانپتا نمودار ہوا۔ وہ بھاگتا ہو چنگ آ ک کے پاس آیا اور اس کی گود میں گھس گیا۔ چنگ آ ک نے پسینے سے چپکے بالوں کو ہاتھ سے ٹھیک کیا۔ بچے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے بے ساختہ اپنا شوہر یاد آ جاتا تھا۔ لیکن اس بار' حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اسے ان آنکھوں میں' اپنے سسر کی شبیہ دکھائی دی۔ بالکل وہی شکل' جو وہ عرصے سے بھولی ہوئی تھی۔ وہ چبھتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بچے کی آنکھوں میں مخصوص سی کشش تھی' کیسی؟ یہ وہ بتا نہیں سکتی تھی۔ تاہم وہ اپنے ہزارہا تصوراتی بچوں کے درمیان اسے بلا تردد پہچان سکتی تھی۔ لیکن ایک دن اس کی یہ تخصیص بھی ختم ہو جانا تھی۔ بچے کو بڑا ہونا ہے۔ پھر اس کی کسی اور گھرانے کی کسی لڑکی سے شادی ہو گی۔ اس کے بچے ہوں گے۔ ان میں ان کے ماں باپ کی کچھ اور شباہتیں آئیں گی اور پھر وہ اور بہت سے لوگوں کی طرح نا مانوس اور اجنبی نقوش کے حامل چہرے ہونگے۔ اتنے ہی غیر اور اجنبی' جتنے ان قبروں میں

مدفون لوگ ہیں جو نہ جانے کب کے مر کھپ کے' اپنا وجود مٹی مٹی کر چکے ہیں' البتہ ان کے نام کے ساتھ' اس کے شوہر کا خاندانی نام ضرور وابستہ ہوگا۔ جب قبر پر گھاس لگائی جا چکی اور اس کے اوپر خوبصورت پھول پھیلا دیئے گئے تو غم زدہ متعلقین خیمے سے برآمد ہوئے۔ جس وقت چنگ آ ک یہ منظر دیکھنے میں محو تھی' عین اسی وقت شہد کی مکھیوں نے اس کے پیروں کے نزدیک رکھے ہوئے تربوز کی قاشوں پر دھاوا بول دیا۔ چنگ آ ک نے اپنی ماں کے چہرے پر ایک پیار بھری نظر ڈالی۔ ایک دن چنگ آ ک خود اپنی والدہ کی آخری رسوم کی ادائیگی کے لئے اسی جگہ موجود ہوگی۔ پھر کسی وقت وہ ان کی قبر پر نامعلوم عرق کا گلاس چھڑک رہی ہوگی اور اس کے چاروں جانب اگر بتیاں جلا رہی ہوگی۔ سیاہ دھواں فضا میں بلند ہونے لگا۔ کالے تابوت کو جلایا جا رہا تھا۔ اس کی والدہ نے ایک سرد آہ بھری۔ جھلستی ہوا' آہستہ آہستہ مرطوب ہو رہی تھی۔ چنگ آ ک نے اوپر نظر اٹھائی تو ایک جانب سے سیاہ بادل امڈتے دکھائی دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان پر چھا گئے۔ نیچے تدفین کی رسوم ادا کی جا چکی تھیں۔ غم زدہ متعلقین آسمان کو تک رہے تھے۔ ممکن ہے انہیں خوف ہو کہ یہ طوفانی بارش کہیں انہیں راستے ہی میں نہ آ لے۔ کچھ لوگوں نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا' دریاں اور خیمے کا کینوس اکٹھے کئے اور اس کے بعد وہ سب لوگ پہاڑی کے دامن کی طرف تیزی سے چلنے لگے' جہاں ان کی بس انکی واپسی کے انتظار میں تھی۔ گورکن قبر کے قریب ہی بیٹھے' کھانے پینے میں مصروف' آپس میں بے فکری سے گپیں لگا رہے تھے۔ چنگ آ ک کو موسم کی اچانک تبدیلی کا احساس اس وقت ہوا' جب چاروں جانب سے پرندوں کے غول کے غول فضا میں اڑتے نظر آئے' شاید انہوں نے طوفانی بارش کی بو سونگھ لی تھی۔

پھر وہ قبرستان کی جانب بڑھنے لگے۔ چنگ آ ک نے ایسا خوفناک منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنے بچے کو مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا اور خوف بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ پرندے ٹولیوں کی شکل میں زمین کی طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے اردگرد پھیل کر' تقریباً ساری قبروں پر ڈیرا ڈال لیا۔ شاید وہ خود بھی موسم کی اچانک تبدیلی سے پریشان تھے۔ قبروں کی منڈیروں اور تعویذوں پر بیٹھ کر' وہ پرسکون ہوتے نظر آئے۔ اس نے نگاہیں گھما کر نیچے کی جانب دیکھا۔ جنازے کے ساتھ آنے والے لوگ بس میں سوار ہو رہے تھے۔ ان کے بس میں سوار ہوتے ہی' بس تیزی سے حرکت میں آئی اور اپنی منزل کی طرف

روانہ ہوگئی۔ ''ہم بھی چلیں۔'' چنگ کی والدہ نے کہا۔ چنگ آ ک نے اپنے بچے کو ہوشیار کیا اور اردگرد بکھری ہوئی چیزیں' کاٹھ کباڑ' تربوز کے چھلکے' خالی ڈبے اور بوتلیں جمع کیں۔ انہیں ایک تھیلے میں ڈال کر' اس ساری جگہ کو بالکل صاف کردیا تاکہ دوبارہ کبھی یہاں آنے پر' وہ اس خوفناک دن میں اپنی پھیلائی ہوئی گندگی کو نہ دیکھ سکے۔ وہ آج کے دن کی دہشت انگیز یادوں کو ذہن کے کسی بھی گوشے میں سمانے دینا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اس نے اپنے بچے کے کپڑے جھاڑے' اسے جوگرز پہنائے اور ماں کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''کیا تم آج ہی اپنے گھر جانے کا سوچ رہی ہو؟'' اس کی والدہ نے کہا۔ چنگ آ ک اپنے ماں باپ کے ہاں کچھ دن رہنے کے خیال سے آئی تھی مگر اپنی والدہ کے فقرے میں چھپا کنایہ سمجھنے کے بعد' اس نے فوری واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ''مناسب یہی ہوگا۔'' اور اس کے بعد' اس کے ذہن پر واپسی سوار ہوگئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا گھر ایک دن کے بجائے' نہ جانے کب سے خالی پڑا ہے۔ ''اس طرف سے بھی راستہ ہوگا' ممکن ہے کوئی شارٹ کٹ ہو؟'' اس کی والدہ نے مخالف سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ تینوں اسی جانب گھوم گئے۔ کئی خم دار راستوں سے ہوتے' وہ اس مقام سے بھی گزرے جہاں ابھی کچھ دیر پہلے تدفین کی رسوم ہو رہی تھیں۔ گورکن ابھی تک وہیں بیٹھے' شراب کے نشے میں مست' آپس میں ہنسی مذاق کررہے تھے۔ یہ لوگ تیزی سے ان کے پاس سے گزر گئے۔ دو اور موڑ کاٹنے کے بعد' انہوں نے خود کو ایک قدیم بدھ مندر کے سامنے پایا۔ اس پر حال ہی میں رنگ وروغن کیا لگتا تھا۔ اندر سے گھنٹیوں اور موسیقی کی لے پر مناجات کے گیتوں کی آواز صاف آرہی تھی۔ اوپر پہاڑی کی چوٹی پر' غالباً یہی آوازیں وہ سارا دن انتہائی مدہم گونج کے ساتھ سنتے رہے تھے۔ لگتا ہے اجتماعی پوجا کا دن ہے۔ چنگ آ ک کی والدہ نے اپنی بیٹی کے کانوں میں سرگوشی کی۔ مندر کے احاطے میں داخل ہوتے ہوتے' بارش کی موٹی بوندیں زمین کے سینے پر برسنا شروع ہوگئی تھیں۔ لوہے کی ایک بڑی سی دیگ اینٹوں کے چولہے پر چڑھی تھی' جس کے نیچے درختوں کی ٹہنیاں اور خشک پودوں کی باقیات دھڑا دھڑ جل رہی تھیں اور ان کا دھواں' ہو کے زور سے برآمدے میں گھس رہا تھا۔ نزدیک ہی بنے کچن سے ایک ادھیڑ عمر عورت نے سر نکال کر باہر دیکھا۔ وہ غالباً کوئی بھکشو عورت تھی۔ ''اجتماعی پوجا ہو رہی ہے کیا؟'' چنگ آ ک کی والدہ نے پوچھا۔ وہ بلا اجازت ہی برآمدے میں جا پہنچی تھیں اور وہاں کے بنچ پر بیٹھی اپنی سانسیں ٹھیک کر